
سچ کی سولی
طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

پچھلے دنوں اسلام آباد سے ایک صاحب کا خط موصول ہوا۔ فرما رہے تھے کہ کہانی ''سچ کی سولی'' پڑھ کر مجھے سری لنکا کی سیر کا شوق چرا گیا ہے۔ وہ سب جگہیں دیکھنا چاہتا ہوں جہاں کہانی کے دوران دونوں کردار یاسر اور کنول گئے تھے۔

اس سے ملتے جلتے اور بھی کئی خط موصول ہوئے ہیں ...... درحقیقت یہ کہانی سفرنامے کے سنگ سنگ چلتی ہے۔ کولمبو کے گلی کوچوں میں گھومتی ہے، کولمبو کی فضا میں سانس لیتی ہے اور وہاں کے خوشنما ساحلوں پر دھیرے دھیرے پروان چڑھتی ہے۔ پھر یہ کہانی سری لنکا کے پہاڑی مقام ''کینڈی'' کا رُخ کرتی ہے اور وہاں کی سبزے سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانوں میں جوان ہوتی ہے۔

پھول جب جوان ہو کر شباب کی بلندی کو چھوتا ہے تو پھر اس کے بکھرنے کے امکانات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی امکانات زندگی کو رنگینی کے ساتھ ساتھ ''سنگینی'' سے آشنا کرتے ہیں۔ یہ امکانات اس کہانی میں بھی موجود ہیں۔

یہ جیتے جاگتے زندہ کرداروں کی کہانی ہے۔ ان کرداروں کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا ہے جو ہمارے اور آپ کے ساتھ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اس میں مار دھاڑ نہیں، جاسوسی کے داؤ پیچ نہیں، خلافِ عقل واقعات بھی نہیں۔ پھر بھی اگر یہ دلچسپ ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ زندہ کہانی ہے۔ اور زندہ حقیقتیں حنوط شدہ قصے کہانیوں سے کہیں زیادہ موثر ہوتی ہیں۔

کہانی کا اہم کردار یاسر ہے۔ وہ ایک ہندوستانی لڑکی کنول کے پیار میں گرفتار ہوتا ہے۔ پیار انسان کو سب کچھ بھلا دیتا ہے لیکن یاسر اپنے شدید ترین جذبے کے باوجود ''سب کچھ'' نہیں بھولتا۔ اسے اپنی اخلاقیات پر فخر ہے۔ اسے یاد ہے کہ وہ ایک راست گو گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اسے یہ بھی یاد ہے کہ وہ پاکستانی ہے۔ جب زندگی اس سے امتحان لیتی ہے اور اُسے محبت اور سچائی میں سے کسی ایک کو چننا پڑتا ہے تو وہ سچائی کو چنتا ہے ...... ہاں محبت کرنے والے ایسے ہی دیوانے ہوتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ محبت ناکام ہو کر بھی کامیاب ہو جاتی ہے۔

طاہر جاوید مغل

یاسر پہلی مرتبہ سری لنکا آیا تھا۔ وہ کولمبو ایئر پورٹ سے نکلا تو گرمی محسوس ہوئی۔ یہ جنوری کا مہینہ تھا۔ پاکستان میں ان دنوں کافی ٹھنڈ ہوتی ہے۔ بلکہ ٹھنڈ کا عروج ہوتا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اچانک جنوری سے مئی میں چلا آیا ہے یعنی لاہور سے کولمبو تک کا سفر جنوری سے مئی تک کا سفر تھا۔

ہاتھ میں اٹیچی لئے وہ دور تک جاتی ہوئی گرم سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سڑک کولمبو شہر کو جاتی تھی اور شہر وہاں سے کم و بیش پینتیس کلومیٹر دور تھا۔ اردگرد موٹر رکشا کے علاوہ اور کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ایک رکشا والے سے کولمبو کی معروف سڑک گال فیس روڈ کا کرایہ پوچھا۔ رکشا والے نے بتیسی نکالی اور عاجزی سے بولا۔

"ایک ہزار روپیہ دے دیجئے گا۔"

انداز سے ظاہر تھا کہ ایک ہزار تو کرایہ دے دیجئے گا۔ اس کے علاوہ اپنی خوشی سے آپ جو کچھ دیں گے وہ بھی مجھے قبول ہے۔

یاسر ناریل کے جھومتے درختوں کے نیچے چلتا ایئر پورٹ کے جنوب کی طرف بڑھنے لگا۔ بس اس کا اندازہ تھا کہ وہ جنوب کی طرف بڑھ رہا تھا ورنہ سمتیں وغیرہ تو سب بھولی ہوئی تھیں۔ کچرے کے ایک ڈرم کے پاس ایک بوڑھا فقیر بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر مقامی زبان میں صدا لگائی۔ یاسر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ریزگاری نہیں تھی، پچاس روپے والا نوٹ نکالا۔ وہ چند سیکنڈ شش و پنج میں رہا۔ ایک لحظے کے لئے سوچا کہ آگے بڑھ جائے۔ پھر اس کی نگاہ ایک قریبی ٹک شاپ پر پڑی۔ اس نے وہاں سے چینج لیا اور پانچ روپے کا سکہ فقیر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اسے کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی نظر آئی۔ ٹیکسی کے ساتھ ہی ایک رکشا بھی کھڑا تھا۔

اس نے پہلے ٹیکسی والے اور پھر رکشا والے سے بات کی لیکن یوں لگتا تھا کہ یہ لوگ دن بھر کا خرچا ایک ہی سواری سے بٹور لینے کی فکر میں ہیں۔

وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ اچانک ایک کھنکتی ہوئی نسوانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”ایکسکیوزمی...... آپ انڈین ہیں؟“

یاسر نے مڑ کر دیکھا۔ آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ پینٹ شرٹ میں ایک خوبرو لڑکی اس کے سامنے تھی۔ اس کے سیاہ بال نیم گرم ہوا میں ہولے ہولے لہرا رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک ”ٹرالی اٹیچی“ تھا۔

”جی کیا کہا آپ نے؟“ یاسر نے جیسے چونک کر پوچھا۔

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ”میں نے پوچھا تھا آپ انڈین ہیں؟“

”جی نہیں...... پاکستانی ہوں۔“

”لگتا ہے کہ آپ پہلی دفعہ کولمبو آئے ہیں اور اب ٹیکسی، رکشا کے بھاری بھرکم کرائے کا سن کر پریشان ہو رہے ہیں۔“

”جی ہاں...... پریشان ہو رہا ہوں اور پچھتا بھی رہا ہوں۔ میرے آفس والوں نے کہا تھا کہ آپ کو ایئرپورٹ سے کمپنی کی گاڑی لے جائے گی لیکن میں نے اس خیال سے منع کر دیا کہ خوامخواہ پابند ہو جاؤں گا۔“

”اچھا تو آپ دفتری کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔“

”جی ہاں...... دفتری بھی ہے۔“ یاسر نے مبہم انداز میں کہا۔

اس دوران میں ایک رکشا ان دونوں کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ لڑکی نے کہا۔

”مجھے بھی شہر جانا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم شیئر کر لیتے ہیں۔“

یاسر نیم رضامندی کے انداز میں خاموش رہا۔ اس دوران میں رکشا ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ رکشا والے نے حسب رواج بتیسی نکالی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

”کہاں جائیں گے؟“

”گال فیس روڈ۔“ لڑکی نے جلدی سے کہا۔ غالباً وہ سن چکی تھی کہ یاسر کو بھی گال

فیس روڈ ہی جانا ہے۔

تھوڑا سا بھاؤ تاؤ ہوا۔ یاسر نے لڑکی کے لب و لہجے سے اندازہ لگایا کہ وہ یہاں بالکل اجنبی نہیں ہے۔ شاید پہلے بھی ایک آدھ بار یہاں آچکی ہے۔ وہ دلکش خدوخال کی مالک تھی۔ اس کی گفتگو کا انداز بھی خوبصورت تھا۔ رکشا والے سے 600 روپے میں معاملہ طے ہوگیا۔ لڑکی نے فتح مند نظروں سے یاسر کی طرف دیکھا پھر اپنا اسمارٹ سا اٹیچی کیس اٹھا کر رکشا کے پیچھے موجود خلا میں گھسیڑ دیا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد یاسر نے بھی اس کی تقلید کی۔ دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے اور رکشا یاسر کو ایک نئی دنیا سے آشنا کراتا ہوا کولمبو شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہر منظر نیا تھا، ہر صورت اجنبی تھی۔ یہاں تک کہ چہرے سے ٹکرانے والی ہوا بھی نا آشنا محسوس ہو رہی تھی۔

رکشا والا نوجوان تھا اور بڑے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

”کافی تیز جا رہا ہے۔“ یاسر نے پُراندیش لہجے میں کہا۔

”آپ کہہ سکتے ہیں کہ کافی تیز اُڑ رہا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بے تکلفی سے رکشا والے کا کندھا دبایا اور انگریزی میں بولی۔ ”ہم جہاز سے اتر کر آ رہے ہیں۔ اب ہم ذرا آہستہ سفر کرنا چاہتے ہیں۔“

رکشا والے کی سمجھ میں غالباً آخری الفاظ ہی آئے تھے۔ اس نے بڑے ادب سے سر جھکایا اور سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ دراصل ادب سے سر جھکاتے ہوئے ایک لمحے کے لئے سڑک کا منظر اس کی نظر سے اوجھل ہوگیا تھا۔

یاسر نے لڑکی کی طرف دیکھا اور لڑکی نے یاسر کی طرف۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ اب رکشا والے سے کوئی بات نہیں کرنی۔

”میرا نام کنول ہے...... کنول فیروز...... میں بنگلور سے آئی ہوں۔ وہاں خواتین کے ایک انگلش میگزین میں سینئر سب ایڈیٹر ہوں۔ میری یہاں آمد کام کے سلسلے میں ہی ہے۔“ لڑکی نے اچانک اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

جواب میں یاسر کو کہنا تھا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ لیکن ایسے الفاظ اکثر اس کے حلق میں ہی اٹک جاتے تھے۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

لڑکی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں سیدھی انڈیا سے نہیں آ رہی ہوں۔ مجھے یہاں سری لنکا میں آئے آٹھ دس روز ہو چکے ہیں۔ مجھے یہاں جافنا میں ایک بوڑھی راہبہ مسز کملا کماری کا انٹرویو کرنا تھا۔ میں سیدھی وہاں چلی گئی۔ اب وہاں سے بائی ایئر آئی ہوں۔ یہاں کولمبو میں بھی مجھے ایک فیچر تیار کرنا ہے۔ آٹھ دس روز یہاں رہوں گی۔ یہاں سے شاید کینڈی جاؤں گی۔ اس کے بعد واپسی ہو گی۔“ لڑکی نے ایک ہی سانس میں سارا پروگرام بتا دیا۔

یاسر خاموشی سے سر ہلاتا رہا۔ سر تو رکشے کے جھٹکوں کی وجہ سے بھی ہل رہا تھا۔ سر کی ”شعوری“ جنبش کو غیر شعوری جنبش سے الگ کرنے کے لئے اسے ذرا مختلف انداز میں سر ہلانا پڑ رہا تھا۔

اپنی بات ختم کرنے کے بعد کنول نامی اس لڑکی نے سوالیہ نظروں سے یاسر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو۔ ’اب تم بھی کچھ منہ سے پھوٹو‘۔

یاسر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

”میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں سافٹ ویئر ڈیزائنر کے طور پر کام کرتا ہوں۔ ہماری فرم نے یہاں چائے کی ایک کمپنی کو سسٹم بنا کر دیا ہوا ہے، اس میں کچھ فالٹ آ رہا ہے۔ درست کرنے کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔ کام تو ایک دو دن کا ہے لیکن خیال ہے کہ دس پندرہ روز یہاں رہوں گا، کچھ گھوموں پھروں گا۔“

”تو آپ کو رہائش آپ کی فرم دے گی؟“

”رہائش اور ٹرانسپورٹ وغیرہ تو انہوں نے ہی دینا تھی لیکن میں نے سوچا کہ یوں آزادی ختم ہو جائے گی۔ میں اپنے طور پر ہی یہاں رہوں گا۔ بعد میں فرم ایڈجسٹمنٹ کرے گی۔“

”تو کہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟“ کنول نے پوچھا۔ اس کے بال تیز ہوا سے اُڑ کر یاسر کے چہرے سے ٹکرا جاتے تھے۔

”ابھی تو کچھ پتہ نہیں۔ شہر جا کر دیکھیں گے۔“

”میں بھی یہی، کوئی جلدی نہیں ہے۔“

یاسر نے بولنے ادب سے سر جھکایا اور سڑک چند ساعتوں کے لئے اس کی پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن نا ایک لنگی پوش دوشیزہ کی کہنی کو بوسہ دیتا ہوا گزر گیا۔

رکشا والے کو اس۔ نے ایک جگہ سے پٹرول لیا۔ اپنے کرائے میں سے دو سو تھے تو وہ پورے کا پورا گھولب کر لئے اور یاسر سے وصول کر کے پٹرول پمپ ہی رہتے تھے لیکن ونڈ اسکر کی آنت جیسا طویل سفر پھر شروع ہو گیا۔

خطرناک ٹریفک کے درمیان اُڑ ہو گیا۔ وہ لوگ چند گنجان علاقوں سے گزر کر کولمبو

”کافی لمبا سفر ہے۔“ کنول نے ، سڑکیں صاف ستھری تھیں اور بلند عمارتیں

”اور خطرناک بھی۔“ یاسر بولا۔ کی جھلک نظر آئی اور نگاہوں کو ایک

”مجھے آپ کی پاکستانی ہاکی ٹیم کا ایک مشہور صلا۔ تے تھے اور چمکیلی سڑکوں کے شوخی سے بولی۔ تھ، اس لئے ہر شے

”وہ کیوں؟“

”لوگ اسے فلائنگ ہارس کہتے تھے...... اب دیکھیں یہ رکشا والا بھی تو فلائنگ ہارس ہی ہے نا...... کس طرح گاڑیوں کو ڈاج دیتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔“

اسی دوران میں رکشا والے نے ایک اور طوفانی موڑ کاٹا۔ کنول پھسل کر یاسر کے ساتھ آ لگی۔ اس کے تیزی سے اُڑتے ہوئے بال یاسر کے چہرے سے اٹکھیلیاں کرنے لگے۔ وہ بالکل سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا، اب مزید نہیں سمٹ سکتا تھا۔ اس نے اپنی توجہ رکشا سے باہر مبذول کر دی۔

یہ سری لنکا کی پہلی جھلکیاں تھیں جو وہ دیکھ رہا تھا۔ ماحول تقریباً ویسا ہی تھا جیسا وہ کراچی میں چھوڑ کر آیا تھا۔ بس ہریالی زیادہ تھی۔ بے تحاشا پام اور ناریل نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک نمایاں تبدیلی خواتین کے لباسوں میں نظر آتی تھی...... رنگ برنگی لنگیاں تھیں۔ بالائی لباس میں دوپٹہ قسم کی کوئی بھی شے ناپید تھی۔ کچھ لڑکیاں پتلون قمیص میں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ یاسر نے کئی ہیلمٹ پوش جوڑوں کو دیکھا جو موٹر سائیکل پر تیزی سے ان کے پاس سے گزرے۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“ کنول کی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

ہی لاہور اور کراچی کی
سے گزر رہا ہوں۔"

لڑکی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں سیدھی انڈیا سے نہیں آ رہی ہوں۔ مجھے یہاں س[…]
دس روز ہو چکے ہیں۔ مجھے یہاں جافنا میں ایک بوڑھی راہبہ م[…]
کرنا تھا۔ میں سیدھی وہاں چلی گئی۔ اب وہاں سے بائی ایئر آ[…] زرا توقف سے بولی۔ "سارا
بھی مجھے ایک فیچر تیار کرنا ہے۔ آٹھ دس روز یہاں رہوں گی[…] کی اصل صورت نہیں دیکھی۔
جاؤں گی۔ اس کے بعد واپسی ہو گی۔" لڑکی نے ایک
دیا۔
[…]ہے؟" یاسر نے فروٹ شاپس پر چھوٹے

یاسر خاموشی سے سر ہلاتا رہا۔ سر تو رکشے[…] ہوئے پوچھا۔
کی "شعوری" جنبش کو غیر شعوری جنبش[…] پھوٹ گئی۔ اس کے بال جو پہلے ہی رقص کر رہے
میں سر ہلانا پڑ رہا تھا۔ […]ے۔ کھنک دار آواز میں بولی۔
اپنی بات ختم کی۔ آپ ایک پرفیکٹ پردیسی محسوس ہو رہے ہیں۔ یہ پیلے رنگ کا پھل ہی تو سری
لنکا کی شناخت ہے جناب...... یہ ناریل ہے۔"

"میں تو اسے پپیتا سمجھ رہا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ چیزوں کو شناخت کرنے میں میری صلاحیت کافی بہتر ہے۔"
وہ یاسر کی طرف دیکھ کر عجیب انداز سے بولی۔

"میں سمجھا نہیں؟"

"شروع میں ناریل کے یہ ڈھیر دیکھ کر لوگ اسے پپیتا ہی سمجھتے تھے۔"

رکشا والے نے ایک اور طوفانی موڑ کاٹا۔ اس مرتبہ یاسر کنول پر گرتے گرتے بچا۔ نادانستہ طور پر اس کا ہاتھ کنول کے جسم سے چھو گیا۔ کنول اس واقعے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"یہ دیکھیں یاسر صاحب! یہ بالکل آپ کے فلائنگ ہارس والا انداز ہے۔ بالکل زیرو ڈگری پر جا کر اس نے کیا کراس لگایا ہے۔ کم از کم تین گاڑیوں کو تو یہ صاف غچہ دے گیا ہے۔"

یاسر نے ملائمت سے رکشا والے کا کندھا چھوا اور عاجزی سے بولا۔

"آہستہ چلو...... ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔"

اس نے ایک بار پھر ادب سے سر جھکایا اور سڑک چند ساعتوں کے لئے اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ رکشا ایک لنگی پوش دوشیزہ کی کہنی کو بوسہ دیتا ہوا گزر گیا۔

راستے میں رکشا والے نے ایک جگہ سے پٹرول لیا۔ اپنے کرائے میں سے دو سو روپے اس نے فوری طور پر طلب کر لئے اور یاسر سے وصول کر کے پٹرول پمپ والے کو دے دیئے۔ ان کا شیطان کی آنت جیسا طویل سفر پھر شروع ہو گیا۔

جلد ہی کنول کا کہنا درست ثابت ہو گیا۔ وہ لوگ چند گنجان علاقوں سے گزر کر کولمبو کے پوش علاقوں میں داخل ہو گئے۔ یہاں سڑکیں صاف ستھری تھیں اور بلند عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ جلد ہی انہیں نیلے سمندر کی جھلک نظر آئی اور نگاہوں کو ایک دلفریب وسعت کا احساس ہوا۔ اس وسعت میں پام لہلہاتے تھے اور چمکیلی سڑکوں کے کنارے بلند و بالا عمارتیں چمکتی تھیں۔ فضا گرد سے بالکل صاف تھی اس لئے ہر شے اپنے اصل رنگ میں دمکتی نظر آ رہی تھی۔

"یہ گال فیس روڈ ہے۔" کنول نے ایک نیون سائن پڑھنے کے بعد اعلان کیا۔

"ہمیں کہاں اترنا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہوٹل ہالیڈے ان کے سامنے اتر جاتے ہیں۔ پھر دیکھ لیتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔"

وہ دونوں غیر محسوس طور پر اپنے لئے "ہم" کا مشترکہ صیغہ استعمال کرنے لگ گئے تھے جیسے انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی ایک ہی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ ہم آہنگی غالباً ہم زبانی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی ورنہ کہاں یاسر اور کہاں لڑکی۔ وہ اس مزاج کا آدمی نہیں تھا۔ وجودِ زن سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہوتا ہو گا لیکن اُس کی "ذاتی کائنات" میں اس قسم کی کوئی رنگ آمیزی نہیں تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک اندروں بیں آدمی تھا۔ وہ جس فرم میں کام کرتا تھا وہ "ملٹی نیشنل" تھی۔ وہاں کئی حسین چہرے نظر آتے تھے اور ان میں سے کچھ کو دیکھ کر اس کی نگاہ چونکتی بھی تھی لیکن یہ لمحاتی کیفیت ہوتی تھی۔ ایک دو لڑکیوں سے اس کی دوستی بھی ہوئی تھی تاہم یہ دوستی اپنی "اکل معروف" شکل میں نہیں بدلی تھی اور اس "انہونی" میں زیادہ عمل دخل یاسر کا

ہی تھا۔

یہ سفر یاسر کی زندگی میں رکشا کا طویل ترین سفر تھا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ انہیں اتنا لمبا سفر رکشا پر کرنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ رکشا سے اترنے کے بعد یاسر نے طے شدہ کرایہ یعنی 600 روپے رکشا والے کی طرف بڑھائے تو اس نے بتیسی نکال دی۔ مگر اس سے پہلے کہ روپے رکشا والے کے ہاتھ میں پہنچتے کنول نے یاسر کا ہاتھ روک لیا اور اس میں سے 200 روپے نکال کر یاسر کو واپس دیتے ہوئے بولی۔

”مجھے آپ کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ اس قسم کے دھوکے کھاتے ہوں گے...... آپ اس فلائنگ ہارس کو 200 روپے پٹرول پمپ پر ادا کر چکے ہیں۔“

”اوہ گاڈ...... میرے ذہن سے نکل گیا۔“ یاسر نے ہونٹ سکوڑے۔

رکشا والے کے مطالبے پر کنول نے اسے بیس روپے ٹپ دی اور وہ سلام کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کنول نے اسی وقت اپنے حصے کے 310 روپے گنے اور یاسر کے منع کرنے کے باوجود اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔

وہ دونوں ایک چوراہے پر کھڑے تھے۔ چاروں طرف چمکتی ہوئی سڑکیں تھیں۔ عقب میں سمندر تھا، سامنے ہالیڈے ان اور دیگر فائیو اسٹار ہوٹلوں کی بلند و بالا عمارتیں...... بائیں طرف گال فیس روڈ جو نیلے سمندر کے ساتھ ساتھ دور تک چلی گئی تھی۔

”آ...... آپ کا اب کیا ارادہ ہے؟“ یاسر نے جھجکتے ہوئے کنول سے پوچھا۔

”میں اب آپ کو خدا حافظ کہوں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

یاسر نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ یکبارگی ہنس دی...... اور ایک بار پھر جیسے پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ وہ بائیں ہاتھ سے اپنے بالوں کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”میرا کوئی خاص ارادہ نہیں ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ میری طرح کوئی اوسط درجے کا ہوٹل چاہتے ہیں۔ اگر ہم اکٹھے ہوٹل تلاش کریں تو علیحدہ علیحدہ مشقت سے بچ جائیں گے۔“

”جی...... جیسے آپ کی مرضی۔“ یاسر نے کہا۔

وہ ایک چوراہا تھا...... اور چوراہوں سے راستے نکلتے ہیں۔ کچھ راستے پل بھر میں جدا کرتے ہیں، کچھ ہمیشہ کا ساتھ دے جاتے ہیں۔ کچھ خوشی سے ہمکنار کرتے ہیں...... کچھ زندگی بھر کا روگ بنتے ہیں۔ ان کے سامنے بھی چار راستے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس راستے پر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اپنے اٹیچی کیس اٹھائے، نیلے سمندر کی طرف پشت کی اور دھیمے قدموں سے ایک راستے پر چل دیئے۔

ہالیڈے ان کا کرایہ ان کی توقعات کے مطابق کافی زیادہ تھا۔ ایک ٹیکسی والے نے انہیں اپنے قیمتی مشورے سے نوازا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

”آپ کا ہوٹل تلاش کرنے کا طریقہ غلط ہے۔ اس علاقے میں سارے ہی فائیو اسٹار ہوٹل ہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کس درجے کا ہوٹل چاہتے ہیں، میں آپ کو اس علاقے میں لے جاؤں گا۔“

کنول بولی۔ ”ہمیں درمیانے درجے کی رہائش درکار ہے۔ ہم اچھے کمرے کے لئے دو ہزار تک کرایہ افورڈ کر سکتے ہیں۔“

”وری گڈ......“ ٹیکسی والے نے شد و مد سے سر ہلایا اور انہیں ٹیکسی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کنول ہوشیاری سے بولی۔ ”آپ کتنا کرایہ وصول کریں گے؟“

یاسر کے اندازے کے مطابق ٹیکسی والے نے پہلے 150 روپے کہنا چاہا پھر کنول کے حُسن کی تاب نہ لاتے ہوئے 100 کہہ ڈالے۔ دونوں نے فوراً حامی بھری اور ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔

ٹیکسی والے نے دو ہوٹلز کے نام لئے اور بتایا کہ یہ دونوں ہوٹل آپ کی ڈیمانڈ کے مطابق ہیں۔ ان میں سے ایک ہوٹل کا نام نیپون تھا۔ وہ انہیں پہلے نیپون ہوٹل میں لے کر گیا۔ دو رویہ صاف ستھری سڑک کے کنارے یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ عام کمرا 1600 سری لنکن روپے میں دستیاب تھا جبکہ ایئر کنڈیشنڈ روم کا کرایہ 2800 کے لگ بھگ تھا۔

2800 روپیہ دونوں کو زیادہ محسوس ہوا لیکن یہ ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ اس گرمی

میں وہ نان ایئر کنڈیشنڈ کمرے کا خطرہ مول لیں۔ ویسے بھی تھکن نے نڈھال کر رکھا تھا۔ انہوں نے ایک ایک ایئر کنڈیشنڈ کمرا ایک دن کے لئے بک کروا لیا۔ یہ عارضی بندوبست تھا۔ فیصلہ یہ تھا کہ تازہ دم ہونے کے بعد اس بارے میں مزید سوچا جائے گا۔

کرایہ ادا کرنے سے پہلے کنول باری باری دونوں کمروں میں گئی اور ایئر کنڈیشنر چلا کر ان کی کارکردگی اور عمومی صحت کا بغور جائزہ لیا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے کرایہ ادا کیا...... یاسر کو مسلسل اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خاصی ہوشیار واقع ہوئی ہے اور ہر معاملے کو باریک بینی سے دیکھنے کی عادی ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر یاسر نے جوتے اتارے اور بستر پر چت ہو گیا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ خوشگوار ٹھنڈک میں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ دروازے پر ہونے والی ہلکی دستک کے سبب وہ جاگا۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ان کے کمرے فرسٹ فلور پر تھے۔ کھڑکیوں میں سے سڑک کے بارونق مناظر دکھائی دیتے تھے۔ یاسر کو ایسے متحرک مناظر والی کھڑکیاں بہت بھاتی تھیں خاص طور سے جب وہ کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرتا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے کنول کھڑی تھی۔ وہ ایک دم نکھری نکھری اور تر و تازہ نظر آتی تھی۔

"کیا بات ہے بھئی! کولمبو میں یہ پہلی شام سو کر ہی گزار دینی ہے؟" وہ چہکی۔

"بس...... مجھے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔"

وہ کمال بے تکلفی سے اندر آ گئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے آدھے بازو کی پھولدار شرٹ کے ساتھ نیلی جینز پہن رکھی تھی۔ بالوں نے کانوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یاسر اس کے سراپے سے نظر چراتے ہوئے بولا۔

"بس میں دو منٹ میں منہ ہاتھ دھو کر نکلتا ہوں۔ پھر آپ کہیں گی تو بازار کا چکر لگائیں گے۔"

"میں ضرور کہوں گی...... بلکہ زور دوں گی۔ جو سوتا ہے، وہ کھوتا ہے۔ یہ محاورہ تو ہم نے چھٹی جماعت میں پڑھ لیا تھا۔"

یاسر باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ مسلسل اس فتنہ ساماں لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کافی بے باک واقع ہوئی تھی۔ ابھی اسے ملے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن وہ یاسر سے یوں بات کر رہی تھی جیسے برسوں سے جانتی ہو۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی یہ بے تکلفی مزید بڑھے گی۔ اب بھی وہ صوفے پر بیٹھی گنگنا رہی تھی اور اس کی مدھم گنگناہٹ باتھ روم کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔

یاسر نے منہ ہاتھ دھونے اور لباس بدلنے میں کافی تیزی دکھائی۔ وہ جلد از جلد کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کنول کے ہمراہ اس کمرے میں اسے عجیب سی گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں قالین پوش سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ تھوڑی دیر لابی میں ٹی وی دیکھتے رہے پھر سڑک پر چہل قدمی کرنے لگے۔ غیر آلودہ فضا کے سبب ہر شے نکھری ہوئی اور چمکدار تھی۔ پکوانوں میں ناریل کے تیل کی باس تھی۔ سانولی سلونی لڑکیوں کے بالوں میں رجنی گندھا کے پھول مہک رہے تھے۔ بلند قامت ناریل ساحل کی مدھم ہوا میں جھومتے تھے اور سرگوشیاں کرتے تھے۔

کنول نے کہا۔ "مجھے پاکستان دیکھنے کا بہت شوق ہے...... آپ کے کھلاڑیوں کے بارے میں کافی کچھ جانتی ہوں...... اس کے علاوہ آپ کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں بھی...... حالانکہ ادب سے میری دلچسپی بس واجبی سی ہے۔"

"مثلاً کن کن کے بارے میں جانتی ہیں آپ؟"

"فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور کھلاڑیوں میں عمران خان، جہانگیر خان...... اور میانداد، شارجہ کے چھکے والا۔"

"آپ کے ہاں بھی نامور کھلاڑی اور فنکار موجود ہیں۔" یاسر نے جذبۂ خیر سگالی کے طور پر کہا۔

وہ باتیں کرتے رہے اور چلتے رہے۔ کنول نے "کے ایف سی" میں برگر کھایا۔ یاسر نے آلو کے چپس اور پیپسی پر گزارا کیا۔ کنول کے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں ایک گولڈن رنگ چمک رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا، کیا اس کی منگنی یا شادی ہو چکی ہے...... یا اس نے ویسے ہی پہن رکھا ہے۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ کنول کی ذاتی زندگی کے

حوالے سے کوئی بات پوچھ سکے لیکن ایسی باتیں اکثر اس کے حلق میں اٹک جایا کرتی تھیں۔

دوسری طرف کنول کا یہ عالم تھا کہ کوئی بات اس کے حلق میں اٹکتی ہی نہیں تھی۔ وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے یاسر کے بارے میں سوالات کرتی چلی جا رہی تھی۔ یاسر نے اسے بتایا کہ وہ خوش قسمتی سے ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔ اپنے والدین کے ساتھ لاہور میں رہتا ہے۔ ایک بڑا بھائی ہے جو بزنس کرتا ہے۔ ایک چھوٹی بہن ہے جو ماسٹرز کر رہی ہے۔ وہ خود ایک ملٹی نیشن فرم میں سروس کر رہا ہے۔

''کوئی جیون ساتھی چنا ہے یا نہیں؟'' کنول نے ایک بار پھر زبردست بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا رنگ سرخ ہو گیا ہے۔ خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے بولا۔

''نہیں، ابھی سارا دھیان اپنے کام کی طرف ہے۔''

''میں یہ نہیں مانتی۔ انسان کا سارا دھیان کبھی ایک کام میں رہ ہی نہیں سکتا۔ کچھ نہ کچھ گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔'' اس کی سیاہ آنکھوں میں شوخی تھی۔

''میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔''

''آپ کا فقرہ ٹھیک نہیں۔ آپ کو یوں کہنا چاہئے تھا کہ آپ فی الحال مجھ سے متفق نہیں۔ مستقبل کے بارے میں کوئی بھی پیش گوئی کرنا آسان نہیں ہوتا۔'' اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

رات کو یاسر دیر تک جاگتا رہا۔ نیون روڈ کی سامنے والی سڑک پر ٹریفک کا مدھم شور سنائی دیتا رہا۔ ہوٹل کے عین سامنے ایک چکن تکہ شاپ پر سنہالی گیت گونجتے رہے۔ ٹائیلوں کے نہایت شفاف فرش پر یاسر ننگے پاؤں ٹہلتا رہا...... اور سوچتا رہا، اس کے اندر کوئی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ کوئی ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک نہایت سنجیدہ اور حقیقت پسند شخص تھا۔ رومانیت کے لئے اس کے دل و دماغ میں بہت کم گنجائش تھی۔ اب تک سینکڑوں حسین چہرے اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر چکے تھے۔ خاندان میں اور خاندان سے باہر درجنوں لڑکیاں ہوں گی جن سے وہ ملا تھا، جن

سے باتیں کی تھیں، جنہیں بغور دیکھا تھا...... لیکن دل کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہوئی تھی جو آج ہوئی تھی۔ نگاہوں میں جیسے کچھ جم کر رہ گیا۔ تیز ہوا میں اُڑتے ہوئے بال رہ رہ کر اس کے چہرے سے چھوتے تھے اور اس کے تصور کو ایک بے نام خوشبو سے بھر دیتے تھے۔

یہ کیا تھا؟...... یہ کیا ہو رہا تھا؟...... وہ ایک چھبیس ستائیس سالہ میچور شخص تھا۔ وہ کیوں ایک ٹین ایجر کی طرح سوچ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے تصور کو جھٹکنے لگا۔ لیکن ہوا میں اُڑتے ہوئے بال بڑے شریر تھے۔ ہر بار اس کے چہرے سے چھو کر واپس جاتے۔

وہ بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کئی افسانوی فقرے اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ پہلی نظر کا پیار...... پہلی نگاہ کا عشق...... آئیڈیل کا حصول...... سپنوں کی تعبیر...... کیوپڈ کا چلایا ہوا تیر......

اُسے یاد آیا کہ کل ایئرپورٹ سے شہر پہنچنے پر جب وہ دونوں رکشا سے اترے تھے تو کنول نے ایک فقرہ کہا تھا یاسر کے اس سوال پر کہ اب کیا ارادہ ہے؟ وہ بولی تھی اب میں آپ کو خدا حافظ کہوں گی۔ اس نے یہ فقرہ مذاق میں کہا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں...... یاسر کے دل پر گھونسہ سا لگا تھا۔ جیسے اس نے کوئی نہایت ناپسندیدہ اور انہونی بات کہہ دی ہو۔

...... یہ کیا حماقت ہے؟...... وہ سوچنے لگا۔ کہیں وہ بھی تو کسی ان دیکھے تیر کا شکار نہیں ہونے والا؟ یہ سوچ بے حد مضحکہ خیز تھی۔ یہ تصور ہی اس کے لئے روح فرسا تھا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ گیا اور شفاف فرش پر ٹہلنے لگا۔ اس نے اپنے تصور کو کئی شدید کچوکے دیئے۔ خود پر دیر تک لعنت ملامت کرنے کے بعد وہ کسی حد تک مطمئن ہوا اور پھر چادر اوڑھ کر سو گیا۔

صبح اٹھا تو رات والے سارے خیالات بے ہودہ اور عبث محسوس ہوئے۔ اسے اپنے آپ پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ رات سونے سے پہلے اس نے کنول کے بارے میں جس انداز سے سوچا تھا وہ ہر لحاظ سے احمقانہ تھا

کھڑکیوں سے باہر کولمبو کی ایک چمکدار صبح دستک دے رہی تھی۔ سڑک کے پار بس

اسٹاپ تھا۔ دفتروں اور فیکٹریوں کو جانے والے خواتین و حضرات اسٹاپ پر موجود تھے۔ اکثر خواتین کے ہاتھوں میں چھتریاں تھیں۔ بس اسٹاپ کے ساتھ ہی ایک بڑا گرجا تھا۔ گرجے کا صحن کمرے کی کھڑکی سے صاف نظر آتا تھا۔ لکڑی کے بینچ طویل قطاروں میں رکھے تھے۔ عبادت گزاروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ دعائیں، مناجات، آنسو، عاجزی، تشکر وہ سب کچھ موجود تھا جو روزِ ازل سے انسان کے ساتھ موجود ہے۔ گرجا گھر کی دیوار کے ساتھ چکن تکہ شاپ فی الحال سنسان پڑی تھی۔

لاہور سے روانہ ہوتے وقت یاسر نے ایک پروگرام بنایا تھا۔ وہ ایک ایسا کام کرنا چاہتا تھا جو لاہور میں رہتے ہوئے ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مونچھیں صاف کروانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کولمبو پہنچ کر پہلے روز ہی کلین شیو ہو جائے گا۔ بعد ازاں اگلے دو تین ہفتوں میں مونچھیں پھر سے اصل حالت میں آ جائیں گی...... یوں اس کا شوق پورا ہو جائے گا اور عزیز و اقارب کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔

وہ ریزر لے کر واش روم میں گھس گیا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کتنی ہی دیر سوچتا رہا۔ عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو سمجھایا، بھلے مانس! یہاں کون ہے تیری جان پہچان والا؟ کس کو اچھا یا برا لگنا ہے؟ موقع ہے، شوق پورا کر لے...... ذہن نے فوراً ہی مخالفانہ دلیل دی...... بھئی اگر کسی وجہ سے تجھے اپنا قیام مختصر کرنا پڑا تو پھر؟...... مونچھوں کو اپنے حساب سے بڑھنا ہے۔ اگر تیری واپسی کے حساب کتاب میں تبدیلی آئی تو کیا ہو گا؟

وہ مونچھوں پر کلہاڑا چلائے بغیر واش روم سے نکل آیا۔ اس نے نہا کر کپڑے بدلے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور کنول چھپاک سے اندر آ گئی۔ ڈھیلی ڈھالی قمیض اور پنڈلیوں کے ساتھ چپکی ہوئی سرخ پتلون کے ساتھ وہ کل سے زیادہ دراز قد نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نفیس خوشبو کا ایک جھونکا اندر آ گیا تھا۔ کنول کے ہاتھ میں امپورٹڈ بسکٹس کے ڈبے تھے، آسٹریلیا کا خشک دودھ تھا، انگلینڈ کا مکھن تھا اور غالباً ہالینڈ کا جیم تھا۔

"یہ کیا ہے؟" یاسر نے پوچھا۔

"انڈیا میں تو اسے ناشتہ کہتے ہیں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"پاکستان میں بھی اسے ناشتہ ہی کہتے ہیں۔ لیکن ایسا ناشتہ پانچ چھ آدمی مل کر کرتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں...... اگر زیادہ ہے تو ہم پانچ چھ دن تک کر لیں گے۔"

وہ "ہم" کا لفظ اتنے تواتر سے استعمال کر رہی تھی کہ اب یہی مناسب محسوس ہونے لگا تھا۔

ناشتے کے دوران وہ کھڑکیوں سے باہر کا نظارہ کرتے رہے۔ یہ ورکنگ ڈے تھا۔ زندگی اپنی عجلت آمیز رفتار سے رواں دواں تھی۔ اس روانی میں بڑے سائز کی لگژری گاڑیاں کثرت سے نظر آ رہی تھیں۔ سری لنکا کی معیشت کو کمزور جانا جاتا ہے لیکن گاڑیوں کی لمبائی اور پلازوں کی بلندی دیکھ کر یہ تصور غلط محسوس ہونے لگتا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ گھر والوں کو ایک فون کر لیا جائے۔" کنول نے دودھ کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی اُداسی؟" یاسر بولا۔

"بات اُداسی کی نہیں، پریشانی کی ہے۔" گھر والے پریشان ہوں گے۔" کنول نے جواب دیا۔ پھر بالوں کو کانوں کے پیچھے اُڑستے ہوئے کہنے لگی۔ "اسی سڑک پر...... وہ آگے چوک کے پاس پی سی او ہے۔ میں نے رات کو ہی دیکھ لیا تھا۔"

یاسر نے کنول کی انگلی کا تعاقب کیا اور پی سی او دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ کھڑکی کے بالکل سامنے آتے ہوئے بولی۔

"وہ دیکھو بھئی! وہ چوک کے قریب جو پیپسی کا ہورڈنگ ہے، اس سے چند گز آگے سبز رنگ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔"

یاسر نے دوبارہ کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ کنول عجیب بے ساختگی سے اس کے عقب میں آ گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ کنول نے کمر کو خم دے کر اپنا سر یاسر کے سر کے لیول پر کیا۔ پھر اپنی انگلی سیدھی کرتے ہوئے اسے سبز بورڈ کی سمت بتائی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یاسر کے بے حد قریب چلی آئی تھی۔ اس کا جسم یاسر کی پشت سے چھو رہا تھا۔ یاسر کی آنکھیں دھندلا سی گئیں۔ اس نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلا کر اعلان کیا کہ اس نے پی سی او کا سبز بورڈ دیکھ لیا ہے حالانکہ بورڈ تو کجا اسے ان لمحوں میں سڑک

بھی ٹھیک سے دکھائی نہیں دی تھی۔

کنول اس کے سامنے آ بیٹھی اور اطمینان سے ڈبل روٹی پر جیم لگانے لگی۔ اسے مطلق خبر نہیں ہوئی تھی کہ چند لمحے پہلے اس نے یاسر پر کیا قیامت ڈھائی ہے۔ یاسر کا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ وہ گلاس دھونے کے بہانے واش روم میں چلا گیا۔

ناشتے کے بعد انہوں نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ اپنے کمرے تبدیل کر لئے۔ انہوں نے کل ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ گرمی کا احساس دوپہر بارہ ایک بجے سے سہ پہر پانچ بجے تک ہوتا ہے۔ اس کے بعد موسم نارمل ہو جاتا ہے۔ رات بھی ''اے سی'' کے بغیر اطمینان سے گزاری جا سکتی ہے۔ پھر خواہ مخواہ قریباً 1200 روپے روزانہ زائد خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

انہوں نے نان اے سی کمرے لے لئے۔ یہ کمرے بھی فرسٹ فلور پر ہی تھے۔ گرجا اور بس اسٹاپ ان سے ذرا دور چلے گئے تھے لیکن اب بھی نگاہوں کے سامنے ہی تھے۔ اس مرتبہ ایک اچھا اتفاق یہ ہوا تھا کہ دونوں کمرے ساتھ ساتھ ملے تھے۔

کنول کے سامان میں دو سوتی چادریں بھی تھیں۔ یہ چادریں وہ بستر کے لئے استعمال کرتی تھی۔ ان میں سے ایک نئی سفید چادر کمروں کی تبدیلی کے دوران میں گم ہوگئی۔ دراصل ہوٹل کی چادریں بھی اسی شکل وصورت کی تھیں...... وہ ان میں ''مکس'' ہوگئی تھی۔ روم سروس والوں سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لیکن جب کنول یاسر کے ساتھ خود استقبالیہ پر پہنچی اور ان دونوں نے ذرا گمبھیر لہجے میں استقبالیہ والوں سے بات کی تو دو چار منٹ کے اندر چادر برآمد ہوگئی۔

واپس کمرے میں پہنچ کر یاسر نے کہا۔

''اس سے ثابت ہوا کہ کبھی کبھی خاموشی مصیبت کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ اگر ہم چپ رہتے تو چادر ناپید ہو جانا تھی۔''

''اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہوتی ہے۔'' کنول مسکرائی۔ ''اتفاق میں برکت اور اتحاد میں شکتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہم دونوں ساتھ تھے اس لئے یہ چھوٹا سا مسئلہ، چھوٹا سا مسئلہ ہی رہا۔ وہ کیا کہتے

ہیں، ایک ایک اور دو گیارہ۔''

''اب کیا پروگرام ہے؟'' یاسر نے پوچھا۔

''میں تو آج فارغ ہی ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو گال فیس کی سیر کر لیتے ہیں۔''

''مم...... میں دراصل......''

''کہیں جانا ہے کیا؟''

''نہیں ایسی تو بات نہیں...... چلو ٹھیک ہے...... چلتے ہیں گال فیس۔'' یاسر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

اسے اپنی پشت پر ابھی تک ایک لمس کی حدت محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں نیپون ہوٹل سے نکلے۔ ایک رکشا خود ہی ان کے قریب آن کھڑا ہوا۔ کہتے ہیں کہ جنت میں جنتی جس پھل کی خواہش کرے گا وہ خود شاخ سمیت جھک کر سامنے چلا آئے گا۔ سری لنکا میں بھی یاسر نے جب سواری کی خواہش کی، کوئی رکشا کہیں سے نمودار ہوا اور ٹھک ٹھک کرتا ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ گال فیس روڈ کا کرایہ 50 روپے طے کرنے کے بعد وہ رکشا میں بیٹھے اور سانولے سلونے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ساحل پر پہنچ گئے۔ یاسر کے لئے رکشا کا سفر آج قدرے کم پریشان کن ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ رکشا والا ''فلائنگ ہارس'' نہیں تھا...... اور دوسری وجہ یہ تھی کہ کنول نے آج اپنے بال کس کر باندھ رکھے تھے۔

ساحل کا منظر دلفریب تھا۔ مغرب میں حد نگاہ تک نیلا پانی اور اس پر پھیلی ہوئی دھوپ...... سورج دھیرے دھیرے نصف النہار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ساحل کے ساتھ ایک شفاف سڑک شمالاً جنوباً دور تک چلی گئی تھی۔ یہ سڑک سمندر کا کنارہ بناتی تھی۔ اس سے پیچھے ایک بڑی سڑک تھی۔ یہی گال فیس روڈ کہلاتی تھی۔ اس کے ساتھ پُرشکوہ عمارتیں دعوتِ نظارہ دیتی تھیں۔ عمارتوں کے سامنے سے لمبی چم چم کرتی کاریں فراٹے سے گزر جاتی تھیں۔ بعینہٖ کسی یورپی ملک کا منظر تھا۔ اس منظر کو حقیقت سے مزید قریب کرنے کے لئے سینکڑوں سفید فام سیاحوں کی ٹولیاں یہاں وہاں گھومتی نظر آ رہی تھیں۔ یاسر کو لاہور میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ سری لنکا میں دسمبر سے فروری تک کے مہینے سیاحت کے لئے بہترین ہوتے ہیں۔ یعنی کم بارشیں، کم حبس اور کم

گرمی۔

اچانک یاسر ایک منظر دیکھ کر چونکا۔ ایک پتھریلے بینچ پر ایک خوش رنگ چھتری نظر آ رہی تھی۔ اس چھتری تلے ایک لڑکا لڑکی سمٹ کر بیٹھے تھے اور راز و نیاز میں مصروف تھے۔ پھر یاسر کو دو جوڑے مزید نظر آئے۔ وہ بھی اسی طرح چھتری تلے اپنی دنیا بسائے بیٹھے تھے۔ ایک جوڑے کی تو صرف ٹانگیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ تب یاسر کی نگاہ کچھ مزید آگے گئی اور وہ سناٹے میں رہ گیا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ حد نگاہ تک ایسے ہی پتھریلے بینچ اور ایسی ہی چھتریاں نظر آ رہی تھیں۔ ہر چھتری تلے دو سانولے سلونے پریمی موجود تھے اور خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔

یاسر نے چور نظروں سے کنول کی طرف دیکھا جیسے چاہ رہا ہو کہ اس کی نگاہ اس واہیات منظر پر نہ پڑے۔ لیکن وہ تو جیسے یاسر سے پہلے ہی سب کچھ ملاحظہ کر چکی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"یہاں یہ سب چلتا ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے چاچو سے سنا تھا۔ وہ دو سال پہلے سری لنکا آئے تھے۔"

"عجیب بے ہودگی ہے۔"

"اس بے ہودگی کو یہاں "امبریلا لو" کہتے ہیں...... چلو ہم سمندر کی طرف چلتے ہیں۔"

ان دونوں نے اپنا رخ تھوڑا سا تبدیل کر لیا اور پریمی جوڑوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سمندر کی طرف بڑھے۔ لیکن سمندر کے عین کنارے پر بھی بہت سے بینچ موجود تھے اور یہاں بھی ابن آدم اور بنت حوا اپنی حیات کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے سروں پر چھتریاں تان رکھی تھیں۔ عجیب دھوپ چھاؤں کا منظر تھا۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا معاملہ تھا۔

یاسر نہ چاہنے کے باوجود کن اکھیوں سے ان جوڑوں کی مصروفیات دیکھتا رہا۔ یہ سب نوجوان تھے۔ کسی کا سر کسی کے کندھے پر تھا، کوئی ہم آغوشی کی حالت میں نظر آتا تھا، کوئی نیم دراز تھا۔ جب انہوں نے جذبات سے مجبور ہو کر چونچ لڑانا ہوتی تھی تو امبریلا اپنے چہروں کے سامنے کر لیتے تھے۔

یہ ایک بچکانہ سی شرماہٹ تھی...... یہ شرماہٹ اس ساحلی تفریح گاہ پر کب تک برقرار رہے گی، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ شاید مزید دس پندرہ سال، یا پھر چالیس پچاس سال...... اس چھتری کو ایک دن بہرحال وقت کی ہوا میں اڑ جانا تھا۔ یاسر کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ شرم اور مکمل بے باکی کا ایک درمیانی مرحلہ ہے...... یہ چھتری جو ایک "معصوم جھجک" کی علامت تھی، دو انتہاؤں کے درمیان اس ساحلی ریت پر تنی ہوئی تھی۔

"سمندر کتنا نیلا ہے...... اپنا دھیان سمندر کی طرف رکھو۔" وہ شوخی سے بولی۔

"اچھے بچے تاکا جھانکی نہیں کرتے۔"

"اچھے بچے یوں سر عام اٹکھیلیاں بھی تو نہیں کرتے۔" یاسر نے کہا۔ "میں حیران ہو رہا ہوں۔"

"کس بات پر؟" وہ بالوں کو ربن سے باندھتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ ان نوجوانوں کے اہل خانہ یا جان پہچان والے لوگ اس پکنک اسپاٹ پر آ سکتے ہیں۔ وہ انہیں دیکھ لیں تو کیا کریں۔"

"یہ تو تم کسی مقامی سے پوچھو۔ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو کسی "پریشان کن منظر" کا خطرہ ہو وہ ادھر آتے ہی نہ ہوں...... اور اگر آتے ہوں تو تمہاری طرح اِدھر اُدھر جھانکتے نہ ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ آنکھیں تو تم نے بھی بند نہیں کر رکھیں۔"

"فرق صرف یہ ہے کہ میں چور نظروں سے نہیں دیکھتی۔" وہ بے باک مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اچانک یاسر نے ایک بات نوٹ کی۔ وہ دونوں بڑے غیر محسوس طریقے سے "آپ" سے "تم" پر آ گئے تھے۔ وہ قریباً چوبیس گھنٹے پہلے ملے تھے اور اب یوں لگ رہا تھا کہ مدتوں سے ایک دوجے کو جانتے ہوں۔ یاسر نے سن رکھا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے ساری زندگی بھی ملتے رہو تو اجنبی لگتے ہیں...... لیکن کچھ لوگ پل دو پل کے لئے ملتے ہیں اور مدتوں کے شناسا محسوس ہونے لگتے ہیں...... یہ پارہ صفت لڑکی بھی شاید دوسری قسم کے لوگوں میں تھی۔

وہ دونوں سمندر کے قریب تر چلے گئے اور پھر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ یاسر نے اِردگرد نگاہ دوڑائی۔ وہ غالباً واحد جوڑا تھے جو ''شرماہٹ کی چھتری'' کے بغیر بیٹھا ہوا تھا۔ کنول اچھلتی کودتی لہروں کو دیکھنے لگی۔ دور کہیں کوئی بجرا پانی کی سطح پر ڈول رہا تھا۔ پانی کے اندر کچھ مقامی بچے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ کنول کی ساری توجہ مناظر کی طرف تھی۔ کسی وقت وہ اردگرد کے ماحول میں کھو جاتی تھی کہ یاسر کو یکسر نظر انداز کر دیتی تھی یاسر نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ سورج کی روشنی اس کے گلابی رخساروں پر منعکس ہو رہی تھی۔ چہرے پر ایک معصوم سی چمک تھی۔ ایسی معصومیت جو بے باکی اور سچائی میں گندھی ہوئی تھی۔ شکر ہے کہ اس کے بال نہیں اُڑ رہے تھے ورنہ وہ اتنے لمبے ضرور تھے کہ دو ڈھائی فٹ کے فاصلے سے بھی یاسر کے چہرے کو چھو سکتے تھے۔

دفعتہً یاسر کو آج صبح کا منظر یاد آ گیا۔ یاسر کو ''پی سی او'' کا سبز بورڈ دکھانے کے لئے وہ اس کے عقب میں آ گئی تھی۔ اس کے خوشبودار بازوؤں نے یاسر کے گرد گھیرا سا قائم کر لیا تھا۔ یاسر کی پشت پر چنگاریاں سی تیرنے لگیں۔ اس نے اپنا دھیان جلدی سے کنول کی طرف سے ہٹا لیا۔ وہ دائیں طرف دیکھنے لگا۔

تیز ہوا چل رہی تھی۔ دو مقامی لڑکیاں باتیں کرتی ہوئی کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہی تھیں۔ انہوں نے رنگ دار لنگیاں پہن رکھی تھیں لنگیوں کے نچلے کنارے دیدہ زیب تھے۔ ایک ادھیڑ عمر جاپانی ایک بینچ پر اکیلا بیٹھا تھا اور بڑی ہی توجہ سے لڑکیوں کو گھور رہا تھا۔ اس کی سوجی سوجی آنکھوں میں ایک حریصانہ سی چمک تھی جیسے وہ دل ہی دل میں اندازہ لگا رہا ہو کہ یہ تیز ساحلی ہوا ایسی لنگیوں کو اُڑا سکتی ہے یا نہیں۔

''پائن ایپل سر!'' ایک مقامی شخص نے ادب سے جھک کر کہا۔

وہ مخنی سا تھا اور اس نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ کٹے ہوئے اناناس کی قاشیں تھیں۔ کنول کے منہ میں فوراً پانی بھر آیا۔ یہ قریباً آدھا اناناس تھا جو پولیتھین کے دو لفافوں میں ڈالا گیا تھا۔ انہوں نے یہ دو لفافے 30 روپے میں لئے اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگے۔ کنول نے ایک جرنلسٹ ہونے کا ثبوت دیا اور اناناس والے کا انٹرویو شروع کر دیا۔ وہ مسلمان تھا اور اس کا نام محمد نذیر تھا۔ وہ جس

ہٹ نما دکان کے سائے میں بیٹھے تھے وہ محمد نذیر اور اس کے ایک ساجھے دار کی تھی۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ایسی کئی دکانیں تھیں۔ ان پر کولڈ ڈرنکس، سنیکس اور دیگر شرعی و غیر شرعی لوازمات فروخت ہوتے تھے۔

کنول نے ایک بار محمد نذیر کے کان کھانا شروع کئے تو پھر کھاتی چلی گئی۔ وہ بھی مروت کا مارا اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں مسلسل جوابات دیتا رہا۔ جب کنول نے دیکھا کہ محمد نذیر سے گفتگو کافی طویل ہو گئی ہے اور وہ بیزاری یا عدم دلچسپی کا اظہار کر سکتا ہے تو اس نے فوراً محمد نذیر کو بزنس فراہم کیا۔ دو کولڈ ڈرنکس، دو چپس اور بسکٹ محمد نذیر کی شاپ سے خرید لئے۔

وہ محمد نذیر سے مقامی حالات اور معمولات کے بارے میں سوال کر رہی تھی۔ گفتگو کے دوران وہ گاہے گاہے بڑی بے تکلفی اور بے حد سادگی سے محمد نذیر کے کالے کلوٹے ہاتھ کو اپنے ملائم ہاتھ میں تھام لیتی تھی یا اس کے سوکھے سڑے بازو پر اپنی ہری بھری انگلیاں رکھ دیتی تھی۔ کنول کی ان حرکات میں انتہا درجے کی بے ساختگی تھی لیکن جس سے یہ حرکات ہو رہی تھیں اس کے چہرے پر عجیب سے رنگ لہرا جاتے تھے۔

''لگتا ہے کہ یہاں کے لوگ دن بدن ماڈرن ہوتے جا رہے ہیں۔'' کنول نے خیال ظاہر کیا۔

''کچھ نہ پوچھیں جی...... بالکل یورپ بنتا جا رہا ہے ہمارا کولمبو۔'' محمد نذیر نے شکستہ انگریزی میں جواب دیا۔

اس نے اپنی ٹیڑھی میڑھی سانولی سلونی انگلی کے ساتھ دور ایک بلند و بالا عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ جو گہرے شیشوں والی بلڈنگ ہے نا جی...... وہ گلاداری ہوٹل ہے۔ اس کے دائیں طرف ہوٹل تاج برموڈا نظر آ رہا ہے اور اس کے پیچھے جو ہوٹل ہے اسے تو ہم کہتے ہی عشرت کدہ ہیں۔ ان ہوٹلوں میں سب چلتا ہے جی۔ خدا ان چکروں سے ہر شریف بندے کو بچائے۔''

''ایک شریف بندے کو تو ضرور ضرور بچائے۔'' کنول ترچھی نظر سے یاسر کی طرف دیکھتے ہوئے دعائیہ لہجے میں بولی اور پھر خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

کھلکھلا کر ہنسنے کے لئے جب اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف پھینکا اور چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کی نگاہ ایک جگہ اٹک کر رہ گئی۔ یاسر نے بھی دیکھا، یہ ایک خوش رنگ پتنگ تھی۔ پاکستانی پتنگوں سے بالکل جدا شکل اور سائز کی۔ یہ چار پانچ سکوائر فٹ میں ہو گی۔ اس کے تین چار پورشن تھے۔ پانچ چھ دُمیں تھیں اور سات آٹھ رنگ تھے۔ یہ اپنی لہراتی دُموں کے ساتھ بڑی متانت سے ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔ پاکستانی پتنگوں جیسی تیزی طراری اور کھلنڈرا پن اس پتنگ میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

یاسر نے غور کیا تو ایسی ہی دو چار سنجیدہ مزاج پتنگیں اسے اور بھی نظر آئیں۔ یاسر کو لگا جیسے یہ پتنگیں یہاں کے لوگوں کے عمومی مزاج کی عکاسی کرتی ہیں۔ ٹھہری ٹھہری، امن پسند، دھیمی طبع والی...... یہ اندرونِ لاہور سے اُڑنے والی جھگڑالو، پُرشور اور خطرناک پتنگوں سے بالکل مختلف تھیں۔

کنول کو اپنے سر کے عین اوپر اُڑنے والی اس خوش رنگ پتنگ پر پیار آیا تو وہ اُٹھ کر پتنگ باز کی طرف چلی گئی۔ یاسر وہیں بیٹھا اخبار دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا کنول پتنگ باز کے پاس پہنچتے ہی اس کا انٹرویو شروع کر دے گی۔ سری لنکا میں پتنگ بازی کی تاریخ اور شروعات پر سیر حاصل بحث کرے گی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ پتنگ باز سے پتنگ اُڑانے کے اسرار و رموز سیکھنا شروع کر دے۔ مختصر وقت میں ہی اس لڑکی کی متلون مزاجی کے متعلق کافی کچھ جان گیا تھا۔

وہ اخبار پر سر جھکائے بیٹھا رہا اور کبھی کبھی کن اکھیوں سے پریمی جوڑوں کی "شائستہ" مصروفیات دیکھتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے ریسلنگ کے بعض مقابلوں میں کشتی کے اصول و قواعد وضع کر لئے جاتے ہیں کہ فلاں داؤ نہیں مارنا، اسی طرح امبریلا لو والے پریمی جوڑوں کے لئے بھی کچھ قواعد طے تھے۔ ایک دوسرے سے بہت قریب ہونے کے باوجود وہ کپڑوں سے باہر نہیں ہوتے تھے اور ایک حد کے اندر ہی رہتے تھے۔

کچھ دیر بعد یاسر نے کنول کی طرف دیکھا تو اس کی توقع کے عین مطابق وہ جواں سال سنہالی پتنگ باز سے پتنگ اُڑانا سیکھ رہی تھی۔ اس کے مضبوطی سے بندھے ہوئے بال کھل چکے تھے اور تیز ہوا میں لباس بھی بے ترتیب ہو رہا تھا۔ وہ پتنگ لے

کر ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی اور پتنگ کے ساتھ اس کا سارا وجود بھی ڈول رہا تھا۔ یاسر نے ایک بار پھر خود کو اخبار کی طرف متوجہ کر لیا۔

اچانک دور سے کنول کی چیختی ہوئی آواز یاسر کے کانوں میں پڑی۔

"یاسر...... ہیلو یاسر...... ادھر آؤ پلیز۔"

اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا اور وہ غالباً پتنگ باز کے ساتھ تصویر کھنچوانا چاہ رہی تھی۔ چار و ناچار یاسر موقع پر پہنچا۔ وہ اپنی مخصوص سادہ بے تکلفی کے ساتھ پتنگ باز کے پہلو سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ بے چارہ سمٹ رہا تھا۔ یاسر نے دونوں کی دو تصویریں کھینچیں پھر وہ لپک کر یاسر کے پہلو میں آن کھڑی ہوئی۔ بڑے عام سے انداز میں وہ یاسر کے بازو کے ساتھ لگ گئی...... یاسر کے نتھنوں میں ایک بار پھر وہی نرم خوشبو گھسی جس کا تجربہ آج صبح اسے ہوٹل کی کھڑکی کے سامنے ہوا تھا۔ اسے اپنے سینے میں دھڑکنوں کی بے ترتیبی محسوس ہوئی۔ اس مرتبہ پتنگ باز نے ان دونوں کی تصویر کھینچی اور مسکراتے ہوئے کیمرا کنول کے حوالے کر دیا۔

اب تین بجنے والے تھے۔ دونوں کو زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دو ہٹ شاپس پر منرل واٹر موجود تھا...... لیکن یہ عام واٹر تھا...... ایسی چیزوں کی خریداری کے سلسلے میں کنول میڈ ان انگلینڈ، یو ایس اے اور جاپان وغیرہ سے کم کی بات ہی نہیں کرتی تھی۔ اپنے ٹور کے لئے بجٹ اس کے پاس بھی محدود تھا مگر اشیائے خورد و نوش کے سلسلے میں اس نے ابھی تک کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔

"کیا خیال ہے...... اب کھانا نہ کھا لیا جائے؟" کنول نے پوچھا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" یاسر نے جواب دیا۔

وہ سڑک پر پہنچے تو ایک رکشا ٹھک سے آن حاضر ہوا۔

"کہاں جائیے گا؟" ٹوٹی ہوئی انگریزی میں پوچھا گیا۔

"یہاں کوئی جگہ "کرس کیٹ" بھی ہے۔ سنا ہے کہ وہاں اچھا کھانا مل جاتا ہے۔" کنول نے پوچھا۔

رکشا والے نے فوراً سر ہلا کر تائید کی کہ کنول کی معلومات کچھ ایسی غلط نہیں ہیں۔

کرایہ طے کر کے وہ رکشے میں بیٹھ گئے۔ یاسر کے لئے شکر کا مقام تھا کہ پتنگ اُڑانے کے بعد کنول نے اپنے آوارہ بال پھر سے باندھ لئے تھے۔ ورنہ رکشا چلتے ہی وہ محورقص ہو جاتے اور کل کی طرح اس کے چہرے سے اٹکھیلیاں کرنے لگتے۔

ساحل سے ''کرس کیٹ'' کی طرف جاتے ہوئے وہ کولمبو کے جدید ترین علاقے سے گزرے۔ انہوں نے پرل کانٹی نینٹل کی پُرشکوہ عمارت دیکھی۔ بلند و بالا بینک آف سیلون دیکھا۔ وہ ٹون ٹاورز دیکھے جو نائن الیون کے تباہ ہو جانے والے ٹریڈ سینٹر کی طرز پر بنائے گئے تھے۔ اب نقل تو موجود ہے لیکن اصل موجود نہیں۔

''کرس کیٹ'' نامی جگہ کے بارے میں کنول نے جو کچھ سن رکھا تھا وہ واقعی درست تھا۔ یہ ایک بے حد صاف ستھرا شاپنگ ہال تھا۔ اس کی دو منزلیں تھیں۔ بیسمنٹ میں بھی وسیع و عریض مارکیٹ موجود تھی۔ یہاں ایک ''فوڈ سٹی'' بھی تھا۔ کاؤنٹرز پر مختلف ممالک کے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ ہر نیون سائن کے نیچے اس ملک کا کھانا موجود تھا۔ ملائشین فوڈ، چائنیز فوڈ، سری لنکن، انڈین، کورین اور پتہ نہیں کون کون سا فوڈ...... یاسر پاکستانی فوڈ کی تلاش میں نظر دوڑاتا رہا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ انہوں نے چائنیز کھانا۔ ایک ایک پلیٹ ایگ فرائڈ رائس اور ساتھ میں ''چلی چکن'' ...... کھانا اچھا تھا اور قیمت بھی مناسب تھی۔ کولڈ ڈرنک ملا کر فی کس تقریباً 160 سری لنکن روپے خرچ ہوئے یعنی تقریباً 94 روپے پاکستانی۔

کھانے کے دوران میں کنول ایک دو بار کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی، وہی کیفیت جب یاسر کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہے، اسے یکسر نظرانداز کر چکی ہے۔

◻•◻

اگلے روز اتوار تھا۔ اب تک جو بھی خرچ ہوا تھا اس میں یاسر نے بیلنس رکھنے کی کوشش کی تھی۔ یعنی اگر ایک دفعہ کنول نے رکشا کا کرایہ دے دیا تو دوسری دفعہ یاسر نے دیا۔ کھانے کے بل میں بھی وہ یہ احتیاط ملحوظ خاطر رکھے ہوئے تھا۔ کل کنول نے پُرتکلف ناشتہ کرایا تھا، یاسر نے سوچا کہ آج کا ناشتہ وہ کرا دے۔ وہ صبح ذرا جلدی اٹھ گیا۔ ہوٹل سے نکل کر وہ قریبی ڈیپارٹمنٹل سٹور میں پہنچا اور ناشتے کے لئے کچھ اشیاء خریدیں۔

اس کی واپسی تک ساڑھے نو بج چکے تھے۔ لیکن کنول کے کمرے کا دروازہ ابھی تک بند تھا۔ ناشتہ اپنے کمرے میں رکھنے کے بعد اس نے کنول کے دروازے پر ''ناک'' کی۔ اس نے ہینڈل گھما کر دیکھا اور اس پر انکشاف ہوا کہ وہ کمرے میں نہیں ہے۔ وہ یقیناً صبح سویرے کہیں نکل گئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے یاسر کے ذہن میں آیا کہ کہیں وہ کمرا چھوڑ ہی تو نہیں گئی؟ وہ نیچے استقبالیہ پر پہنچا تو کنول کے کمرے کی چابی وہاں موجود تھی۔ استقبالیہ پر موجود سنجیدہ صورت سری لنکن خاتون نے بتایا کہ مس کنول کہیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔

گیارہ بجے تک کنول کا انتظار کرنے کے بعد یاسر نے اکیلے ہی ناشتہ کیا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ وہ کہاں چلی گئی تھی؟ اسے بتا کر تو جانا چاہئے تھا۔ اگر پہلے سے کوئی پروگرام تھا تو رات کو ہی آگاہ کر سکتی تھی۔ پھر اپنی پریشانی اسے خود ہی بے معنی محسوس ہونے لگی۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ ان کی جان پہچان کو ابھی اڑتالیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے، ایک معمولی سا وقتی تعلق ہے۔ کل وہ نجانے کہاں ہوگی اور وہ خود کہاں ہوگا۔ اس واجبی سے تعلق کو بنیاد بنا کر پریشان ہونے کی اسے کوئی ضرورت نہیں۔

دھیان بٹانے کے لئے اس نے بید کی کرسی کھڑکی کے بالکل پاس ڈال لی اور نیچے سڑک کا نظارہ کرنے لگا

کھڑکی کے سامنے چکن تکہ والا مصروف کار تھا۔ دکاندار کا ملازم نوجوان لڑکا بڑا تیز طرار دکھائی دیتا تھا۔ یاسر کی نگاہ کئی بار اس سے ٹکرائی اور ہر بار اسے لڑکے کی نگاہوں میں ایک شریر چمک نظر آئی۔ پتہ نہیں اس کی آنکھیں ہی ایسی تھیں۔

گرجا گھر میں سروس ہو رہی تھی۔ آج اتوار کا دن تھا۔ گرجا گھر کے اردگرد کاروں اور دیگر گاڑیوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ وسیع و عریض ہال اور طویل برآمدے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ یاسر کافی دیر تک ان مناظر میں کھویا رہا۔

اچانک اس نے کنول کو دیکھا۔ وہ اپنے شولڈر بیگ کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلی آ رہی تھی۔ خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن کچھ تھکی تھکی اور نڈھال تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ فرسٹ فلور پر آ گئی اور سیدھی یاسر کے کمرے میں آ دھمکی۔

''گڈ مارننگ۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں گڈ نون کہنا چاہئے۔'' یاسر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... ویری سوری یاسر...... میں تمہیں بتائے بغیر چلی گئی۔ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو''

''میری صورت ہی ایسی ہے۔''

''صورت تو بڑی سندر ہے۔ بڑی سویٹ۔ بس ذرا دبلے ہو۔ کھانے پینے کی طرف دھیان دو۔'' وہ بڑی روانی سے بولی۔

''لیکن یہ صبح صبح کیا دورہ پڑ گیا تھا تمہیں؟''

''کچھ بھی نہیں۔ ہمارے پرچے کے ایک نامہ نگار کا بھائی یہاں اسٹیشن کے قریب رہتا ہے۔ وہ صبح دس بجے تک کام پر نکل جاتا ہے، رات گئے لوٹتا ہے۔ میں نے سوچا اس سے مل آؤں۔''

''ہو گئی ملاقات؟''

''ہاں......'' کنول نے مختصر جواب دیا۔

یاسر کو محسوس ہوا کہ شاید وہ کچھ چھپا رہی ہے۔ بہرحال یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔

کل ''کرس کیٹ'' میں بیٹھے ہوئے بھی یاسر کو لگا تھا کہ وہ ایک دم کہیں کھو گئی ہے۔ یہی کیفیت ایک دو بار ساحل پر بھی نظر آئی تھی۔ وہ اردگرد سے بیگانہ ہو کر جیسے کسی کو تلاش کرنے لگتی تھی...... کہیں اس کیفیت کا تعلق اس کی انگلی میں چمکتے ہوئے گولڈن رنگ سے تو نہیں؟ کوئی المیہ؟ کوئی جدائی کا واقعہ؟

یہ سوال یاسر کے ذہن میں ابھرا۔ ایک بار پھر اس کا دل چاہا کہ کنول سے اس رنگ کے بارے میں کچھ پوچھے۔ لیکن ایسی باتیں اکثر و بیشتر اس کے حلق میں اٹک جاتی تھیں۔ کنول کے پاس ایک شاپر پڑا تھا۔ اس نے شاپر کھولا...... خوبصورت سیب اور بڑے سائز کے کیلے نظر آ رہے تھے۔ دو پکے ہوئے ناریل بھی تھے۔ اس کی چوائس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہترین چیز خریدنے کی عادی ہے۔ ان دونوں نے ناریل کا پانی پیا۔ اس دوران میں کنول کی تھکاوٹ سر سے غائب ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے بول رہی تھی اور آج کے ''سیر سپاٹے'' کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کل کی طرح آج بھی ساحل پر جایا جائے...... لیکن آج ساحل دوسرا ہو۔ وہ جس ساحل کا نام لے رہی تھی وہ ''Mount Levinia'' تھا۔ یاسر نے بھی ماؤنٹ لیوینیا کے بارے میں سن رکھا تھا۔ یہ بھی ایک اچھا ساحل تھا اور یہاں زیادہ تر غیر ملکی نظر آتے تھے۔

پروگرام طے کرنے کے بعد کنول نہانے اور چینج کرنے کے لئے شڑاپ سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ یاسر وہیں کرسی پر بیٹھا رہا اور کنول کے ہر دم بدلتے مزاج کے بارے میں سوچتا رہا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود اس لڑکی کے بارے میں بار بار کیوں سوچنے لگتا ہے۔ وہ ''لڑکی'' تھی۔ لیکن وہ اس سے پہلے بھی لڑکیوں سے مل چکا تھا۔ وہ خوبصورت تھی۔ لیکن وہ اس سے خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا (اور ان میں سے ایک دو شاید ایسی بھی ہوں جو اس سے روابط بڑھانا چاہتی ہوں)...... وہ اسے سفر میں ملی تھی اور ہمسفر بن گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے بھی دفتری ٹورز کے دوران میں خواتین اس کی ہمسفر رہ چکی تھیں۔ پھر اس لڑکی میں کیا تھا جو اسے بتدریج اپنی طرف کشش کر رہا تھا۔ وہ کیوں اسے سوچنے لگتا تھا۔ یہ بڑی سطحی اور عامیانہ سی کیفیت تھی اور یاسر کو خود بھی اس پر افسوس ہو رہا تھا...... یہ سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی

بات تھی۔ یعنی سری لنکا میں قدم رنجہ فرماتے ہی وہ ایک جذباتی اُلجھن کا شکار ہونے لگا تھا...... اور اس اُلجھن کا سبب بننے والی کوئی مقامی حسینہ نہیں تھی۔ اس ہی کی طرح ایک پردیسی تھی، جو اس کے ساتھ ہی ایئرپورٹ پر اتری تھی۔ دو ہی دن میں اپنی بے پناہ بے تکلفی کے ساتھ وہ اس کی ''مت مارنے'' میں مصروف ہو گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بن ٹھن کر اس کے سامنے تھی۔ وہ ایک بار پھر جینز اور ہلکی پھلکی پھولدار شرٹ میں نظر آ رہی تھی۔ ایک کندھے پر کیمرا تھا، دوسرے پر شولڈر بیگ تھا جس میں اس نے منرل واٹر کی دو ٹھنڈی بوتلیں ٹھونس رکھی تھیں۔

''چلیں......؟'' یاسر نے اس کے سراپے سے نظر چراتے ہوئے پوچھا۔

''ہماری طرف سے ''آ گیا'' ہے۔'' وہ ملکہ کے اسٹائل میں بولی اور پھر خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

یاسر نے فروٹ والا شاپر اٹھایا اور وہ دونوں دروازے لاک کرتے ہوئے نیچے لابی میں آ گئے۔ یہاں ایک شادی کا فنکشن تھا۔ مقامی انداز میں رسمیں ادا کی جا رہی تھیں۔ دلہن کی حرکات و سکنات کو وڈیو فلم پر محفوظ کیا جا رہا تھا۔ کنول ایک معصوم دلچسپی کے ساتھ یہ مناظر دیکھتی رہی۔ وقت کم تھا ورنہ وہ شاید یہاں بھی کوئی انٹرویو شروع کر دیتی۔ ہوٹل سے باہر موسم قدرے گرم تھا۔

''کیوں نہ آج بس پر سفر کریں۔'' کنول نے تجویز پیش کی۔

''بس اگر وہاں جاتی ہے تو بیٹھ جاتے ہیں۔'' یاسر نے کہا۔

دو ہی منٹ میں کنول نے بس کا نمبر اور اسٹاپ وغیرہ معلوم کر لیا۔ قریباً پانچ منٹ بعد وہ ماؤنٹ لیوینیا جانے والی بس میں تھے۔ بس زیادہ اچھی نہیں تھی اور بالکل ''بس'' بھی نہیں تھی۔ یعنی درمیانی حالت کی تھی۔ یاسر کو یہی لگا کہ وہ لاہور یا کراچی کی کسی بس میں سوار ہے اور کنڈیکٹر کی مسلسل آوازیں سن رہا ہے۔ کنڈیکٹر نے مختلف مالیت کے نوٹ اپنی انگلیوں میں پھنسا رکھے تھے اور اسی ہاتھ میں ریزگاری وغیرہ سنبھال رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے وہ ٹکٹیں کاٹنے اور دینے کا کام لیتا تھا۔ کولمبو اور لاہور کی بس میں یاسر نے جو ایک خاص فرق نوٹ کیا وہ یہ تھا کہ یہاں خواتین و حضرات اکٹھے ہی سفر کر رہے تھے۔ بس کے اگلے حصے میں رش زیادہ تھا اور یہاں تو دونوں اصناف

شیر و شکر تھیں۔ کس کا بازو کس کے گلے میں ہے اور کس کا سر کس کی چھاتی سے ٹکا ہوا ہے، کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ سب اپنے حال میں مست تھے۔ خواتین کے احترام میں نشست چھوڑنے کا رواج بھی یاسر کو یہاں نظر نہیں آیا۔ اس نے کچھ عمر رسیدہ خواتین کو بھی مساوات کے ثمرات سمیٹتے ہوئے دیکھا۔ یعنی بس میں مسلسل کھڑے ہو کر ہچکولے کھاتے دیکھا۔

دو تین اسٹاپس کے بعد ایک ڈبل نشست خالی ہوئی اور کنول لپک کر کھڑکی کی طرف بیٹھ گئی۔ اس نے یاسر کو بھی اپنے ساتھ بٹھانا چاہا لیکن وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہوا۔ اس کی ایک لمحے کی ہچکچاہٹ ایک دوسرے شخص کو موقع فراہم کر گئی۔ یہ ہٹا کٹا تامل بے تکلفی سے کنول کے ساتھ بھڑ کر بیٹھ گیا۔ یاسر نے اسے ٹوکنا چاہا لیکن کنول نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ (اگلے ایک دو روز میں یاسر کو اندازہ ہو گیا کہ کنول نے ٹھیک ہی کیا تھا) ...... یہاں بسوں میں خواتین و حضرات کا باہم مل کر بیٹھ جانا روٹین کی بات تھی۔

اپنی ہچکچاہٹ کی پاداش میں اگلا پون گھنٹا یاسر کو کھڑا رہنا پڑا۔ خدا خدا کر کے وہ بے ڈول تامل کنول کے پہلو سے اٹھا اور یاسر نے اس کی جگہ سنبھالی۔

ایک جانی پہچانی مخصوص خوشبو پھر یاسر کے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو کوسا...... بوڑھے بھی ہو گئے تو پاکستانی کے پاکستانی ہی رہو گے۔ عورت کے ساتھ بیٹھ گئے تو بس یہی سوچتے رہے گھٹنے سے گھٹنا ٹکرا گیا ہے، کندھے سے کندھا مل گیا ہے...... یہ کیا ہو گیا؟ انگلی سے انگلی چھو گئی ہے۔ لوگ بڑے بڑے مسائل پر سوچ رہے ہیں، بڑے بڑے انقلاب لا رہے ہیں۔ تم بس شربت دیدار، نگاہِ ناز اور چلمن و بام کے بارے میں ہی سوچتے رہنا۔

لیکن پھر فوراً ہی دل سے آواز آئی۔ جو لطافت ''دوری اور حجاب'' میں ہے وہ ''قربت اور بے باکی'' میں نہیں ...... وہ لطافت اس بس میں نہیں ...... وہ شاید پورے کولمبو میں نہیں ......

کھڑکیوں سے باہر ''کولمبو'' ایک فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے چل رہا تھا ......شور مچا رہا تھا ...... دھواں چھوڑ رہا تھا ...... کہیں کہیں یہ بے ترتیب اور کم صورت

تھا، کہیں چمک رہا تھا اور حسین نظر آتا تھا۔ بلند و بالا عمارتیں پورے کولمبو میں موجود تھیں۔ جگہ جگہ نئی تعمیرات بھی دکھائی دیتی تھیں۔ ماؤنٹ لیوینیا تک کا سفر خاصا طویل ثابت ہوا۔ وہ کولمبو کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قریباً دو گھنٹے میں پہنچے۔ لیکن کرایہ خاصا کم تھا یعنی صرف ساڑھے سات سری لنکن روپے۔

ساحل کے قریب وہ بس سے اترے اور پیدل سفر شروع کیا۔ وہ ایک رہائشی علاقے کے اندر سے گزرے۔ یہ بڑا سرسبز اور پُرسکون علاقہ تھا۔ زیادہ تر کوٹھیاں قدیم طرز کی تھیں۔ ان کے احاطوں میں اور احاطوں سے باہر پُرشکوہ درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ سڑک پر چلتے ہوئے کوٹھیوں کے کمپاؤنڈ اور ڈرائیو وے نظر آتے تھے۔ ایک کوٹھی کے پائیں باغ میں یاسر نے ایک ادھیڑ عمر دبلی پتلی عورت کو دیکھا۔ وہ ایک عجیب وضع کے پودے کی تراش خراش میں مصروف تھی۔

یاسر کو یوں لگا جیسے وہ ساٹھ کے عشرے کی کوئی بلیک اینڈ وائٹ پاکستانی فلم دیکھ رہا ہے...... کندھے پر شال کیے جو عورت پودے پر جھکی ہوئی ہے وہ صبیحہ خانم یا شمیم آراء کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اندر کسی قدیم طرز کے سٹنگ روم میں کوئی سنتوش کمار یا محمد علی پرانے گراموفون پر سہگل کے گیت سن رہا ہوگا اور پائپ کے کش لے رہا ہوگا۔

اس پُرسکون بستی کے چپ چاپ مکینوں کے درمیان سے گزر کر وہ دونوں ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا اور خشک ہوا ان سے بغلگیر ہوئی۔ ساحل پر کافی تعداد میں سفید فام نظر آ رہے تھے۔ فار ایسٹ کے لوگ بھی تھے، ایک جاپانی فیملی ساحل کی چمکیلی ریت پر فٹ بال کھیلنے میں مصروف تھی۔

وہ اِدھر اُدھر گھومنے لگے اور انجوائے کرنے لگے۔ اچانک کنول اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

”یاسر! تم جھوٹے بہت ہو۔“

”جھوٹا ہوں...... کیا مطلب؟“

”تم اپنے اندر کو چھپاتے ہو...... خود سے جھوٹ بولتے ہو۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا؟“

”دیکھو سامنے جو وہ گوری لڑکی پانی سے نکل کر ریت پر بیٹھی ہے...... تم نے ابھی

ابھی اس سے جھوٹ بولا ہے...... تم نے اسے چور نظروں سے دیکھا ہے اور بڑے غور سے دیکھا ہے لیکن ظاہر یہی کیا ہے کہ نہیں دیکھا۔“

”میرا خیال ہے کہ تم خوانخواہ نفسیات دان بننے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”میں کوشش نہیں کر رہی، میں نفسیات دان ہوں۔ کم از کم تمہاری نفسیات کو تو بہت اچھی طرح سمجھنے لگی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”کیا سمجھا ہے تم نے؟“

”یہی کہ تم ایک اچھے شخص ہو...... اس کے باوجود تمہارے جیون کے اکثر معاملات جھوٹ کی زد میں رہتے ہیں۔ تم غیر شعوری طور پر اکثر جھوٹ بولتے رہتے ہو۔“

”تم مبہم باتیں کر رہی ہو۔“

”میں بالکل واضح بات کر رہی ہوں۔“ اس نے یقین سے کہا...... پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”اچھا...... ٹھہرو...... تم میری طرف دیکھو۔“

یاسر نے اس کی طرف دیکھا۔ تیز ہوا نے ہلکی پھلکی شرٹ کو کنول کے جسم کا حصہ بنا دیا تھا۔ وہ ایک دم قیامت خیز نظر آ رہی تھی۔ یاسر نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔

وہ کھلکھلا کر بولی۔ ”یہ دیکھو...... یہ دیکھو...... تم نے اب مجھ سے بھی جھوٹ بولا ہے...... حالانکہ میں تمہاری اچھی دوست ہوں۔ ہم یہاں ایک ساتھ گھوم پھر رہے ہیں۔“

وہ سٹپٹا کر بولا۔ ”پتہ نہیں کیا بولتی جا رہی ہو تم؟“

اس نے یاسر کا بازو پکڑا اور کھینچ کر اپنے عین سامنے ریت پر بٹھا لیا۔

”میں نے کہا ہے نا کہ تم غیر شعوری طور پر جھوٹ بولتے ہو۔ اگر ہمیں کوئی اچھا لگتا ہے تو ہمیں اس کی تعریف کرنی چاہئے...... اپنی رائے کا برملا اظہار کرنا چاہئے۔ اگر تم کسی دن اسمارٹ لگو گے تو میں فوراً کہوں گی، یاسر یُو آر لکنگ ہینڈسم۔“

یاسر نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”یعنی ابھی تک تم مجھے برداشت کرتی آ رہی ہو۔ کوئی بہتر ساتھی نہ ہونے کے سبب ایک اوٹ پٹانگ، بے ڈھنگے شخص کے ساتھ گھومنے پر مجبور ہو۔“

”ہاں...... یہ تو ہے۔“ وہ انداز سے بولی۔

"اچھا...... خدا حافظ" یاسر نے منرل واٹر کی بوتل اٹھاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر جنوب کی سمت چل دیا۔

"ارے...... یہ کیا کر رہے ہو یاسر...... پردیس میں دغا دے رہے ہو۔ اٹ از ناٹ فیئر۔" وہ اس کے پیچھے آئی۔

دو چار قدم چل کر اسے ٹھہرنا پڑا۔ ایک انگریز فیملی نے اسے روک لیا تھا۔ کچھ دیر بعد یاسر نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ان کا گروپ فوٹو کھینچ رہی تھی۔

یاسر کو کچھ فاصلے پر ایک کشتی نظر آئی۔ وہ خشکی پر تھی اور اس پر ایک نوجوان اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے لباس اور داڑھی وغیرہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ یاسر اس کے پاس چلا گیا اور باتیں کرنے لگا۔ نوجوان کا نام سلمان فارسی تھا۔ وہ جافنا کا رہنے والا تھا اور یہاں سیر کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس کا تعلق تبلیغی جماعت سے بھی تھا۔ رائے ونڈ وغیرہ کے حوالے سے اسے کافی معلومات حاصل تھیں۔ رائے ونڈ جانے اور وہاں کے مدرسے میں داخلہ حاصل کرنے کے لئے اس نے باقاعدہ اُردو بھی سیکھی ہوئی تھی۔

یاسر، سلمان فارسی کے ساتھ باتوں میں اتنا مشغول ہوا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا کنول کب اس کے عقب میں آن کھڑی ہوئی ہے۔ وہ ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے ان دونوں کی باتیں سنتی رہی۔ یاسر جان بوجھ کر گفتگو کو طول دے رہا تھا۔ سلمان فارسی نے جب یاسر کو اپنی فیملی سے ملانا چاہا تو یاسر نے فوراً ہامی بھر لی۔ وہ جان بوجھ کر کنول کو نظر انداز کر رہا تھا۔ سلمان کا بڑا بھائی، بیوی اور بچے سمندر میں نہا رہے تھے۔ یاسر ان کے پاس چلا گیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ یہ سب لوگ پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے اور وہاں آنا چاہتے تھے

یاسر نے کن اکھیوں سے کنول کی طرف دیکھا۔ وہ کشتی کے پاس موجود نہیں تھی۔ اب اس نے بھی ایک مصروفیت ڈھونڈ لی تھی۔ اس نے ایک یورپین فیملی کا نہایت خوبصورت، گول مٹول بچہ گود میں اٹھا لیا تھا...... کبھی اسے بازوؤں میں جھلا رہی تھی، کبھی ریت پر بٹھا کر اس کی تصویریں کھینچ رہی تھی۔ ماں باپ خوش ہو رہے تھے کہ ان کے بچے کو ایک اجنبی کی طرف سے اتنی پذیرائی مل رہی ہے۔ بچے کو چومتی چاٹتی اور

اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی کنول خود بھی دلکش لگ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے یاسر کی نگاہ اس میں جذب ہو کر رہ گئی۔ کسی دانشور کا قول اس کے ذہن میں گونجنے لگا ...... کسی عورت کی مکمل دلکشی دیکھنا ہو تو اسے ایک نوخیز بچے کے ساتھ دیکھو......

پتہ نہیں کیوں اس دلکش منظر نے یاسر کے دل و دماغ میں عجیب سی اداسی بھر دی۔ اس کی اندرونی کیفیتوں کے سارے موسم پچھلے چند روز سے بدلے ہوئے تھے۔

سلمان فارسی کو الوداع کہہ کر وہ گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلتا چلا گیا۔ کسی وقت اس کا دل چاہنے لگتا تھا کہ اس ماحول سے اور کنول سے ایک دم دور چلا جائے۔ وہ حقیقت پسند شخص تھا اور جذباتی حوالے سے کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ کل اور شاید پرسوں کا بھی سارا دن اُسے ٹی کمپنی کے آفس میں گزارنا تھا۔ بدھ کے روز ہی یہاں سے جانے کا سوچا جا سکتا تھا۔

سمندر اور سورج اُس کے بائیں جانب تھے...... لیکن کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ صرف سمندر رہ گیا ہے...... آسمان کو کھلے اور گہرے بادل ڈھانپ رہے تھے۔ اس نے ایک جگہ رومال بچھایا اور سمندر کے عین سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا...... وہ اور سمندر تنہا تھے...... اور سمندر سے ملاقات کا مزا تنہائی میں ہی آتا ہے۔ گھر سے آئے ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے لیکن گھر یاد آ رہا تھا۔ گھر جو اس سمندر کے پار تھا۔ جہاں اس کے والدین تھے، پیاری سی بہن تھی، بھائی اور بھابھی تھے۔

"یاسر......" ایک پکارتی ہوئی آواز بہت دور سے اس کے کانوں میں پڑی۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک ساحلی ریستوران کے سامنے کھڑی تھی اور اسے بلا رہی تھی۔

یاسر زیر لب مسکرایا اور رخ پھیر کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اسے ستانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے چند بار مزید یاسر کو آواز دی۔ پھر یاسر نے محسوس کیا کہ وہ اس کی طرف آ رہی ہے۔

قریب آ کر وہ بولی۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم ایک دم جھوٹے ہو۔ تمہاری ہر بات میں تھوڑا یا زیادہ جھوٹ موجود رہتا ہے۔ اب تم نے میری آواز سنتے ہوئے بھی نہیں سنی۔"

"خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ایک جھوٹے شخص کے ساتھ رہو گی تو تم میں بھی جھوٹ کے جراثیم پیدا ہونے لگیں گے۔" یاسر نے اطمینان سے کہا۔

"اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ...... مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ سیانوں نے کہا ہے کہ پہلے پیٹ پوجا، پھر کام دوجا۔"

"سیانوں نے اور بھی بہت کچھ کہا ہے...... سیانوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جو لوگ جلدی سے بے تکلف ہو جاتے ہیں ان سے بچ کر رہنا چاہئے۔"

وہ چند لمحے یاسر کو گھورتی رہی، پھر آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر بولی۔

"سیانوں کی ایک بہت اہم بات تو تم بھول رہے ہو۔ سیانوں نے کہا ہے کہ جو بادل گرجتے نہیں وہ برسنے لگتے ہیں...... اور یہ بادل بالکل خاموش ہیں۔ اٹھ جاؤ ورنہ سائبان تک پہنچتے پہنچتے بھیگ جائیں گے۔" اس نے یاسر کو بازو سے پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی۔

یاسر نے سرد مہری سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ "پلیز کنول! میں کچھ دیر بیٹھنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی...... پھر ایک دم شوخ ہوتے ہوئے یاسر سے الجھنے لگی۔ وہ اسے زبردستی اٹھا رہی تھی، اسے گدگدانے کی کوشش میں وہ اس کے اوپر ڈھے سی گئی تھی۔ ایک جانی پہچانی مہک یاسر کے نتھنوں میں گھسنے لگی...... یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی خوبصورتی سے تو بے خبر ہے ہی، اپنی نسوانیت سے بھی بے خبر ہوتی جاتی ہے۔ اس کے گداز لمس سے گھبرا کر یاسر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

رومال کو جھاڑ کر جیب میں رکھتا ہوا وہ اس کے ساتھ چل دیا۔ ریسٹوران قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ ابھی انہوں نے پندرہ بیس گز ہی طے کئے تھے کہ ایک دم زور کا تریڑا پڑنے لگا۔ سری لنکا کی مشہور و معروف بارش کے ساتھ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ دونوں ریسٹوران کی طرف دوڑے لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے بری طرح بھیگ گئے۔

موسم ایک دم ہی دلفریب ہو گیا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک مخروطی چھتوں والے ریسٹوران اور ہوٹل نظر آتے تھے۔ ان میں سے دو چار اعلیٰ درجے کے بھی

تھے۔ کنول اور یاسر ایک درمیانی درجے کے ریسٹوران میں کھڑے تھے۔ یہاں لکڑی کی صاف ستھری میز کرسیاں تھیں۔ فرش ساحل کی ریت کا تھا۔ سرخ وردیوں والے ویٹر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ریسٹوران کے گاہکوں میں دو چار غیر ملکی بھی تھے۔ بارش کی مناسبت سے ان کی میزوں پر بیئر کی بوتلیں نظر آ رہی تھیں۔

لاہور سے روانہ ہوتے وقت یاسر کے ایک دفتری ساتھی نعیم نے اسے سری لنکا کے بارے میں لمبی چوڑی "بریفنگ" دی تھی۔ نعیم اس ٹیم میں شامل تھا جو چند ماہ پہلے کولمبو آئی تھی اور ٹی کمپنی کے لئے سسٹم تیار کیا تھا۔ نعیم قریباً دو ماہ سری لنکا میں رہا تھا اور خود کو سری لنکا کے حالات کے حوالے سے اتھارٹی سمجھتا تھا۔ واقعی اسے سری لنکا کے حوالے سے ڈھیروں معلومات حاصل تھیں۔ اس کی فراہم کردہ معلومات میں سے کم از کم دو تو اب تک بالکل درست ثابت ہوئی تھیں۔ نعیم عرف نم نے کہا تھا کہ سری لنکا میں بس اور ٹرین وغیرہ کے کرائے "مسکینی" کی حد تک سستے ہیں۔ اس کا ثبوت انہیں یہاں ساحل پر آتے ہوئے مل گیا تھا۔ انہوں نے قریباً دو گھنٹے کی مسافت کا کرایہ ساڑھے سات روپے یعنی قریباً چار پاکستانی روپے ادا کیا تھا۔ نم نے جو دوسری بات بتائی وہ یہ تھی کہ کولمبو میں مقامی طور پر تیار کی جانے والی بیئر "Lion" کو قومی مشروب کی حیثیت حاصل ہے...... اور یہ ہر کونے کھدرے میں نظر آ جاتی ہے۔ اس کی یہ دوسری بات بھی صحیح تھی۔

"چلو اب غصہ تھوکو......" کنول نے اپنے پاؤں سے ریت پر باقاعدہ جگہ بنائی تاکہ یاسر تھوک سکے۔

"میں تمہاری بات مان لیتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ آج لنچ اور ڈنر میری طرف سے ہوگا۔" یاسر نے کہا۔

"منظور ہے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ویٹر کو بلوایا۔

یاسر رخ پھیر کر بارش سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اب مصیبت کے مارے ویٹر کا طویل انٹرویو شروع ہوگا، اس سے کھانوں کے بارے میں لمبی چوڑی تفصیل پوچھی جائے گی۔ یہ دریافت کیا جائے گا کہ کون سا کھانا کن کن اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہے اور یہ اجزائے ترکیبی کہاں کہاں سے اور کن لوگوں کے ذریعے

حاصل کئے جاتے ہیں۔

بعینہ وہی ہوا جو یاسر نے سوچا تھا۔ طویل انٹرویو کے بعد کنول نے یاسر کے برائے نام مشورے کے ساتھ فیصلہ کیا کہ وہ چاول اور مچھلی کھائیں گے۔ اس فیصلے کے بعد مچھلیوں کی معائنہ کاری شروع ہوئی۔ ہانپتے ہوئے ویٹر نے کئی تازہ اور نیم تازہ مچھلیاں پلیٹ میں سجا سجا کر کنول کے ملاحظے کے لئے پیش کیں۔ ان تمام ان پکی مچھلیوں کو الٹ پلٹ کر خوب خوب شرمندہ کیا گیا اور پھر ایک خوش نصیب مچھلی فرائی کے لئے چن لی گئی۔

کھانا مزیدار تھا، کچھ موسم نے بھی لطف دوبالا کر دیا۔ بھیگے موسم میں، بھیگے بھیگے کپڑوں کے ساتھ گرما گرم کھانے نے سماں باندھ دیا۔ کہیں قریب ہی ٹیپ ریکارڈر پر ایک سری لنکن گانا گونج رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ یاسر کو کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ پھر یاسر نے کچھ غور کیا تو وجہ اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ گانا ایک پرانی پاکستانی فلم کے گانے کی طرز پر تھا۔ تمہی ہو محبوب میرے ...... میں کیوں نہ تمہیں پیار کروں۔

نئی نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود یاسر کو پرانی پاکستانی فلموں اور گانوں کا کریز تھا۔ کبھی کبھی پرانی انڈین فلم بھی وہ دیکھ لیتا تھا۔ فلمی شاعری کو بعض لوگ قابل توجہ نہیں سمجھتے لیکن یاسر کی رائے مختلف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اچھی فلمی شاعری بھی ”شاعری“ ہی ہوتی ہے اور وہ بھی پڑھنے والے کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

کھانا کھانے کے بعد دونوں نے دیر تک ساحل پر چہل قدمی کی۔ بارش کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا اور ہر شے پہلے سے زیادہ نکھری ہوئی نظر آتی تھی۔ بہت سے سری لنکن جوڑے بھی ساحل پر نظر آنے لگے تھے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو بانہوں میں لئے پھرتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ بوقت ضرورت چھتری کا استعمال بھی کرتے ہوں تاہم یاسر اور کنول نے یہاں چھتری کا مخصوص استعمال نہیں دیکھا۔

سورج ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہموار جگہ بیٹھ گئے اور سمندر کی سرگوشیاں سننے لگے ...... وہ کہہ رہا تھا ...... میں گواہ ہوں گئے زمانوں کا ...... میں نے ان کناروں پر ان گنت کہانیاں پروان چڑھتے دیکھی ہیں ...... بے شمار لوگ میرے سامنے ملے

ہیں اور بچھڑے ہیں ...... لاتعداد مسکراہٹیں اور آنسو میری ریت میں جذب ہیں ...... تم بھی میرے ہزاروں لاکھوں مہمانوں میں سے ایک ہو۔ پل بھر کے لئے میرے روبرو ٹھہرے ہو۔ تم چلے جاؤ گے، اپنی دنیاؤں میں گم ہو جاؤ گے، لیکن میری ریت پر تمہارے قدموں کے نشان رہ جائیں گے۔ میں ہر نشان یاد رکھتا ہوں اور کوئی بھی اہم یا غیر اہم کہانی بھولتا نہیں ہوں ......

وہ ریت پر بیٹھے رہے۔ کنول ایک بار پھر حسب عادت کہیں کھو گئی تھی۔ یاسر کے قریب ہوتے ہوئے بھی کہیں دور چلی گئی تھی۔ یاسر کی نگاہ اس کی انگلی کے سنہری رنگ پر چلی گئی۔ اس نے چاہا کہ وہ کوشش کر کے ایک بار اس رنگ کے متعلق پوچھ لے۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ذہن میں الفاظ جوڑے ...... لیکن ایک مرتبہ پھر یہ الفاظ اس کے ہونٹوں تک نہیں آ سکے۔



اگلا دن سوموار کا تھا۔ دونوں کو اپنے اپنے کام سے جانا تھا۔ رات کوٹی کمپنی کے متعلقہ افسر سے یاسر کی پھر بات ہوئی تھی۔ سری لنکن افسر نے اسے بتایا تھا کہ کمپنی کی گاڑی سویرے آٹھ بجے اسے لینے کے لئے پہنچ جائے گی۔ کنول کو بھی آج اپنی ''اسائن منٹ'' پر کام کرنا تھا۔ اسے ایک فیچر تیار کرنا تھا۔ فیچر کا عنوان تھا ''سری لنکا میں ورکنگ وومن کے حالات اور مسائل'' کنول کو اس حوالے سے چند سوشل ورکرز سے ملنا تھا۔

یاسر پروگرام کے مطابق کمپنی کے دفتر پہنچ گیا۔ سسٹم کا فالٹ ٹریس کرنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ نقص مل جانے کے بعد کام کافی آسان محسوس ہونے لگا۔ شام پانچ بجے تک اس نے اپنا 80 فیصد کام مکمل کر لیا۔ اس دوران میں ایک دو بار اسے لاہور میں اپنے سینئرز سے بھی ٹیلی فونک رابطہ کرنا پڑا۔ سارا کام توقع کے مطابق ہو رہا تھا لیکن ایک کام ایسا بھی تھا جو غیر متوقع تھا...... اور وہ تھا کنول کے خیال کا بار بار ذہن پر حملہ آور ہونا۔ کام کی بے پناہ مصروفیت کے دوران میں تو اسے کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس کے ساتھی کہا کرتے تھے کہ وہ کام کرتا نہیں بلکہ کام میں غرق ہوتا ہے۔ اردگرد درجنوں دوستوں نے ہنگامہ مچا رکھا ہوتا تھا تو بھی اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ لیکن آج اس کی ساری محویت لرزہ بہ اندام تھی۔ ایک دم کمپیوٹر اسکرین پر سے سب کچھ غائب ہو جاتا تھا اور کنول کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے چمکنے لگتا تھا...... وہ شرارت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی تھی اور کہتی تھی۔ ''تم جھوٹے ہو...... تمہارے ہر کام میں جھوٹ موجود ہوتا ہے۔''

وہ شام سات بجے کے بعد اپنا بیشتر کام مکمل کر کے ہوٹل میون واپس پہنچ گیا۔ کنول نو بجے سے پہلے نہیں آئی تھی۔ وہ اپنی اسائن منٹ کا تین چوتھائی کام مکمل کر آئی

تھی۔ کافی تھکی ہوئی تھی۔ دونوں نے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ ''کرس کیٹ'' جانے کی بجائے ہوٹل سے ہی کھانا منگوا کر کھا لیا اور اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

یاسر بھی کچھ تھکا ہوا تھا لہٰذا خلاف معمول اسے جلدی نیند آ گئی۔

صبح وہ نو بجے کے لگ بھگ اٹھا تو کافی فریش تھا۔ اٹھتے ہی یاسر کو جو پہلا خیال آیا وہ کنول کا تھا۔ وہ ٹپٹا کر رہ گیا۔ رات کو بھی وہ کنول کو سوچتے ہوئے ہی سویا تھا...... اور رات بھر بھی شاید اسی کو سوچتا رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے اس کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ اس کا لب و لہجہ، اس کی مسکراہٹ، اس کی بے حد سادہ بے تکلفی...... یہ سب کچھ بڑی سرعت سے اس کے دل میں گھر کرتا چلا جا رہا تھا...... چند ہی روز میں یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ برسوں سے اسے جانتا ہے۔

صبح سویرے اٹھتے ہی یاسر نے ایک بات دل میں ٹھان لی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ آج کنول سے اس کی انگلی میں چمکنے والے رِنگ کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ وہ دنیا جہاں کی باتیں کرتے تھے، اپنے گھریلو حالات کے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے تھے، دوست احباب کے تذکرے کرتے تھے مگر ابھی تک یاسر کو یہ معلوم نہیں ہو پایا تھا کہ کنول کی زندگی میں کوئی ہے یا نہیں...... وہ کسی سے منسوب ہو چکی ہے یا آزاد ہے......

کل ناشتہ یاسر کی طرف سے تھا، آج کنول لے کر آ گئی۔ وہ اس معاملے میں ہرگز چوکنے والی نہیں تھی۔ دونوں نے یاسر کے کمرے میں ہی ناشتہ کیا۔

''رات تو میں اتنی تھکی ہوئی تھی کہ ہلکی سی حرارت محسوس ہو رہی تھی۔'' وہ سلائس کے نصف حصے پر جیم اور نصف پر مکھن لگاتے ہوئے بولی۔

''اب کیسی ہو؟''

''اب تو کچھ ٹھیک ہوں...... دیکھنا ذرا اب تو جسم گرم نہیں؟'' اس نے کمال سادگی سے یاسر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے نرم گرم رخسار پر رکھ لیا۔

یاسر کے سارے بدن میں بلند و بالا برقی لہریں دوڑ گئیں۔ وہ ایسے ہی اچانک اپنے مدمقابل کو ششدر کر دیتی تھی۔

ایک دو سیکنڈ کے لئے یاسر کی ہتھیلی اس کے ریشمی رخسار پر رہی پھر وہ ہاتھ پیچھے

ہٹاتے ہوئے بولا۔

"ہلکی سی حرارت تو شاید اب بھی ہے۔"

"نہیں ...... اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایک دم فٹ ...... اور آج ہم کولمبو میوزیم جارہے ہیں۔ دیکھنے کے لائق جگہ ہے۔ لیکن اس سے پہلے مجھے گھر فون کرنا ہے...... تمہیں بھی کرنا ہے؟" وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ بول گئی۔

"ابھی کل تو فون کیا تھا تم نے۔" یاسر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"چوبیس گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔ میں اپنی ماما سے چند گھنٹے بھی دور رہتی ہوں تو لگتا ہے کہ مہینوں گزر گئے ہیں۔ اس معاملے میں بڑی خبطی ہوں میں۔"

"تمہاری بات سے مجھے پورا اتفاق ہے۔" یاسر نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

پچھلے چار پانچ دنوں میں کنول درجنوں بار گھر میں فون کر چکی تھی۔ دو تین بار ہوٹل کے کمرے میں بھی اس کا فون آیا تھا۔ کم از کم تین مواقع ایسے تھے جب کنول نے یاسر کی موجودگی میں فون کیا تھا۔ وہ اپنی ماما سے یوں بات کرتی تھی جیسے واقعی مہینوں سے بچھڑی ہوئی ہو...... گھر کے ہر ہر فرد کا حال احوال پوچھتی تھی اور خاص طور سے اپنے چاچو سلیمان کا۔ اس کے بعد وہ اپنا احوال سنانے بیٹھ جاتی اور پچھلے فون کے بعد جو جو کچھ بیتا ہوتا تھا، اپنی ماما یا بڑی بہن کے گوش گزار کرتی تھی۔ کیا کھایا، کیا پیا، کتنی بار منہ دھویا، کتنی بار واش روم استعمال کیا، سب کچھ تفصیل سے بتاتی تھی۔ اپنی ماما اور باجی سلطانہ کو وہ یاسر کے بارے میں بھی سب کچھ بتا چکی تھی۔ یاسر نے بھی ایک بار اس کی باجی سلطانہ سے بات کی تھی۔ وہ بارعب لہجے والی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ شوہر ایک معروف سرجن تھے اور زیادہ تر وقت انگلینڈ میں گزارتے تھے۔

درحقیقت یہ ساری فیملی ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ اکثر خواتین و حضرات برسرِ روزگار تھے۔ یاسر نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ قدرے خشک مزاج اور غیر رومانی قسم کے لوگ ہیں۔ کنول بھی ان میں شامل تھی۔ بے شک وہ ہنس مکھ اور بے تکلف طبع کی مالک تھی۔ اس کے باوجود اس کے مزاج میں رومانیت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ خوش شکل تھی اور اگر خود پر تھوڑی سی توجہ دیتی تو کہیں زیادہ خوبصورت نظر آسکتی تھی لیکن وہ اپنی خوبصورتی

اور نسوانیت دونوں کی طرف سے لاپرواہ تھی۔

یاسر اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اسے اپنی ہتھیلی جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کتنا بے باک انداز تھا کنول کا اور کتنا خطرناک بھی۔ لیکن اس نے تو جیسے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ ہالینڈ کے مِلک پاؤڈر سے اپنے اور یاسر کے لئے دودھ کے گلاس تیار کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں نکل کھڑے ہوئے۔ حسب معمول منرل واٹر کی دو بوتلیں، تھوڑا سا پھل اور کیمرا وغیرہ ان کے سامان میں شامل تھا۔ آج ان کی منزل کولمبو کا عجائب گھر تھی لیکن اس سے پہلے انہیں پبلک کال آفس سے فون کرنا تھا۔ کال آفس کا منحنی سا سانولا سلونا سری لنکن اب انہیں بخوبی پہچاننے لگا تھا۔ پہلے یاسر نے گھر میں بات کی ...... وہ ایک ڈیڑھ منٹ بات کرتا تھا۔ اس دورانیئے کا بل قریباً 75 سری لنکن روپے بنتا تھا۔ یعنی اندازاً 45 پاکستانی روپے۔ اس کے برعکس کنول ہر بار دو سو پاکستانی روپے کے قریب ادا کرتی تھی۔

کنول نے گفتگو کا آغاز کیا تو یاسر باہر فٹ پاتھ پر ٹہلنے لگا۔ پچھلے چار پانچ دنوں میں وہ اسی طرح کم وبیش پچاس میل کا سفر کر چکا تھا۔ گفتگو ختم کرنے کے بعد کنول باہر نکلی تو چپ چپ تھی۔ آنکھوں کے کنارے سرخ نظر آرہے تھے لیکن پھر پانچ دس منٹ میں ہی وہ نارمل ہوگئی۔ وہ دونوں فٹ پاتھ پر چلتے جارہے تھے۔ ان کے اردگرد درمیانے قد اور درمیانے لباس والے سانولے سلونے سری لنکن تھے۔ یاسر کو دوستوں کی یہ بات درست معلوم ہوئی کہ سری لنکا میں گھومتے ہوئے وہ خود کو زیادہ خوبصورت اور امیر محسوس کرتے ہیں۔

پرسوں انہیں بس میں سفر کر کے خوب مزا آیا تھا۔ بچت بھی ہوئی تھی۔ آج وہ پھر بس میں بیٹھ گئے۔ یاسر کو نم کی بات یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ کولمبو جانا تو بس میں ضرور سفر کرنا۔

"وہ کیوں؟" یاسر نے پوچھا تھا۔

جواب میں وہ بولا تھا۔ "اس کی تین وجوہات ہیں۔ نمبر ایک، کولمبو کی بسوں میں رش بہت ہوتا ہے، نمبر دو، بسوں میں خواتین و حضرات اکٹھے سفر کرتے ہیں ...... اور

نمبر تین، کولمبو کے بس ڈرائیور بریکیں بہت زور سے اور بار بار لگاتے ہیں ......'' باتیں کرتے ہوئے نم کی آنکھوں میں شریری سی چمک تھی۔ اس چمک کا مطلب یاسر کی سمجھ میں اب آ رہا تھا۔

کنول اور یاسر آج پھر ایک ہی نشست پر ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ یاسر عجیب بے چینی کا شکار تھا...... اپنی بے چینی سے توجہ ہٹانے کے لئے وہ بس میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بس کی چھتوں پر نائیلون کی ایک طویل رسّی نظر آ رہی تھی۔ یہ چھت کے ساتھ ساتھ آگے سے پیچھے تک چلتی چلی گئی تھی۔

''یہ رسّی کس مرض کی دوا ہے؟'' یاسر نے بات چھیڑنے کی غرض سے کنول سے پوچھا۔

''یہ یہاں کی اکثر بسوں میں نظر آتی ہے۔ اس رسی کا بس میں وہی کام ہے جو ٹرین میں زنجیر کا ہوتا ہے۔''

''یعنی اسے کھینچ کر بس رکوائی جاتی ہے؟''

''بالکل...... کیا تم بس رکوانا چاہتے ہو؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''میرے ساتھ بیٹھ کر تم ایک دم گھبرائے ہوئے نظر آنے لگتے ہو یاسر۔ کیا مجھ میں ...... کچھ غلط ہے؟''

''فضول باتیں مت کرو۔'' یاسر نے سٹپٹا کر اسے ڈانٹ دیا۔

شاید بات مزید آگے چلتی لیکن اسی دوران میں ایک بڑھیا لڑکھڑا کر کنول کے کندھے سے ٹکرائی یہاں کسی کے لئے نشست خالی کرنے کا رواج تو نہیں تھا مگر کنول اس رواج کی پاسداری نہیں کر سکی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑھیا کو بٹھا دیا۔ وہ حیران حیران سی بیٹھ گئی۔ غالباً ایسے ''یادگار و بے مثال'' حسن سلوک کی توقع اسے ہرگز نہیں تھی۔

کنول کا آخری جملہ یاسر کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ کیا مجھ میں ...... کچھ غلط ہے؟

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا...... تم سراپا غلط ہو کنول...... تم نے میری رگوں میں ایک ایسی آگ بھڑکائی ہے جس کا تجربہ ہونا تو درکنار جس کے بارے میں میں نے

کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ وہی کیفیت ہے شاید جسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق کتابوں میں پڑھا تھا، کہانیوں اور تماثیل میں اس کا تذکرہ سنا تھا۔ میں نے اس کیفیت کو کبھی قابل غور نہیں جانا تھا...... اور نہ اب جانتا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں اس کیفیت کا مذاق اڑایا تھا اور اب بھی اسے سنجیدگی سے لینا نہیں چاہتا تھا...... لیکن یہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیا تہلکہ مچا ہوا ہے...... تم سراپا غلط ہو کنول...... تم نے ایک اچھے بھلے شریف بندے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے اور اس سے بھی زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ تم نے یہ سب کچھ مہینوں یا ہفتوں میں نہیں کیا، دنوں میں کیا ہے۔

وہ میوزیم پہنچے۔ ایک ناریل پانی والے سے انہوں نے پندرہ پندرہ روپے میں نہایت مزیدار اور ٹھنڈے ناریل لئے۔ سٹرا سے ناریل کا پانی پیتے ہوئے وہ میوزیم میں داخل ہو گئے۔ مین گیٹ سے اندر جاتے ہی انہیں ایک حیران کن درخت نظر آیا۔ وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ درخت اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا تھا کہ اکیلا ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی جڑیں شاخوں سے واپس زمین کی طرف جاتی تھیں اور پیوست ہو جاتی تھیں۔ وہاں سے پھر مضبوط تنے نمودار ہوتے تھے۔ اس افسانوی منظر والے درخت کا نام بھی اس کی ساخت اور بناوٹ کی طرح بے حد مشکل تھا۔

''Ficus Benghalemsis'' کنول نے بمشکل پڑھتے ہوئے کہا۔

''کافی مشکل نام ہے...... یہ تو تمہارا نام ہونا چاہئے تھا۔'' یاسر نے کہا۔

''مجھ میں کون سی پیچیدگی دیکھی ہے تم نے؟'' وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

''نہیں، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔'' یاسر مسکرایا۔

''سچ بولتے ہوئے تمہاری زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ یہ بات میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ جو شخص سچ زبان پر نہ لا سکے وہ جھوٹا ہوتا ہے۔''

''اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟''

''سچے اور جھوٹے کی تمہاری اس تعریف سے میں اتفاق نہیں کرتا۔'' یاسر نے کہا۔

''اچھا چھوڑو اس بحث کو...... پھر ناراض ہو جاؤ گے۔ لو یہ کیمرا...... اس درخت

کے ساتھ میری ایک اچھی سی تصویر بناؤ۔"

وہ درخت کی وسیع و عریض ہریالی کے بیچوں بیچ کھڑی ہوگئی۔ آج وہ زرد پھولوں والی سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ ہلکی سی تمازت نے اس کے گال سرخ کر رکھے تھے۔ فوکس کرتے ہوئے یاسر کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

چند تصویریں کھینچنے کے بعد وہ ٹکٹ گھر پر پہنچے۔ ٹکٹ 65 روپے کا تھا لیکن انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ٹکٹ کی قیمت حیران کن درخت دیکھ کر ہی پوری ہوگئی ہے۔ میوزیم کے اندر پہنچ کر وہ گردو پیش میں گم ہوگئے۔ ان کے چاروں طرف تاریخ کے ادوار تھے اور گم گشتہ زمانوں کی جھلک تھی...... کنول تو جیسے اردگرد سے بیگانہ ہی ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے پر خالص صحافیانہ دلچسپی تھی اور آنکھوں میں تحقیق کے جگنو چمک رہے تھے۔ جلد ہی یاسر نے کئی گیلریاں دیکھ لیں اور پھر بور ہونا شروع کر دیا۔ کنول ابھی تک دوسری گیلری میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔ یاسر کچھ دیر تک ایک چوبی بینچ پر بیٹھا رہا...... پھر اس کے ہاتھ ایک دلچسپ مشغلہ آ گیا۔ کنول نوادرات دیکھ رہی تھی، یاسر نے اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ بقول شاعر ؎

نشانے پہ میرے یہ دنیا ہے یارو
میں غافل کی ہر اک ادا دیکھتا ہوں

کنول کی غفلت کے ایسے لمحے شاید یاسر کو پھر نہ ملتے۔ جلد ہی یاسر کو اندازہ ہوگیا کہ اگر اگلے چھ گھنٹے بھی وہ میوزیم میں گھومتی رہی تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ باآسانی اس کے ساتھ "گھوم" سکتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں ان لمحوں میں وہ خود کو ایک ٹین ایجر لڑکے کی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ ڈائری پر نوٹس لیتی جارہی تھی۔ کبھی کسی شو کیس کے اوپر جھکتی تھی، کبھی پیچھے ہٹتی تھی، کبھی آگے بڑھتی تھی، کبھی تصویر لیتی تھی۔ جونہی یاسر محسوس کرتا کہ اس کی محویت ٹوٹ رہی ہے...... اور وہ اس کی تلاش میں دائیں بائیں نگاہ دوڑائے گی، وہ بڑی سنجیدگی سے نوادر کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ چند بار دونوں کی نگاہ بھی ملی۔ وہ بڑے دلنواز ادا سے مسکرائی اور یاسر کو بھی "نوادرات میں محو" دیکھ کر اپنے کام میں جت گئی۔

میوزیم سے فارغ ہو کر اور کوئی چار درجن تصویریں لے کر وہ سیدھے اپنے

پسندیدہ ریسٹورنٹ کرس کیٹ پہنچے اور اپنا پسندیدہ کھانا کھایا یعنی ایگ فرائیڈ رائس اور چلی چکن کھایا۔ کھانے کے دوران میں بھی وہ میوزیم کی باتیں ہی کرتی رہی۔

"یاسر! کنگ دھرما سوریا کی کرسی کیسی لگی؟"

"کک...... کرسی؟ ...... ہاں زبردست تھی۔" یاسر نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

درحقیقت اس نے کرسی دیکھی ہی نہیں تھی۔ وہ تو سارا وقت کنول کو ملاحظہ کرتا رہا تھا۔

"اس کرسی کے بارے میں، میں نے غالباً کسی اطالوی میگزین میں پڑھا تھا۔" کنول بولی۔ "کنگ کا پورا نام وما لا دھرما سوریا تھا۔ اس کی موت کے بعد یہ کرسی قریباً چھ سری لنکن بادشاہوں کے استعمال میں رہی تھی۔"

"ہاں...... چھ سات بادشاہوں کے استعمال میں رہی تھی۔" یاسر نے خوامخواہ ایک بادشاہ کا اضافہ کر دیا۔

"آخری بادشاہ پتہ ہے کون تھا؟"

"آ...... آخری بادشاہ...... آخری بادشاہ......"

"کنگ وکراما۔" کنول نے خوش ہو کر یاسر کی مشکل دور کر دی۔

"ہاں، ہاں...... وکراما۔" یاسر نے بھی خوش ہو کر تائید کی۔

"اس کے بعد کا تو تمہیں پتہ ہی ہوگا۔ یہاں قبضے کے بعد انگریز یہ کرسی اپنے ساتھ ولایت لے گئے تھے۔ ساتھ میں کنگ کی تلوار اور بیلٹ بھی تھی۔"

"انگریزوں سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔" یاسر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس نے کنول پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ انگریزوں کی اس کمینی حرکت کا علم اسے ابھی ابھی ہوا ہے۔

"کتنی زبردست تلوار تھی اور کتنا زبردست کمر بند...... یہ دراصل پورا سیٹ تھا۔" وہ بولی۔

"ہاں...... یہ پورا سیٹ تھا۔" یاسر نے فوراً اتفاق کیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ، پتہ ہی نہیں چلا۔ وقت کافی ہو گیا ہے۔ آج ہمیں تفریحی پارک بھی جانا ہے تو ہوٹل جا کر کچھ دیر آرام کر لینا چاہئے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی کچھ تھک گئی ہوں۔"

دونوں اٹھے اور رکشا میں سوار ہو کر ہوٹل پہنچ گئے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ کمرے میں تھوڑی سی گرمی تھی۔ پنکھے کی زیادہ ہوا لینے کے لیے یاسر نے بیڈ کو گھسیٹ کر پنکھے کے عین نیچے کر لیا تھا۔ جلد ہی وہ سو گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو ناک میں سرسراہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کنول اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ماچس کی تیلی تھی۔ اس تیلی سے اس نے یاسر کی ناک میں سرسراہٹ جگائی تھی اور نتیجے میں اسے بھی جگایا تھا۔ وہ اپنی اس شرارت پر خوش نظر آ رہی تھی۔

"دروازہ بند کر کے سویا کرو مسٹر کمپیوٹر پروگرامر۔ یہاں آزادی کا ماحول ہے۔ کوئی نالائق لڑکی بھی تمہارے کمرے میں گھس سکتی ہے۔"

"گھسی تو ہوئی ہے۔" یاسر نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"نالائقی کئی قسم کی ہوتی ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی اور یاسر کو دھکیل کر واش روم میں پہنچا دیا۔

یہاں پہنچ کر انہوں نے Meliniem Park کے بارے میں کئی دفعہ سنا تھا۔ لاہور میں نم نے بھی یاسر کو بتایا کہ یہ اچھی تفریحی جگہ ہے۔ جونہی وہ دونوں ہوٹل سے نکلے ایک رکشا ٹھک سے آن موجود ہوا۔ رکشا کو یہاں تھری وہیلر یا ٹک ٹک بھی کہا جاتا تھا...... سستی اور معقول سواری تھی۔ بس اس میں دو خامیاں تھیں ایک تو شور بہت کرتی تھی دوسرے اس میں خواتین کے بال اُڑتے تھے اور ساتھ بیٹھے ہوئے بھلے مانسوں کے چہرے سے ٹکراتے تھے۔ (بہر حال دوسری خامی بھی یاسر کو اب زیادہ بری نہیں لگتی تھی)

رکشا ہوٹل کے سامنے سے روانہ ہوا تو یاسر کی نگاہ سامنے تکہ شاپ والے لڑکے پر پڑی وہ حسب معمول شرارتی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

میلینیم پارک ان کے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کشادہ جگہ تھی۔ یہاں وہ سب کچھ موجود تھا جو ایسے پارکس میں پایا جاتا ہے۔ شاپنگ سینٹرز، بچوں کے جھولے، مختلف گیمز کے ہال، ریسٹورنٹس وغیرہ۔ میلینیم پارک کی ایک تخصیص یہ تھی کہ یہاں

ایک "سنو سٹی" بنایا گیا تھا۔ ایک بہت بڑے ٹینٹ کے اندر مصنوعی طور پر برف باری کا ماحول پیدا کیا گیا تھا۔ سری لنکا میں چونکہ کہیں بھی برف باری نہیں ہوتی لہٰذا یہ سنو سٹی اہل کولمبو کے لئے اضافی دلچسپی کا باعث تھا۔

400 روپے میں دو ٹکٹس لے کر کنول اور یاسر سنو سٹی میں داخل ہو گئے...... یہاں شائقین کا اژدھام تھا۔ بے حد تیز آواز میں میوزک بج رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چاروں طرف برف پھینکنے والی مشینیں لگی تھیں۔ وسیع و عریض جگہ برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نوجوان سری لنکن لڑکیاں لڑکے سازوں کی دھما دھم پر ناچ رہے تھے اور ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک رہے تھے۔

خوشی و مستی کے ماحول میں کنول بھی کھلی کھلی نظر آنے لگی۔ ناچتے گاتے ہجوم میں کسی وقت اس کے پاؤں بھی تھرک سے جاتے تھے۔ ماحول کا اثر ہر شخص پر ہوتا ہے۔ دھیرے دھیرے ماحول کی شوخی نے کنول کو بھی شوخ کر دیا۔ وہ چکمہ دے کر پیچھے سے آئی اور برف کا ایک گولہ یاسر کے گریبان میں گھسیڑ دیا۔ یاسر اس برف کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس نے تابڑ توڑ گولے مارنے شروع کر دیئے۔ یاسر نے دوڑ کر جان بچانا چاہی تو پھسلا اور گر پڑا۔ وہ اس پر لد سی گئی اور اس کے گریبان میں مزید برف گھسانے کی کوشش کرنے لگی۔ یاسر اس سے ہاتھا پائی کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اسے ماؤنٹ لیوینیا کے ساحل والی ہاتھا پائی یاد آ گئی۔ اس ہاتھا پائی کی سرگرمی میں ان دونوں کے ہاتھ اپنی اپنی حدود سے آگے نکل گئے تھے۔

ہر کوئی اپنے حال میں مگن تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہجوم میں گھومتے رہے۔ ایک دوسرے سے کچھ بھی کہنے کے لئے انہیں پورے زور سے بولنا پڑتا تھا۔ یاسر کے دل میں خواہش پیدا ہوئی وہ بھی پورے زور سے بولتے ہوئے کہہ دے...... "کنول میں محبت کرنے والوں کو احمق سمجھتا تھا لیکن آج میں خود کو احمق محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں محبت کرنے لگا ہوں...... شاید میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

لیکن بے پناہ شور کے باوجود یہ بات اس کی زبان پر نہیں آ سکتی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹہ سنو سٹی میں رہنے کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ کنول کو پیاس محسوس

ہو رہی تھی لیکن کولمبو میں منرل واٹر کے علاوہ وہ کچھ پیتی نہیں تھی ...... منرل واٹر اردگرد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یاسر نے کہا۔

"تم ادھر بینچ پر بیٹھو۔ مین گیٹ سے باہر مجھے ایک اسٹور نظر آیا تھا، میرا خیال ہے وہاں سے پانی مل جائے گا۔"

وہ بیٹھ گئی ...... تقریباً پانچ منٹ بعد جب یاسر پانی کی دو بوتلیں لے کر واپس آیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ یاسر نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی دکان پر ہو گی لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ وہ وہیں بینچ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے تو یاسر کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اٹھ کر اسے ڈھونڈنے لگا تاہم وہ بینچ سے زیادہ دور بھی نہیں جا رہا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک خجل خراب ہونے کے بعد یاسر کو یقین ہو گیا کہ وہ پارک میں موجود ہی نہیں ہے۔ اگر اس کا یقین درست تھا تو وہ کہاں چلی گئی تھی۔ اگر اسے جانا ہی تھا تو بتا کر جاتی۔ اس طرح پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

یاسر کو یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی کم از کم دو مرتبہ وہ اس قسم کی حرکت کر چکی ہے۔ ایک مرتبہ وہ گال فیس کے ساحل پر گھومتے گھومتے اچانک اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ دوسری بار اتوار کے روز علی الصبح وہ اپنے کمرے سے غائب پائی گئی تھی اور گیارہ بجے کے قریب واپس آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پرچے کے نامہ نگار کے بھائی سے ملنے گئی تھی۔ کنول کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات یاسر سے چھپائے اور یاسر کا خیال تھا کہ وہ اپنے اس حق کا بھرپور استعمال کر رہی ہے۔ کبھی کبھی اسے شک ہوتا تھا کہ کنول نے کولمبو میں اپنی آمد کا جو مقصد بتایا ہے ...... اس کے علاوہ بھی اس کا کوئی مقصد موجود ہے۔ کوئی پریشانی، کوئی الجھن ہے جو وہ ساتھ ساتھ لئے پھرتی ہے۔

یاسر تقریباً آٹھ بجے تک پارک میں موجود رہا۔ اس نے بار بار اس چوبی بینچ کے چکر لگائے جہاں وہ کنول کو چھوڑ کر گیا تھا۔ بالآخر وہ واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں یہ موہوم امید تھی کہ جب وہ واپس جائے گا تو کنول اپنے کمرے میں پائی جائے گی۔ لیکن ہوٹل پہنچ کر یہ امید بھی پوری نہیں ہوئی۔ کنول کا کمرہ تاریک

تھا اور دروازہ لاک ...... وہ بے قراری سے کوریڈور میں ٹہلنے لگا۔ کبھی اسے کنول پر غصہ آ رہا تھا ...... کبھی بے نام اندیشے ذہن میں جاگ اٹھتے تھے۔ کہیں اس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔ ایک خوبصورت لڑکی اکیلی ہو تو اس کے گرد گھورنے والی نگاہوں کا جال بچھا رہتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ نیچے استقبالیہ پر بھی گیا۔ اس نے پوچھا کہ کیا اس کی ساتھی لڑکی آئی تھی؟ جواب نفی میں ملا ...... یہ امکان بھی ختم ہو گیا کہ وہ آ کر پھر کہیں چلی گئی ہو۔

کنول سے جان پہچان ہوئے فقط چند دن ہوئے تھے مگر وہ بڑی خاموشی کے ساتھ اس کی رگِ جاں میں داخل ہوئی تھی اور اس کے لئے بے حد ...... بے حد اہم ہو گئی تھی۔ اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی تو یاسر کو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا محسوس ہوتا تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کل کلاں جب وہ واقعی اس سے دور چلی جائے گی، ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جائے گی تو پھر کیا ہو گا۔ کیا اسی طرح ہر طرف اندھیرا نظر آئے گا ...... اسی طرح ہر منظر روح سے خالی ہو جائے گا ...... سوچتے سوچتے اسے یقین ہو گیا کہ وہ کنول سے محبت کرنے لگا ہے۔ ایسی محبت جو دیکھتے ہی دیکھتے عقاب کی طرح انسان پر جھپٹتی ہے اور اسے اپنے پنجوں میں یوں دبوچتی ہے کہ وہ جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ کب ہوئی تھی یہ محبت؟ ...... کب ہوئی تھی؟ وہ نمناک آنکھوں سے سوچنے لگا۔ دل کی گہرائی سے جواب آیا یہ محبت شاید اسی وقت ہو گئی تھی جب ایئرپورٹ سے باہر اس نے کنول کو پہلی بار دیکھا تھا۔ یہ پہلی نظر کی محبت تھی شاید ...... اس نے کبھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ہو گا ...... لیکن ہو گیا تھا۔ جس معروف جذبے کو اس نے کبھی قابل غور نہیں جانا تھا، اس جذبے نے اسے شکار کیا تھا اور اتنے طوفانی انداز میں کہ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔

پتہ نہیں کہ یہ کیا کیفیت تھی۔ اسے کنول پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ واپس لوٹے تو وہ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنا شروع کر دے۔ اتنا جھنجھوڑے کہ وہ رونے لگے۔ پھر وہ غصے سے چیخ کر کہے ...... میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ تمہیں کیوں پتہ نہیں کہ میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ تمہیں کیوں پتہ نہیں ہے؟

لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ صرف اس کا ارادہ ہے۔ یہ ارادہ عمل کا روپ نہیں دھار سکتا۔ یہ تو فقط چند دن کا ساتھ تھا۔ چند ماہ کا ساتھ بھی ہوتا تو وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکتا...... بہرحال ایک بات کا آج اس نے تہیہ کرلیا۔ اس نے سوچا کہ وہ کنول سے یہ ضرور پوچھے گا کہ اس کی زندگی میں کوئی ہے یا نہیں ...... اور اس کی انگلی میں جو گولڈن رِنگ چمکتا ہے اس کے کیا معنی ہیں۔

کنول کی واپسی رات ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں شاپر تھا جس میں تازہ آم تھے۔ وہ صبح ہی یاسر سے کہہ رہی تھی کہ گرجا گھر کی پرلی طرف اس نے بڑے اچھے آم دیکھے ہیں ......کل وہ اسے آم کھلائے گی۔ اس نے آم سامنے ٹیبل پر رکھ دیئے اور خاموش خاموش سی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ویری سوری یاسر! میں نے تمہیں پریشان کیا۔ میں اتنی جلدی میں گئی کہ تمہیں بتا بھی نہ سکی۔''

''کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی؟'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

''بس اچانک ایک واقف کار نظر آ گئے تھے۔''

''پھر؟''

''مم......میرا ایک ذاتی مسئلہ تھا یاسر۔''

یاسر کے سینے میں دکھ کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے ذرا چونک کر کنول کی طرف دیکھا تب ایک گہری سانس اس کے سینے سے خارج ہوئی۔ لہجے کی ساری تپش و تاب جاتی رہی۔ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اوہ......سوری...... میں بھول گیا تھا کہ تمہارے ذاتی معاملات بھی ہو سکتے ہیں۔ آئی ایم رئیلی ساری۔''

کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری تھی ...... وہ کچھ بولی نہیں لیکن اٹھ کر بھی نہیں گئی۔ یاسر رخ پھیر کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ نیچے سڑک پر روشنیاں رواں دواں تھیں اور کولمبو جگمگا رہا تھا۔ گرجا گھر کے احاطے میں مومی شمعیں گردش کر رہی تھیں۔ ایک رکشا والا ایک ٹورسٹ سے راز و نیاز میں مصروف تھا۔ غالباً شب بسری کے سلسلے میں اسے کچھ ''دلچسپ'' معلومات فراہم کر رہا تھا۔ تکہ شاپ والا لڑکا شریر نظروں سے ان کی

کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یاسر نے ناگواری سے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔

''کنول ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ پھر وہ ہولے سے بولی۔''ناراض ہو گئے ہو؟''

''میرے خیال میں ناراض ہونے کے لئے جن ''لوازمات'' کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے درمیان موجود نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ واقعی ناراض ہو۔'' وہ اس کے عین سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ایک بار پھر کمرے کی فضا کو بوجھل خاموشی نے ڈھانپ لیا۔ چند سیکنڈ بعد کنول نے ایک عمیق سانس لیتے ہوئے اس خاموشی کو توڑا اور بولی۔

''یاسر! میں یہ تو نہیں کہتی کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ...... تاہم میں سمجھتی ہوں کہ میری زندگی پچانوے فیصد سے زیادہ سچ پر مبنی ہے۔ باقی چار پانچ فیصد جھوٹ بھی نہیں ہے ......تم اسے خاموش سچ کہہ سکتے ہو۔''

''کیا تم کوئی تمہید باندھ رہی ہو؟''

''ہاں ......تمہید ہی سمجھ لو...... میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ شاید آج تم اتنی ناراضگی کا اظہار نہ کرتے تو بھی کل تک میں تمہیں بتا ہی دیتی۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔''یاسر! میں یہاں اپنے آفس کے کام سے نہیں بلکہ ذاتی کام سے آئی ہوں ...... آفس کا جو کام میں کر رہی ہوں اس کی حیثیت ثانوی ہے وہ کیا کہتے ہیں کہ بیکاری سے بیگاری اچھی۔''

''ذاتی کام؟'' یاسر نے سوالیہ نظروں سے کنول کا ملیح چہرہ دیکھا۔

کنول نے اپنا سپید گلابی ہاتھ شیشے کی تپائی پر رکھا۔

''میری انگلی میں یہ رِنگ دیکھ رہے ہو نا؟ یہ میری منگنی کا ہے۔ دراصل میں بچپن سے ہی اپنے کزن خاور سے منسوب ہوں۔ خاور میرا خالہ زاد ہے۔ ہم بچپن سے اکٹھے کھیلے کودے ہیں، ایک ساتھ بڑے ہوئے ہیں، ایک دوسرے سے بہت لگاؤ ہے ہمیں۔''

یاسر کے دونوں کانوں میں جیسے کسی نے سیال آگ انڈیل دی تھی۔ اور یہ آگ کانوں کے راستے اس کے سینے میں جا کر ٹھہر گئی تھی۔ ایک دم ہی سب کچھ دھواں

دھواں ہونے لگا تھا۔ ڈراؤنے خواب جیسا تھا یہ سب کچھ۔

کنول کہہ رہی تھی۔ ''میں تمہیں ایک اچھا دوست سمجھنے لگی ہوں یاسر! شاید یہی وجہ ہے کہ تمہیں سب کچھ بتانے کو دل چاہ رہا ہے۔ اپنا ہر دکھ، ہر پریشانی......''

وہ خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''شاید ہم ابھی سکول میں بھی داخل نہیں ہوئے تھے جب بزرگوں نے آپس میں فیصلہ کر لیا تھا...... ہم بچے تھے، بزرگوں کے اس فیصلے سے بے خبر بچپن کی گلیوں میں کھیلتے کودتے رہے۔ دونوں گھرانوں میں بے تکلفی کا ماحول تھا۔ میں اور خاور ایک دوسرے کے اچھے دوستوں کی طرح تھے...... جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا ہمارے گھرانوں میں تعلیم پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ مڈل کے بعد خاور بھی اسلام آباد چلا گیا اور ہاسٹل میں رہنے لگا۔ میں اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ وقت گزرتا رہا۔ جوں جوں ہم بڑے ہوتے گئے یہ بات ذہن میں پختہ ہوتی گئی کہ ہم دونوں کی شادی ہونی ہے۔ جب ذہن میں اس طرح کی سوچیں آتی ہیں تو ایک تعلق تو پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

کنول نے سر جھکایا اور چند لمحے تک کسی سوچ میں غرق رہنے کے بعد بولی۔

''میری خالہ تو کافی عرصہ پہلے فوت ہو چکی تھیں، چار پانچ سال پہلے خالو بھی چل بسے۔ خالو اپنے اکلوتے بیٹے خاور کے لئے کافی کچھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ زندگی بھر کچھ بھی نہ کرتا تو آرام سے گزر بسر کر سکتا تھا اور اس کی اپنی سوچ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ کسی ڈیوٹی کا پابند نہیں ہو سکتا تھا۔ کاروبار اپنا ہو تو بھی ڈیوٹی تو دینا ہی پڑتی ہے۔ خاور نے کاروبار سمیٹ لیا۔ شہر کے ایک بارونق علاقے میں ایک مارکیٹ اس کی ملکیت ہے کئی درجن دکانیں ہیں۔ ان کا کرایہ اتنا ہے کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سیر و سیاحت کا اسے شوق ہے۔ پچھلے تین چار سال میں کئی ملک گھوم چکا ہے۔ دکانوں کا کرایہ چاچو کے پاس جمع ہوتا رہتا ہے۔ جب سیر و سیاحت میں رقم ختم ہو جاتی ہے تو وہ لوٹ آتا ہے۔ چند دن رہتا ہے، پھر چاچو کے پاس جمع شدہ رقم سے مزید خرچہ لیتا ہے اور نکل جاتا ہے...... اب تو پچھلے دو سال سے کرائے کی رقم بھی براہ راست اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے۔''

''آج کل وہ کہاں ہے؟''

''یہاں......سری لنکا میں۔''

یاسر کے دل پر ایک اور گھونسا لگا۔ رگوں میں تیرتی آگ مزید اذیت ناک ہو گئی۔

''تم اس سے ملی ہو؟'' وہ نارمل انداز میں بولا۔

''اس سے ملنے تو آئی ہوں لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔'' وہ اداسی سے بولی۔

''پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟''

کنول نے چہرے پر جھولنے والے بالوں کو کانوں کے پیچھے سمیٹتے ہوئے کہا۔

''وہ قریباً ڈیڑھ سال سے غائب ہے۔ کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ کہیں سے فون تک نہیں کیا ہے اس نے...... امی اس کے لئے بہت پریشان ہیں...... وہ سمجھتی ہیں کہ یہ سارا دوش میرا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بس...... تھی ایک بات۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''اب اگر بتانے ہی لگی ہو تو بتا دو سب۔'' یاسر نے کہا۔ اس کے عام سے لہجے کی تہہ میں ماتمی شور تھا۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر گہری سانس لے کر بولی۔

''خاور جلدی شادی کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے ارادہ کر رکھا تھا کہ جب تک جرنلزم میں ماسٹرز نہیں کر لیتی شادی نہیں کروں گی۔ پھر امی کی بیماری کا مسئلہ بھی تھا۔ ان کی آنکھوں میں ان دنوں بڑی تکلیف تھی۔ میں نے خاور سے بس ایک ڈیڑھ سال کا وقت مانگا تھا...... کبھی کبھی وہ بہت جلد سیخ پا ہو جاتا تھا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ ہمارے درمیان تکرار ہوئی۔ وہ غصے میں گلاس توڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ تیسرے روز پتہ چلا کہ وہ کسی سے بھی ملے بغیر بنگلور سے چلا گیا ہے۔ امی اور چاچو کا خیال تھا کہ پہلے کی طرح وہ ایک دو ماہ تک لوٹ آئے گا۔ زیادہ سے زیادہ ہوا تو تین چار ماہ لگ جائیں گے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے تو مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ چاچو نے دہلی، بمبئی وغیرہ میں اسے کافی تلاش کروایا، اس کے دوستوں سے بھی رابطہ کیا لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ یہ کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہے، اس نے اپنے بینک سے رابطہ کیا اور مینجر

سے اپنے اکاؤنٹ وغیرہ کی صورت حال دریافت کی۔ مینجر چاچو کا دوست بھی ہے۔ اس نے چاچو کو بتا دیا کہ خاور کا فون آیا تھا جس سے کم از کم اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ سری لنکا میں کہیں ہے۔ اس اطلاع کے بعد امی نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ ان کی خواہش تھی کہ چاچو سری لنکا جائیں اور خاور کو ڈھونڈیں۔ چاچو شاید تیار بھی ہو جاتے اور انہیں دفتر سے چھٹی بھی مل جاتی لیکن اسی دوران میں وہ بیمار ہو گئے۔ ان کے گردے کی پرانی تکلیف پھر نمودار ہو گئی...... آج کل وہ اس قابل ہرگز نہیں کہ لمبا سفر کر سکیں۔ بس دفتر اور دفتر سے گھر آتے ہیں۔ وہ آبپاشی کے محکمے میں ڈائریکٹر ہیں۔ جب امی کی پریشانی بڑھتی گئی تو میں نے چاچو سے اجازت مانگی اور خود سری لنکا آنے کا فیصلہ کیا۔"

"اور انہوں نے تمہیں آنے دیا۔"

"کیوں...... اس میں کیا قباحت تھی۔ میں اس سے پہلے پورا انڈیا گھوم چکی ہوں۔ نیپال اور ایران بھی جا چکی ہوں بلکہ ایران دو دفعہ گئی ہوں اور ایک سفر میں تو اکیلی تھی۔ میرے گھر والوں کو مجھ پر پورا بھروسا ہے...... تمہارا کیا خیال ہے، میں ایسی لڑکی نہیں ہوں کہ مجھ پر بھروسہ کیا جا سکے؟"

یاسر خاموش رہا۔ وہ بھی خاموش رہی۔ کھڑکیوں سے باہر کولمبو کی چمکتی ہوئی آنکھیں دھندلا گئیں۔ بام ساکت سے لگنے لگے۔ ہر شے ایک مایوسی بھرے دھوئیں میں چھپ گئی۔ یاسر نے اس دھوئیں میں بمشکل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے روٹھے منگیتر کو ڈھونڈنے اور منانے کے لئے یہاں آئی ہو۔"

"ہاں یاسر! میرے ذہن میں پچھتاوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید مجھ سے ہی غلطی ہوئی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے یہ سوچنا چاہئے تھا کہ اس کے پاؤں میں تو پہلے ہی چکر ہے، میں کیوں ایسا رویہ اپنا رہی ہوں کہ وہ بالکل ہی دور ہو جائے۔ امی کی حالت دیکھتی ہوں تو یہ پچھتاوے اور بڑھ جاتے ہیں۔"

یاسر نے کچھ کہنا چاہا لیکن مایوسی کا دھواں درد کی گھٹن سے مزید گہرا ہو کر اس کے حلق میں بھرنے لگا۔ اس کے گلے میں پھندا سا لگ گیا تھا۔

"ایکسکیوز می......" وہ بولا اور واش روم میں گھس گیا۔

وہ دو تین منٹ تک یونہی بے مقصد واش بیسن کے سامنے کھڑا رہا۔ اس نے واش بیسن سے ہی چند گھونٹ پانی پیا، منہ پر چھینٹے دیئے اور چہرے کو تولیے سے صاف کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ آنکھوں کے کنارے اب بھی جل رہے تھے لیکن سینے میں اٹھتا ہوا ابال قدرے کم ہو گیا تھا۔

وہ کنول کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ لہجے کو حتیٰ الامکان نارمل رکھتے ہوئے وہ بولا۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کنول، کہ تم کچھ چھپا رہی ہو۔"

"چھپا رہی تھی یاسر...... بتانے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ پردیس میں ایک اچھے اور مخلص دوست سے بڑھ کر قیمتی چیز اور کیا ہو سکتی ہے...... اور تم تو...... اتنے اپنے لگے ہو یاسر...... اتنے اپنے لگے ہو کہ میں خود حیران ہوں۔"

"تمہاری "تلاش" کی صورت حال کیا ہے کنول؟" یاسر کو اپنے لب و لہجے پر قابو پانے کے لئے سخت کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ خاور کی تلاش؟" کنول نے پوچھا۔ یاسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ "ایسے اشارے ملے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاید کسی چھوٹے شہر میں ہے اور زیادہ امکان ہے کہ 'مینکولم' میں ہے۔ میں کولمبو آنے سے پہلے قریباً دس دن 'مینکولم' میں رہی ہوں۔ تم جانتے ہو گے مینکولم کی حیثیت ایک بڑے قصبے کی ہے۔ وہاں کسی شخص کو ڈھونڈنا نسبتاً زیادہ مشکل نہیں ہے۔ خاور کی چند ایک خاص دلچسپیاں ہیں جن کی وجہ سے اس کی تلاش میں مدد مل سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی بھی اسٹیشن کے بہترین ہوٹل میں رہنا پسند کرتا ہے۔ دوسرے وہ ڈربی کا شوقین ہے۔ اچھے گھوڑوں سے اور اچھے گھوڑے رکھنے والوں سے اس کا رابطہ ضرور ہوتا ہے۔ تیسری چیز جو مجھے اس کی تلاش میں مدد دے سکتی ہے وہ اس کا فوٹو گرافی کا حد سے بڑھا ہوا شوق ہے۔ وہ شوقیہ فوٹو گرافر ہے لیکن اس کی تصویریں انگلینڈ اور امریکہ کے کئی معروف جریدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ہمارا اپنا میگزین بھی دو تین بار اس کی کھینچی ہوئی تصویر کو ٹائٹل سٹوری کے طور پر شائع کر چکا ہے۔ وہ ایک اچھا فنکار ہے

یاسر......"

"اگر تم کہہ رہی ہو تو وہ اچھا ہو گا۔ بلکہ بہت اچھا ہو گا۔"

"وہ لکی بھی بہت ہے۔ اکثر وہ اتفاق سے بہت اچھی تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کھلے دل سے اس کا اعتراف بھی کرتا ہے۔"

"اس کے لکی ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔" یاسر نے عجیب انداز سے کہا۔

کنول چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ اس نے یوں یاسر کی طرف دیکھا تھا۔ ایک شکن سی اس کی خوبصورت پیشانی پر نمودار ہوئی اور غائب ہو گئی۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

"مجھے معلوم ہے کہ اگلے منگل کینڈی میں فوٹو گرافرز کی ایک بڑی نمائش ہو رہی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ سوموار تک میں یہاں سے چلی جاؤں گی...... بہت ممکن ہے کہ اس نمائش میں خاور کا کوئی کلیو مل جائے...... اور کیا پتہ قسمت یاوری کرے اور وہ خود ہی مل جائے۔"

یاسر خاموش رہا۔ اس کے اندر کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ وہ یاسر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے یاسر...... میرا مطلب ہے تم نے کولمبو کب تک رکنا ہے؟"

یاسر کہنا تو یہی چاہتا تھا کہ اب ایک پل رکنے کو دل نہیں چاہتا لیکن بے شمار باتوں کی طرح یہ بات بھی اس کی زبان پر نہیں آئی۔ وہ بولا۔

"ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ سوموار یا منگل تک میں واپس ہی چلا جاؤں۔"

"اوہو، کیوں؟ کیا کینڈی نہیں دیکھو گے؟ تم تو بڑے مشتاق تھے۔"

"مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اب دفتری کام کی وجہ سے آنا جانا لگا رہے گا۔ کینڈی کا دورہ پھر کبھی کر لوں گا۔"

"لیکن بھئی اب اتنی کیا جلدی ہے۔ تم ساتھ ہو گے تو میرا حوصلہ بھی بلند رہے گا۔"

"تمہارے جیسی حوصلہ مند لڑکی کو میرے جیسا شخص بھلا کیا حوصلہ دے سکتا ہے؟"

"خیر ابھی چار پانچ دن پڑے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں تمہارا ارادہ بدل جائے...... اچھی بات کا امکان نہ ہو تو بھی اس کی امید رکھنی چاہئے اور یہاں تو امکان بھی موجود ہے۔"

یاسر نے ایک طویل آہ کو سینے میں دباتے ہوئے کنول کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کنول! میں ایک کمزور سا شخص ہوں لیکن اگر تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں تو پلیز مجھے بتاؤ...... میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

کنول کی کٹورا آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ بے ساختہ یاسر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"تمہارا یہ کہنا ہی بہت ہے یاسر۔"

"آج پارک میں سے اچانک کہاں غائب ہو گئی تھیں تم؟"

"بڑا عجیب دھوکا ہوا یاسر! ادھر میسور میں خاور کا ایک بنگالی دوست من موہن ہے، وہ شادی بیاہ کی ویڈیو فلمز بنانے کا کام کرتا ہے۔ تین چار ملازم لڑکے رکھے ہوئے ہیں، اچھا خاصا کام ہے...... جب تم مجھے پارک میں کھڑا کر کے پانی لینے گئے تو اچانک میری نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ مجھے ہو بہو خاور کا دوست من موہن لگا۔ میں بھیڑ میں سے راستے بناتی ہوئی اس کے پیچھے گئی وہ مین گیٹ سے نکلا اور بس میں سوار ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے بس میں گھس گئی۔ بس بھری ہوئی تھی۔ فوراً ہی چل پڑی...... میرے دل میں آئی کہ اگر یہ شخص واقعی من موہن ہے تو اس کا پیچھا کروں اور دیکھوں کہ کہاں جاتا ہے۔ بس ایک لمبا چکر کاٹ کر اسٹیشن کے علاقے میں پہنچی۔ ایک اسٹاپ پر وہ شخص اترا اور میں بھی اس کے پیچھے چل دی۔ بس میں اسے ذرا نزدیک سے دیکھنے کے بعد مجھے شبہ ہونے لگا کہ میں ایک غلط بندے کے پیچھے چل پڑی ہوں۔ یہ من موہن نہیں ہے۔ بس سے اترنے کے دس پندرہ منٹ بعد یہ شک مزید پختہ ہو گیا۔ وہ شخص ہیئر کٹنگ کی ایک دکان میں داخل ہوا اور پھر تھوڑی دیر بعد میں نے اسے ایک گاہک کے بال تراشتے دیکھا۔ مزید تصدیق کے لئے میں نے اس سے بات بھی کی۔ وہ بنگالی ضرور تھا مگر بنگلہ دیش کا رہنے والا تھا اور اس کا نام سرجیت کمار تھا......"

"...... اور اتوار کے روز جب تم صبح صبح غائب ہو گئی تھیں اور گیارہ بجے
تھیں؟"

"اس دن تو واقعی میں عبدالواحد کی طرف گئی تھی۔ عبدالواحد ہمارے نامہ نگار
کیانی صاحب کا بھائی ہے۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ بھی شوقیہ فوٹو گرافر ہے اور
آرٹسٹک تصویریں کھینچتا ہے..... اس سے مل کر کچھ اور جانکاری تو نہیں ہوئی لیکن
ضرور پتہ چل گیا کہ سولہ تاریخ کو کینڈی میں تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے۔"

"اور اس دن ساحل پر کیا ہوا تھا؟ میں کتنی ہی دیر تمہیں ڈھونڈتا رہا۔" یاسر
پوچھا۔

"تمہاری نظر بڑی تیز ہے یاسر! میری ہر ہر حرکت کو نوٹ کرتے رہے ہو۔"

کنول کا خیال تھا کہ شاید وہ جواباً مسکرائے گا..... لیکن دل میں ماتم ہو تو ہونٹوں
مسکراہٹ کیسے آ سکتی ہے۔ وہ بالوں کی ریشمی لٹوں کو کانوں پر ٹکاتے ہوئے بولی۔

"میں نے "ہالیڈے ان" کی سائیڈ پر ڈربی کے چند گھوڑے دیکھے تھے۔
میں ان کے جیکی بھی تھے۔ میں تصویر کھینچنے کے بہانے ان کے پاس چلی گئی تھی
بات کرنے لگی تھی..... آئی ایم سوری..... میں نے بار بار تمہیں تنگ کیا۔ کہو تو ہاتھ
کر معافی مانگ لیتی ہوں۔"

"معافی تو مجھے مانگنی چاہئے..... تمہاری اتنی کڑی نگرانی کرتا رہا۔"

"تم نگرانی نہیں کرتے رہے، میرا خیال رکھتے رہے اور خیال تو اپنوں کا ہی
جاتا ہے نا۔"

"شکریہ۔" یاسر نے بمشکل کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔



وہ رات یاسر کے لئے بڑی سخت تھی۔ اس پر ایک خوفناک انکشاف ہو رہا تھا اور انکشاف یہ تھا کہ وہ عشق میں گرفتار ہو چکا ہے..... ہاں کنول کے لئے اس کے احساسات اتنے شدید تھے کہ انہیں عشق ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ چند دن میں ہی اس کی محبت جوان ہوئی تھی، پروان چڑھی تھی، عشق بنی تھی اور پھر المیے کا شکار ہو گئی تھی۔

یہ المیہ ہی تو تھا کہ جو اس کے دل و جان کا مالک بن بیٹھا تھا وہ کسی اور کا نکلا تھا۔ وہ کسی اور کی جدائی کا غم دل میں لئے پھرتی تھی..... وہ کسی اور کی تلاش میں تھی۔ وہ کسی دوسری منزل کی راہی تھی۔

بہت دنوں بعد یاسر کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔ وہ ساری رات اس نے غم کے گھیرے میں گزاری، وہ کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور کھڑکیوں سے باہر اُفق تا اُفق پھیلا ہوا کولمبو رات کی بانہوں میں سوتا رہا..... یقیناً دوسرے کمرے میں وہ بھی سو رہی تھی۔ اس بھیانک طوفان سے بے خبر جو اس نے کسی کی زندگی میں پیدا کیا تھا اور اس گھٹن سے بے خبر جس میں کوئی سانس لینے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

ایک دو بار اسے غنودگی محسوس ہوئی۔ اس غنودگی میں اس نے تصور کی نگاہ سے کچھ مناظر دیکھے۔ یہ وہی مناظر تھے جو پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے اور اس کے اندر کی دنیا کو تہہ و بالا کر رہے تھے۔ اس نے دیکھا ایئر پورٹ سے کولمبو جانے والے راستے پر کولمبو کا "فلائنگ ہارس" اپنا رکشا اُڑائے چلا جا رہا ہے، کسی کے ریشمی بال رقص کر رہے ہیں اور دیوانہ وار یاسر کا چہرہ چوم رہے ہیں۔ پھر اس نے ہوٹل کے کمرے کا منظر دیکھا، کسی نے عقب سے اسے بانہوں میں لے لیا تھا اور انگلی کے اشارے سے اسے "پی سی او" کا سبز بورڈ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس

کی پشت پر چنگاریاں سی بکھر گئی تھیں۔ تب ماؤنٹ لیوینیا کے ساحل کا منظر اس کی نگاہوں کے روبرو آیا۔ وہ مانوس اجنبی اس سے دست و گریباں تھا۔ گتھم گتھا تھا اور اس کے سریلے قہقہے یاسر کے کانوں کے بہت قریب گونج رہے تھے...... پھر وہ یادگار منظر اس کے پردۂ تصور پر چمکا، جب اس مانوس اجنبی نے کہا تھا، ذرا دیکھنا مجھے حرارت تو نہیں۔ اور یاسر کا ہاتھ اپنے نرم گرم رخسار پر رکھ لیا تھا۔ یاسر کو محسوس ہوا جیسے ابھی تک اس کی ہتھیلی پر بہار کی خوشبو اپنے سارے رنگوں سمیت ٹھہری ہوئی ہے۔

وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ننگے پاؤں ٹائلوں کے شفاف فرش پر ٹہلنے لگا...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا، یہ سارے منظر اپنی ساری خوبصورتی سمیت ہمیشہ کے لئے اس کے ذہن میں محفوظ ہو جائیں۔ اس سے پہلے کہ ان مناظر پر کسی اور ناپسندیدہ منظر کا سایہ پڑے وہ انہیں سمیٹ کر چپ چاپ یہاں سے چلا جائے۔ ہمیشہ کے لئے کنول کو اپنی نظروں سے اوجھل کر دے۔

وہ کافی دیر تک اسی رخ پر سوچتا رہا...... مگر پھر دھیرے دھیرے سوچ کا رخ تبدیل ہو گیا۔ دل نے کہا چار پانچ روز اور ہیں، یہ اس کے ساتھ گزار لو، خاموشی کے ساتھ اسے اپنی نگاہوں میں بھر لو۔ اس کے ہر ہر خدوخال کو ذہن میں نقش کر لو۔ اس کی تصویریں، اس کی کچھ یادیں اپنے ساتھ لے جاؤ...... یہ سرمایۂ حیات ہوگا۔ برسوں تک تمہارے کام آتا رہے گا۔ تمہیں اس چنچل چہرے کی یاد دلاتا رہے گا جو کولمبو کی حسین فضاؤں میں تمہارے سامنے آیا اور رگِ جاں میں اتر گیا......

وہ دیر تک سوچتا رہا، اپنے خیالوں سے الجھتا رہا...... رات کے دروازے پر صبح کی دستک ہونے لگی۔ وہ اپنی حالت پر حیران و پریشان کچھ دیر کے لئے سو گیا۔

صبح کنول ملی تو یوں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، جیسے کل رات کوئی قیامت گزری نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خمار اور چہرہ نکھرا نکھرا تھا۔

"آج پتہ ہے ہم کہاں چلیں گے؟" وہ چھوٹتے ہی بولی۔

یاسر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آج Zoo چلیں گے۔ چاچو نے کہا تھا کہ Zoo مس نہ کرنا، دیکھنے کی جگہ ہے۔ اتنے بڑے بڑے ہاتھی ہیں کہ جنات لگتے ہیں۔"

یاسر نے رات کو ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ سر تسلیم خم رکھے گا اور جو "مزاجِ یار" میں آئے گا کرتا رہے گا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولی۔ "لگتا ہے کہ تمہیں چڑیا گھر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔"

"تمہیں ہے؟"

"کیا مطلب؟"

وہ مسکرایا۔ "میں حیران تھا کہ تفریحی مقامات سے تمہیں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں ہے۔ اب پتہ چلا کہ یہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ ہے۔ سیاحت کے ساتھ ساتھ تم خاور کو بھی تلاش کر رہی ہو۔ وہ بھی سیاحتی مزاج کا مالک ہے۔ ایسی جگہوں پر ضرور گھومتا پھرتا ہوگا جہاں اچھی تصویریں ملنے کا امکان ہو۔"

"ہاں...... تم کہہ سکتے ہو کہ یہ خیال بھی میرے ذہن میں رہتا ہے۔ لیکن اتنے بڑے شہر میں اس طرح گھومنے پھرنے سے کسی کے مل جانے کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔ میری اصل امید عبدالواحد صاحب سے ہے۔ ان سے کل شام کی ملاقات طے ہے۔ یہاں شائن کلب کے نام سے ایک جگہ ہے، یہاں ہفتے کی شام پریس فوٹو گرافرز جمع ہوتے ہیں۔ شوقیہ فوٹو گرافی کرنے والے لوگ بھی آ جاتے ہیں۔ یہ ہفتہ وار نشست رات گئے تک رہتی ہے۔ عبدالواحد صاحب کا خیال ہے کہ ہفتے کی شب مجھے شائن کلب ضرور جانا چاہئے۔" کنول نے چند لمحے توقف کیا اور پھر یاسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم بھی میرے ساتھ چلو گے؟"

وہ خلوصِ دل سے بولا۔ "میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جس سے تمہیں اپنے کام میں کسی طرح کی مدد مل سکتی ہے۔"

"یعنی تم میرے ساتھ کینڈی بھی چلو گے؟" وہ چہکی۔

"میں صرف کولمبو کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔"

"پلیز یاسر!" وہ ٹھنک کر بولی۔ "تم چلو نا...... مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"لیکن یہاں بھی کسی کو میری ضرورت ہے۔ میرا مطلب آفس والوں سے ہے۔ تم نے سوموار کے روز یہاں سے روانہ ہو جانا ہے اور مجھے سوموار کے روز یہاں کام کرنا ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ کام سوموار کو ختم ہی ہو جائے۔"

"میں تمہارا انتظار کرلوں گی۔ ہم رات کو روانہ ہو جائیں گے۔ بلکہ تم کہو گے منگل کے روز علی الصبح نکل جائیں گے۔ ٹرین پر نہ جائیں گے، بس وغیرہ پر چلے جائیں گے۔"

"یہ ساری باتیں ابھی قبل از وقت ہیں کنول۔ اصل پوزیشن تو سوموار کو واضح ہو گی۔"

"مجھے لگتا ہے تم بہانہ بنا رہے ہو۔ تم نے تو کہا تھا کہ کام مکمل ہے، بس تھوڑا سا رہ گیا ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "جب تم نے طے کر ہی لیا ہے کہ میں جھوٹا ہوں تو پھر میرے صفائیاں پیش کرنے سے کیا حاصل ہو گا۔"

"اچھا...... چلو تیاری تو پکڑو...... میں تمہارے کپڑے استری کرتی ہوں۔ تم نہا لو۔ لگتا ہے کہ تمہیں گرمی ہو گئی ہے، آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ چاچو کہتے ہیں کہ نہاتے ہوئے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالنا چاہئے اور ہولے ہولے چپت لگانے چاہئیں۔ اس سے گرمی دور ہوتی ہے۔"

یاسر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ وارڈ روب کی طرف لپک گئی۔ اس نے خود ہی میچ کر کے ایک پتلون شرٹ ہینگر سے اتاری اور میز کو استری اسٹینڈ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے استری کرنے لگی۔ بالوں کی لٹیں رخساروں پر جھول رہی تھیں۔ بیسن کے سامنے شیو کرتے ہوئے یاسر کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔ قریب ہی میز پر یاسر کا کیمرا پڑا تھا۔ اس کا دل چاہا اس اپنائیت بھرے منظر کی ایک تصویر کھینچ لے۔ اس نے اپنے اندر ہمت جمع کی، کیمرے کی طرف ایک قدم بڑھایا بھی، لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔

دونوں نے کمرے میں ہی مختصر سا ناشتہ کیا، منرل واٹر کی بوتلیں اور کچھ کیلے، سیب شاپر میں رکھے اور چل پڑے۔ حسب معمول امی اور باجی سے بات کرنے کے لئے کنول آج پھر تڑپ رہی تھی۔ وہ پی سی او پر پہنچے، یاسر باہر فٹ پاتھ پر ٹہلنے لگا۔ کنول باتوں میں مصروف ہو گئی۔

پانچ دس منٹ بعد اس کی آواز آئی۔ "یاسر...... پلیز ذرا اندر آنا۔"

یاسر نے سمجھا شاید اسے ریزگاری وغیرہ کی ضرورت ہے لیکن وہ اندر پہنچا تو کنول نے جھٹ سے ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"باجی ہیں...... تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" وہ بولی۔

یاسر ٹپٹا گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے "ہیلو" کہا۔

"السلام علیکم یاسر صاحب!" دوسری طرف سے ایک مترنم آواز آئی۔ "میں بنگلور سے کنول کی باجی بول رہی ہوں۔"

"آپ سے غائبانہ تعارف تھا، آج بات بھی ہو گئی۔ بڑی خوشی ہوئی۔" یاسر نے رسمی جملے کہے۔

"دراصل...... کنول آپ کی اتنی تعریفیں کرتی ہے کہ آپ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ میرے خیال میں یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اسے کولمبو میں آپ جیسا ہمسفر مل گیا ہے۔"

"جی ہاں...... میں بھی اس کی کمپنی کو انجوائے کر رہا ہوں۔ ہم اکٹھے گھوم پھر رہے ہیں۔"

"اور بچت بھی ہو رہی ہے، کرایوں اور کھانے وغیرہ میں۔" کنول نے ریسیور کے ساتھ منہ لگا کر لقمہ دیا۔ اس کوشش میں اس کا رخسار یاسر کے رخسار سے لگ گیا تھا۔

ایک برق سی یاسر کے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ لیکن اس "کافر ادا" کو تو کچھ خبر ہی نہیں تھی۔

"آپ...... چپ کیوں ہو گئے یاسر صاحب؟" بنگلور کے کسی گھر سے کنول کی باجی کی آواز ابھری۔

"کک...... کچھ نہیں۔" وہ ہکلایا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ آپ نے بہت ہمت کی ہے کنول کو اکیلے یہاں بھیج کر۔"

"یہ سیلانی روح ہے۔ گھر میں تو اس کے پاؤں ٹکتے ہی نہیں۔ بہت دور دور تک اکیلی گھوم آتی ہے۔ آپ کو اس کے مسئلے کا تھوڑا بہت پتہ تو چل ہی گیا ہو گا...... خاور اس کے منگیتر کا نام ہے۔ ہم کافی عرصے سے اس کے لئے بہت پریشان ہیں۔"

"ہاں...... کنول نے مجھے اس بارے میں تھوڑا بہت بتایا ہے۔ ہم اس بارے میں کل بھی بات کرتے رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ لوگوں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو۔"

"بس امید پر دنیا قائم ہے۔ ہم بھی امید لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"خاور صاحب کا مل جانا کوئی ایسی انہونی نہیں ہے۔ اگر وہ یہاں کسی چھوٹے شہر میں ہیں تو پھر ان کے ملنے کا امکان اور زیادہ ہے...... ان کے جو ایک دو خاص مشغلے ہیں ان کی وجہ سے بھی ان کی تلاش میں مدد مل سکتی ہے...... اس کے علاوہ......"

یاسر کی بات اس کے منہ میں رہ گئی۔ ایک بار پھر کنول نے لقمہ دینے کے لئے اپنا منہ ریسیور کے قریب کیا۔ اس کا گال یاسر کے گال اور ناک سے رگڑ کھانے لگا۔ بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑیں اور ایک خوشبو سی دل و دماغ کو مسحور کر گئی۔ وہ جھجک کر کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ وہ چہکی۔ "ان حضرت سے اصل بات بھی تو کریں باجی۔"

ریسیور ایک بار پھر اس نے یاسر کے کان سے چپکا دیا۔

کنول کی باجی کی آواز آئی۔ "یاسر صاحب! کنول کبھی کبھی بہت شوخ ہو جاتی ہے۔ آپ بیزار تو نہیں ہوتے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" یاسر نے کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر کنول کی باجی کی آواز آئی۔ "کنول بتا رہی تھی کہ آپ پاکستان واپس جانے کا سوچ رہے ہیں۔"

"واپسی کے بارے میں تو میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا...... میں نے اسے صرف یہ بتایا ہے کہ میں اس کے ساتھ کینیڈی نہیں جا سکوں گا۔ اسے پندرہ تاریخ کو جانا ہے جبکہ پندرہ تاریخ کو میں آفس میں مصروف ہوں۔ ممکن ہے کہ یہاں ایک دو روز مزید لگ جائیں۔"

"اپنے حالات کے بارے میں تو آپ ہی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں اتنی دور بیٹھی کیا کہہ سکتی ہوں۔ بس اتنی گزارش ضرور کروں گی کہ آپ اگر چند دن کنول کا ساتھ دے دیں تو یہ اس کے لئے بہتر ہوگا، بلکہ ہم سب کے لئے بہتر ہوگا۔ لیکن اگر اس طرح آپ کے کسی کام کا ہرج ہوتا ہے تو پھر آپ اس بارے میں نہ سوچیں۔"

"میرے بارے میں آپ جس طرح سوچ رہے ہیں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ اگر میں آفس کے کام سے جلد فارغ ہو سکا تو آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

چند رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد یاسر نے کنول کی بہن کو خدا حافظ کہہ دیا۔

وہ شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یاسر منہ بنا کر رہ گیا۔

چڑیا گھر جانے والی بس کا نمبر انہوں نے کل ہی معلوم کر لیا تھا اور یہ نمبر انہیں بہت اچھی طرح یاد بھی رہا تھا کیونکہ یہ "100" تھا۔ انہیں اس بس سے "دہی والا" جنکشن پہنچنا تھا اور وہاں سے تھوڑا سا پیدل چلنا تھا۔ شہر کے اندر چلنے والی اکثر بسوں میں ریڈیو آن رہتا تھا اور کمرشل سروس قسم کے پروگرام نشر ہوتے رہتے تھے۔ اس بس میں بھی یہ سلسلہ موجود تھا۔ گانے بھی نشر ہو رہے تھے۔ اکثر گانے پاکستانی یا انڈین فلمی گانوں کی دھن پر تیار کئے گئے تھے۔ زبان سنہالی یا مدراسی وغیرہ تھی۔ ایک گانا بج رہا تھا۔ یاسر نے طرز پر غور کیا تو شناخت کر لیا۔ یہ پاکستانی فلم "آئینہ" کا گانا تھا۔

'مجھے دل سے نہ بھلانا...... چاہے روکے یہ زمانہ...... تیرے بن میرا جیون کچھ نہیں'

یاسر نے دل ہی دل میں اس نغمے کے بول دہرائے۔ دل میں عجیب سا گداز محسوس ہوا۔ ایک ایسی تیکھی لیکن میٹھی کسک جس کا تجربہ اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

"جانتی ہو یہ کون سا گانا ہے؟" یاسر نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم......" وہ بولی۔

"بڑی اچھی شاعری ہے۔ بعض گیت فلمی ہونے کے باوجود اپنے اندر تخلیقی حسن اور گہرائی رکھتے ہیں۔ انہیں صرف اس وجہ سے رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ فلمی ہیں۔" یاسر نے کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

اس دوران میں ایک اور گانا بجنے لگا...... اس مرتبہ طرز ایک مشہور انڈین گانے کی تھی۔

'ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے...... مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے'

یاسر نے کہا۔ "یہ گانا بھی نہیں پہچانا؟"

وہ کچھ دیر تک ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے غور سے سنتی رہی، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''بھئی یہ تو تمہارے انڈیا کا گانا ہے۔''

''دراصل میں میوزک سنتی ہی کم ہوں۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں۔'' اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ''دراصل ہر گانے میں وہی گھسے پٹے بول ہوتے ہیں اور وہی پرانا موضوع ہوتا ہے...... یعنی محبت۔''

''تو محبت تمہارے لئے پرانا اور فرسودہ موضوع ہے؟''

''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ پھر خیالات کو مجتمع کر کے کہنے لگی۔ ''محبت کے جذبے کو اتنا ایکسپلائٹ کیا گیا ہے کہ اب وہ اپنے اصل معنی ہی کھو چکا ہے۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ جسے دیکھو وہ محبت کر رہا ہے، بلکہ عشق کر رہا ہے اور جو بھی ایسا کر رہا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کی محبت سب سے جدا اور منفرد ہے۔ اس جیسی محبت کسی اور نے نہیں کی ہوگی اور نہ کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ جذبہ اگر شدید ہو تو بندے سے معروضی انداز میں سوچنے کی صلاحیت بھی چھین لیتا ہے...... تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ذرا وضاحت کرو۔'' یاسر نے کہا۔

''بھئی دیکھو نا...... جب لڑکا لڑکی محبت فرماتے ہیں تو انہیں ایک دوجے میں دنیا بھر کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اپنے پریمی کا اٹھنا بیٹھنا، مسکرانا بلکہ چھینکنا اور کھانسنا بھی اچھا لگتا ہے۔ ہر پریمیکا حسینۂ عالم کے قریب قریب ہوتی ہے اور ہر پریمی روپ نگر کا شہزادہ ہوتا ہے۔ لیکن جب کچھ عرصے بعد جذبے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں تو یہی لوگ ایک دوجے کے بال نوچتے ہیں، تھپڑ اور ٹھڈے مارتے ہیں، ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں رہتے۔''

''یہ تو تصویر کا صرف ایک رخ ہے...... دوسرا بھی تو دیکھو۔''

''دوسرا کیا ہے؟'' وہ بولی۔

''جب جذبے ٹھنڈے نہیں ہوتے، جب جدائیاں جذبوں کو امر کر دیتی ہیں تو کیا

ہوتا ہے؟ محبت ایک عظیم طاقت بن جاتی ہے۔ وہ ایسے ایسے کارنامے انجام دیتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ جنگیں جیتتی ہے، دنیائیں دریافت کرتی ہے، زندگیاں پلٹتی ہے، ایجادیں کرتی ہیں، پہاڑ سر کرتی ہے، سمندر عبور کرتی ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو...... وہاں تمہیں محبت کے شاہکار ملیں گے۔''

وہ مسکرائی اور فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''پھر یہ طاقت محبت میں تو نہ ہوئی...... محبت کی ناکامی میں ہوئی۔''

''تمہارا یہ تصور بھی غلط ہے۔'' یاسر بولا۔ ''محبت جب کامیاب ہوتی ہے تو پھر ایک ''گھر'' بنتا ہے۔ ایک خوبصورت آنگن جس میں فطرت اپنے بہترین رنگوں میں نظر آتی ہے۔ زندگی کو ''زندگی کرنے'' میں دشواریاں تو بے شک ہر گھر میں پیش آتی ہیں لیکن محبت...... اپنے چاہنے والوں کو گردابوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ جو تم نے کہا ہے کہ یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں، اگر کسی کو شوق ہے تو وہ اعداد و شمار اکٹھے کر کے دیکھ لے، وہ جان جائے گا کہ جن گھروں میں ازدواجی زندگیاں تلخ ہوتی ہیں، ان میں محبت کرنے والوں کے گھر بہت کم ہوتے ہیں۔''

''اوہو...... ہو...... ہو......'' وہ حیران نظر آئی۔ پھر ہنستے ہوئے بولی ''میں تو سمجھتی تھی کہ تمہارے منہ میں زبان نہیں۔''

''اب تم بات کو مذاق میں لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ حالانکہ یہ ایک سنجیدہ موضوع ہے۔''

''ہر موضوع ہر شخص کے لئے مختلف معنی رکھتا ہے۔''

''تمہارے لئے یہ کیا معنی رکھتا ہے؟''

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''محبت کس کو اچھی نہیں لگتی۔ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ مگر میرے نزدیک محبت کو صرف عورت اور مرد کی محبت تک ہی محدود کر دینا سراسر زیادتی ہے۔ میں بھی ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں، اپنی امی جان سے...... اپنے چاچو سلیمان سے...... اپنے مرحوم ابو جی سے...... اپنی دادی ماں سے۔''

''اور اپنے منگیتر خاور سے۔'' یاسر نے اس کا فقرہ مکمل کرنا چاہا۔

اس نے براہِ راست یاسر کی آنکھوں میں دیکھا اور بولی۔ ''دراصل ہر خاندان کا اپنا

ایک مزاج ہوتا ہے۔ یعنی ایک مزاج تو معاشرے کا ہوتا ہے اور ایک خاندان کا اپنا بھی ہوتا ہے۔ یہ دونوں مزاج ایک دوسرے پر اثر بھی ڈالتے رہتے ہیں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے محبت اور رومانس وغیرہ کے معاملے میں ہمارے خاندان کا رویہ ذرا سرد مہری کا ہے۔ پچھلے پچیس تیس سالوں میں ایک آدھ رشتے کے سوا سبھی رشتے ''ارینج میرج'' کی شکل میں ہوئے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے لڑکے لڑکیوں کا رجحان اپنے کیریئر کی طرف بہت زیادہ رہتا ہے...... نئی نسل میں سے زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں...... مجھے چھوڑ کر۔'' اس نے کہا اور خود ہی ہنس پڑی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

''ہمارے خاندان کے زیادہ تر لوگ دہلی اور بنگلور میں رہتے ہیں۔ کوئی ایک درجن ڈاکٹر ہوں گے، چار پانچ انجینئر ہیں، بڑے ماموں کے دونوں بیٹے ایئر فورس میں ہیں، بڑی خالہ کی ایک بیٹی سول سروس میں چلی گئی ہے...... قریباً سارے ہی لوگ اچھی جگہوں پر ہیں...... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عملی زندگی میں زیادہ ''انٹرسٹڈ'' ہونے کی وجہ سے شاید ہمارے ہاں یہ ''محبت'' والا پہلو کمزور رہ گیا ہے۔''

''کیا تم محبت نہیں کرتی ہو؟'' یاسر نے اچانک سوال پوچھا۔

وہ گڑبڑائی، پھر سنبھل کر بولی۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تم اپنے منگیتر سے محبت نہیں کرتی ہو؟ اس کی جدائی نے تمہیں پچھتاووں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تم اسے ڈھونڈ رہی ہو، ہر چہرے میں اس کا چہرہ تلاش کر رہی ہو۔''

وہ ایک دم قہقہہ لگا کر ہنسی۔ اس کے گال شہابی ہو گئے اور بال چہرے پر ڈھلک آئے۔ ''شاید آج تم نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ بال کی کھال اتارو گے۔''

''نہیں، میں تو ایک عام سا سوال پوچھ رہا ہوں۔''

''اور اس کا عام سا جواب یہ ہے جناب کہ میں محبت کرتی ہوں۔ لیکن یہ وہ جنونی محبت نہیں جس میں گریبان چاک کر لیا جاتا ہے اور سر میں خاک ڈال لی جاتی ہے۔ بس یہ ایک تعلق ہے...... ایک پیارا سا تعلق...... جس میں یہ احساس بھی شامل ہے کہ رشتوں کو نبھایا جانا چاہئے۔ میرے نزدیک یہ احساس میرے پیار سے بھی زیادہ اہم ہے۔''

بس کولمبو کی بھری پری سڑکوں پر رواں تھی۔ یہی لگ رہا تھا جیسے وہ کراچی کے کسی گنجان علاقے میں سفر کر رہے ہوں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں عمارتیں بلند تھیں اور جگہ جگہ پام جھومتے تھے۔

یاسر کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ باتوں باتوں میں اپنے اسٹاپ سے آگے نہ نکل جائیں۔ اس نے اپنے اردگرد بیٹھے افراد میں سے ایک نسبتاً پڑھے لکھے شخص کو مخاطب کیا اور کہا۔

''ہمیں دہی والا جنکشن پر اترنا ہے، بتا دیجئے گا۔''

''اس نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔ ''مجھے پہلے ہی اتر جانا ہے لیکن میں آپ کا انتظام کر دیتا ہوں۔''

اس نے قریب بیٹھے ایک شخص کو ان کے اسٹاپ کے بارے میں بتایا...... پھر تاکید مزید کے طور پر ایک اور شخص کو بھی آگاہ کر دیا۔ اس دوران میں کنڈیکٹر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یاسر کی مزید تسلی کے لئے کنڈیکٹر کو بھی خبردار کر دیا...... جلد ہی آدھی بس کو معلوم ہو چکا تھا کہ یاسر اور کنول کو دہی والا جنکشن پر اترنا ہے۔

یاسر نے جہاں کہیں بھی کسی سے راستہ پوچھا یا مدد طلب کی تھی، مقامی لوگوں کی طرف سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ یہ ذمے داری نبھائی گئی تھی۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا تھا کہ کوئی مہربان سری لنکن اپنا کام چھوڑ کر رہنمائی کے لئے ان کے ساتھ چل پڑا تھا...... اکثریت پڑھے لکھے شائستہ لوگوں کی تھی۔ سیاح حضرات سے ان کا رویہ اور بھی مہربانی کا ہوتا تھا۔

ایک قریب بیٹھے سنہالی سے یاسر کی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ لہٰذا کنول سے گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ جلد ہی وہ لوگ دہی والا جنکشن پہنچ گئے...... یاسر کا خیال تھا کہ یہ کوئی ریلوے جنکشن ہو گا۔ وہ اپنے اردگرد ریل گاڑی اور پٹڑی وغیرہ کو تلاش کرنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' کنول نے دھوپ میں چھتری کھولتے ہوئے کہا۔

''کہیں ہم غلط جگہ تو نہیں اتر گئے...... یہ جنکشن وہی ہے نا؟''

وہ ہنسی۔ ''یہ جنکشن ہی ہے۔ اس کے علاوہ آپ جناب کی اطلاع کے لئے عرض

ہے کہ یہاں ہر بس اسٹاپ کو جنکشن کہا جاتا ہے۔ کم از کم پچیس تیس جنکشنوں سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔''

گرمی کچھ زیادہ تھی۔ ایک راہ گیر سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ انہیں کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا پڑے گا...... اگر وہ پیدل چلنا نہیں چاہتے تو قریبی موڑ سے بس بھی مل سکتی ہے۔''

وہ پیدل چلتے رہے اور ساتھ ساتھ مڑ کر بس کی راہ بھی دیکھتے رہے۔ آخر بس نظر آ گئی۔ وہ لپک کر سوار ہو گئے۔

''کہاں جایئے گا؟'' کنڈیکٹر نے پوچھا۔

''Zoo'' یاسر نے جواب دیا۔

''کتنے ٹکٹ ہیں؟''

''دو ٹکٹ۔''

''اچھا دو روپے دے دیجئے۔''

یاسر نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اتفاقاً 50 روپے والا نوٹ نکلا۔

''ریزگاری دیجئے جناب۔'' کنڈیکٹر بولا۔

''سوری...... ریزگاری تو نہیں ہے۔''

''اچھا آپ اتر جایئے۔'' کنڈیکٹر نے بلا جھجک کہا۔

یاسر کو تھوڑا سا غصہ آیا۔ یہ تو سراسر بداخلاقی تھی۔ اس نے گھور کر کنڈیکٹر کو دیکھا اور حوصلہ جمع کر کے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''میں کہہ رہا ہوں کہ اتر جایئے۔ آپ کا اسٹاپ آ گیا ہے۔''

یاسر کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ دراصل وہ جہاں سے بس پر سوار ہوئے تھے وہاں سے چڑیا گھر کا گیٹ آٹھ نو سو میٹر دور ہو گا۔

بس سے اتر کر وہ ٹکٹ گھر پر پہنچے۔ داخلے کا ٹکٹ 500 روپے تھا...... اور یہ کافی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میوزیم میں بھی ایسی ہی صورت حال پیش آئی تھی۔ یاسر کو ایک بار پھر اپنے دفتر کا ساتھی نعیم عرف نم یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ

سری لنکا میں سیاحوں کی بہت عزت ہے۔ لیکن اس عزت کی کچھ قیمت تفریح گاہوں میں داخلے کے وقت سیاحوں سے وصول کر لی جاتی ہے۔ اب چڑیا گھر کی صورت حال ان کے سامنے تھی۔ مقامی لوگوں کے لئے شرح ٹکٹ 50 روپے جبکہ غیر ملکیوں کے لئے 500 روپے تھی۔ یاسر 500 روپے والا ٹکٹ لینے کے لئے بڑھا مگر کنول نے آنکھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس نے پچاس روپے والے دو ٹکٹ لئے اور یاسر کے ساتھ داخلے کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ حسب اندیشہ انہیں روک لیا گیا۔ باوردی ملازمین نے کہا۔

''آپ غیر ملکی ہیں، آپ نے غلط ٹکٹ لے لیا ہے۔''

کنول کی صحافیانہ مزاحمت پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی اسٹائلش انگریزی میں باوردی ملازمین سے مکالمہ شروع کر دیا۔ سینئر ملازم بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا...... وہ کہہ رہی تھی......

''دیکھئے صاحب! آپ گدھے گھوڑے کو ایک لاٹھی سے مت ہانکیں۔ یہ گورے تو یہاں ڈالر اور پاؤنڈز لے کر آتے ہیں۔ آپ ان سے 500 کی بجائے 5000 بھی وصول کریں گے تو وہ خوشی سے دیں گے...... ہم تو آپ جیسے ہی سفید پوش لوگ ہیں، آپ کے ہاں روپیہ چلتا ہے...... ہمارے ہاں بھی روپیہ ہے...... ہماری معاشی صورت حال بھی ملتی جلتی ہے...... اور پھر محترم! ہم سارک کانفرنس کے حوالے سے آپ کے سارکی بھائی بھی تو ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ زیادتی آپ کو کسی طور زیب نہیں دیتی......''

کچھ تو کنول وزنی دلیلیں، کچھ اس کا رُعب حُسن، باوردی ملازم پزل نظر آنے لگے۔ سینئر ملازم بولا۔

''آپ نے بتایا ہے کہ آپ صحافی ہیں...... آپ کو اپنے پرچے میں اس موضوع پر ضرور لکھنا چاہئے۔ یہ واقعی اہم موضوع ہے۔''

''وہ تو میں لکھوں گی ہی محترم! لیکن فی الحال ہمیں چڑیا گھر دیکھنا ہے۔''

''میں بہت شرمندگی محسوس کر رہا ہوں محترمہ! دراصل یہاں ضابطے سخت ہیں...... Zoo کے اندر بھی انتظامیہ کے لوگ گھومتے رہتے ہیں، وہ آپ کے ٹکٹ چیک کر سکتے

ہیں۔" ملازم نے عذر پیش کیا۔

"ہم نے زیادہ دیر نہیں لگانی ہے۔ بس ایک راؤنڈ لگا کر واپس آ جاتے ہیں۔" یاسر نے بھی اس تحریک مزاحمت میں اپنا حق ادا کیا۔

"بات جلدی یا دیر کی نہیں، اصول کی ہے۔" ملازم منمنایا۔

"تو کیا آپ ہمیں واپس بھیج رہے ہیں؟" کنول نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

ملازم کچھ دیر تک گومگو کی کیفیت میں رہا پھر اس نے کنول کے ہاتھ سے ٹکٹ لے کر چاک کئے اور انہیں داخلے کی اجازت دے دی۔

"شکریہ......" کنول نے کہا۔

"کوئی بات نہیں......بس ذرا جلدی آ جایئے گا۔" ملازم بولا۔

چڑیا گھر وسیع رقبے میں تھا۔ راستے صاف ستھرے تھے اور ہریالی سے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ گھومتے رہے، تصویریں کھینچتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ گھومتے پھرتے کنول کی آنکھوں میں گاہے گاہے ایک متلاشی کیفیت نظر آنے لگتی تھی۔ وہ اردگرد کے ماحول سے کٹ کر کچھ ڈھونڈنے لگتی تھی۔ اس کی یہ کیفیت یاسر شروع سے محسوس کر رہا تھا۔ پہلے یہ کیفیت یاسر کے لئے ناقابل فہم تھی لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ اب وہ جانتا تھا کہ کنول یہاں فقط تفریح کے لئے نہیں آئی، اس کا ایک مقصد ہے۔ وہ اپنے منگیتر کو تلاش کر رہی ہے۔ کچھ پرانے پچھتاوے ہیں جو اسے بھٹکا رہے ہیں۔

وہ بطخوں کے ایک بڑے تالاب کے قریب ہی ایک کیفے میں آ بیٹھے۔ سری لنکن پریمی بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے۔ کچھ فیملیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ کیفے کے عین سامنے بلندی پر ایک جوڑا ہریالی کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ مزید اوٹ فراہم کرنے کے لئے رنگین چھتری بھی ان کے پاس موجود تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" کنول ادا سے بولی۔

"سوچ رہا ہوں کہ اگر یہاں سری لنکا میں گھومتے پھرتے خاور میرے سامنے سے بھی گزر گیا تو میں اسے پہچان نہیں سکوں گا۔"

کنول نے اپنا نفیس شولڈر بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک بے داغ لفافہ نکالا۔ لفافے میں تین چار رنگین تصویریں تھیں۔ یہ خاور کی تھیں۔ گھنگھریالے بال، اونچی

پیشانی، ستواں ناک، ایک نفیس سی عینک اس سے لگا رکھی تھی۔ یہ نظر کی تھی۔ مجموعی طور پر وہ امیرانہ خدوخال والا ایک خوش شکل شخص تھا۔ کوئی بھی لڑکی اس کی طرف مائل ہو سکتی تھی۔ ایک تصویر میں وہ اپنے بہت سارے فوٹو گرافرز کے سامنے بیٹھا تھا۔ قیمتی کیمرا اس کے گلے سے جھول رہا تھا۔ ایک دوسری تصویر میں بھی کیمرا اس کے گلے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی باغ میں بیٹھا تھا۔ تیز ہوا کے سبب اس کے گھنگھریالے اور لمبے بال اس کی پیشانی پر جھول رہے تھے۔ ایک تصویر میں درمیانی عمر کی ایک باوقار عورت اس کے ساتھ تھی۔ عورت کو دیکھتے ہی یاسر سمجھ گیا کہ یہ کنول کی والدہ یا مرحومہ خالہ ہوں گی۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ یہ کنول کی والدہ تھیں۔ انہوں نے بڑی اپنائیت سے خاور کا سر اپنے کندھے سے لگا رکھا تھا۔

یاسر کے دل کی گہرائی سے ایک بے آواز کراہ بلند ہوئی۔ تو یہ ہے خاور...... یہ ہے وہ خوش قسمت شخص جو کنول کی خوشبو سے خود کو معطر کرے گا۔ یہ ہے وہ با نصیب جسے وہ قریہ قریہ ڈھونڈ رہی ہے......

"اگر تم چاہو تو ایک تصویر اپنے پاس رکھ لو۔" کنول نے پیشکش کی۔

"نہیں...... ایسی وجیہ صورت تو ایک بار دیکھ کر ہی ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔" یاسر نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "کیا تمہارے ذہن پر نقش نہیں ہے؟"

اس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ سنبھل کر بولی۔ "ہاں...... نقش تو ہے۔"

"پھر بھی تم محبت سے انکاری ہو۔"

"تم بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہو۔"

"میری بات کا جواب دو نا۔ کیا محبت کچھ نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے......لیکن تم جس محبت کی بات کرتے ہو وہ کچھ اور چیز ہے۔ کسی ایک شخص کے لئے ہر شے کی نفی کر دینا، سارے رشتے ناطوں، جذبوں کو دفن کر دینا، زندگی سے منہ پھیر لینا، موت کو گلے لگا لینا۔ یہ محبت ہی نہیں، وحشت ہو گی، یا جنون ہو گا۔"

"چلو جنوں ہی سہی...... کیا تم نے کبھی یہ جنون محسوس کیا ہے؟"

وہ قدرے شوخی سے بولی۔ "اور اگر یہی سوال...... میں تم سے پوچھوں، کیا تم نے

کبھی یہ جنون محسوس کیا ہے؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہاں...... کیا ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ'' اس نے آنکھیں گھمائیں۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم چھپے رُ
ہو۔ اندر سے کچھ، اوپر سے کچھ...... کون ہے وہ؟''

''ہے نہیں...... تھی۔''

''کک...... کیا مطلب؟''

''وہ دور چلی گئی۔ ملتے ملتے بچھڑ گئی۔''

''اوہ گاڈ...... یہ تو کوئی زبردست قسم کی المیہ کہانی لگ رہی ہے۔ کیا تم مجھے بتا
نہیں رہے؟''

''بتا نہیں رہا ہوں، لیکن تمہیں کچھ بتاؤں گا نہیں...... بلکہ تم سے پیشگی معذر
چاہتا ہوں۔ اس بارے میں مجھ سے کچھ پوچھنا مت...... یہ میرا قطعی ذاتی معا
ہے۔ میں اس میں اپنے سوا کسی کو شریک نہیں کرتا۔''

''یہ تو بڑی زیادتی ہے یاسر۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ میں تم سے پوچھ
چھوڑوں گی۔''

''آئی ایم سوری۔'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔

وہ دیر تک تکرار کرتی رہی، بحث کرتی رہی، اس سے الجھتی رہی......

آخر یاسر نے ہنسنا شروع کر دیا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' وہ اس کی آستین کھینچتے ہوئے بولی۔

''مذاق کی ہر بات کو بے ہودگی نہیں کہا جا سکتا۔ بے ہودہ مذاق اور طرح کا
ہے۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

''تو تم مذاق کر رہے تھے؟''

''کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اچھا مذاق کرنے کے لئے بھی صلاحیت کی ضرورت
ہے۔''

''نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو'' وہ غیر یقینی کیفیت میں اس کے کندھے پر
مارتے ہوئے بولی۔

''جب تم نے طے کر لیا ہے کہ میں جھوٹا ہوں تو پھر ہر بات میں تمہیں جھوٹ ہی نظر آئے گا۔''

کافی کی بھاپ دیتی پیالیوں کے سامنے ان دونوں کے درمیان کافی دیر کشمکش چلتی رہی۔ بالآخر یاسر اسے باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس نے مذاق کیا تھا۔

ٹک شاپ نما کیفے سے اٹھ کر وہ ہاتھیوں کے احاطے کے پاس پہنچے۔ سری لنکا اور ہاتھی دو لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ یہاں ڈیڑھ دو درجن شاندار قسم کے ہاتھی موجود تھے۔ ایک نہایت جسیم ہاتھی خاص طور سے نگاہوں کا مرکز تھا۔ اسے بلاشبہ ہاتھیوں کا سومو پہلوان کہا جا سکتا تھا۔ کنول نے بڑی دلچسپی سے یہاں کئی تصویریں اتاریں۔ اس دوران میں ہاتھیوں کے ایک جوڑے نے فطرت کے مظاہر پر روشنی ڈالنا شروع کر دی۔ اردگرد موجود فیملیاں ''آثار'' دیکھ کر تتر بتر ہو گئیں...... کنول کو بھی اپنا فوٹو سیشن مختصر کرنا پڑا۔

چڑیا گھر سے واپس روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ انہوں نے رکشا پر سفر کیا۔ ''کے ایف سی'' ان کے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ ''کے ایف سی'' پر ہی اتر گئے۔ وہاں سے انہوں نے زنگر برگر کھایا، ساتھ میں فرائڈ فش اور بڑے سائز کی پیپسی...... فی کس 200 سری لنکن روپے خرچ ہوئے...... ایک خوشگوار ماحول میں ایک اچھے لنچ کے لئے یہ بڑی مناسب قیمت تھی۔

وہ ایک دیوار گیر شیشے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ شفاف سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ ہر طرف رنگ برنگ چھتریاں نظر آنے لگیں۔ دھیما میوزک لطف دے رہا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر چند ماڈرن سری لنکن لڑکیاں لڑکے ایک میز کے گرد بیٹھے تھے اور آئس کریم کھا رہے تھے۔ گندمی رنگ کا ایک فربہ اندام لڑکا، گندمی رنگ کی ایک فربہ اندام لیکن خوبرو لڑکی کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ وہ اس کے گھٹنوں پر بیٹھی تھی۔ دونوں تقریباً ہم آغوش نظر آ رہے تھے۔ یاسر کو کچھ دیر پہلے والا ہاتھیوں کا ''جوڑا'' پھر یاد آ گیا۔ شاید اچھا موسم انسانوں اور جانوروں پر ایک جیسا اثر کرتا ہے۔

پام اور ناریل بارش میں جھوم رہے تھے۔ دکانوں کے چھجوں کے نیچے لوگوں کا ہجوم

تھا۔ سکول سے لوٹنے والے بچے بچیاں کثرت سے نظر آ رہے تھے۔ یہاں انہیں سکول کی زیادہ تر بچیاں سفید فراک میں ہی نظر آئی تھیں۔ یہ فراک گھٹنوں سے نیچے تک جاتا تھا۔

سفید لمبی جرابیں، سفید جوگرز، سلیقے سے بندھے ہوئے بال...... دوپٹہ اس لباس کا حصہ نہیں تھا۔ بلکہ دوپٹہ قسم کی شے یہاں کی خواتین کے پاس کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ خال خال کوئی انڈین عورت ساڑھی یا شلوار قمیص میں نظر آتی تھی۔

اچانک یاسر چونک گیا۔ کنول کا ہاتھ یاسر کے ہاتھ پر تھا۔

''میرے ساتھ ہی کینڈی چلو نا یاسر!'' وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

''میں تمہارا ہاتھ تھام کر دنیا کے آخری کونے تک جا سکتا ہوں...... بلکہ اس سے بھی آگے۔'' یاسر نے یہ الفاظ زبان سے نہیں کہے۔ یہ الفاظ اس کے سینے میں گونج کر رہ گئے۔

''بولتے کیوں نہیں؟'' کنول نے اس کے ہاتھ کو جھنجھوڑ کر کہا۔

''کیا بولوں؟''

''میرے ساتھ چلو گے نا؟'' وہ کسی معصوم بچی کی طرح ٹھنکی۔

''میں تمہیں ساری بات بتا تو چکا ہوں کنول! پندرہ تاریخ کو تو میں کسی صورت نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد اگر فارغ ہو گیا اور موڈ بن گیا تو تمہارے پاس آ جاؤں گا۔''

''اور اگر موڈ نہ بنا تو؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر عجیب انداز سے بولی۔

''تو پھر پندرہ تاریخ کی صبح کو خدا حافظ۔''

''تم کتنے کٹھور ہو یاسر......'' وہ ایک دم ناراض نظر آنے لگی۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا تھا۔

دونوں ہی ایک دم اُداس نظر آنے لگے۔ کھڑکی سے باہر برستی بارش، جھومتے ناریل، رنگین چھتریاں، سبھی کچھ اداس ہو گیا۔

دونوں ہی اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئے تھے، کہیں کھو گئے تھے۔ بارش تھم گئی۔ وہ باہر نکل آئے۔ گیلی سڑک پر خاموشی سے چلتے چلے گئے۔ یاسر ایک دُکان پر رک گیا۔ یہاں زنانہ استعمال کی بہت سی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ اسے اپنی بہن شمائلہ کے لئے

کچھ لے کر جانا تھا۔

وہ چیزوں پر طائرانہ نظر ڈالنے لگا۔ کنگن، چوڑیاں، جیولری، کپڑے، کافی ورائٹی تھی۔ اس نے کنول سے مشورہ کرنے کے لئے عقب میں دیکھا لیکن وہ تو وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ چلتی چلتی کافی آگے نکل گئی تھی۔ ہوٹل میپون اس سے بس پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہ بالکل کھوئی کھوئی سی چلتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا جیسے اسے پتہ ہی نہ ہو کہ یاسر اس کے ساتھ نہیں آ رہا۔ یاسر کو موجود نہ پا کر وہ کھڑی ہو گئی اور یاسر کا انتظار کرنے لگی۔

وہ قریب آ کر بولا۔ ''تم اچھی ہمسفر نہیں ہو۔ مڑ کر دیکھتی بھی نہیں ہو کہ کوئی ساتھ آ رہا ہے یا نہیں۔''

''تم بھی اچھے دوست نہیں ہو۔ چلتے چلتے ساتھ چھوڑ دیتے ہو۔''

ہوا میں ٹھنڈک آ گئی تھی۔ ہوٹل کے عین سامنے گرجا گھر میں مومی شمعیں گردش کر رہی تھیں۔ تکہ شاپ والا لڑکا شریر نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پاس سے گزرے تو اس نے حسب معمول انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ اس کے چکن تکے اور چکن پیس پورے کولمبو بلکہ پورے سری لنکا میں نمبر ون ہیں۔ یاسر نے سرد مہری سے جواب دیا تو وہ ذرا جھینپ کر اپنی کڑاہی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اپنے اپنے کمرے میں جا کر دونوں سو گئے۔ بڑی اُداس سی شام تھی۔ شام آٹھ بجے کے لگ بھگ یاسر جاگا۔ کنول کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اکیلا ہی چہل قدمی کے لئے نکل گیا۔ وہ دوبارہ اسی شاپ پر پہنچا جہاں اس نے گفٹ آئٹمز دیکھے تھے۔ اسے ایک چیز بہت پسند آئی تھی، بہت ہی زیادہ...... وہ یہ چیز کسی کے لئے خریدنا چاہتا تھا، ایک تحفہ جو کسی کو دیر تک اس کی یاد دلاتا رہے......!



یہ جمعے کی شام تھی۔ دو دن بعد کنول کو کینڈی چلے جانا تھا۔ موسم اچھا تھا۔ ہر شے نکھری ہوئی تھی۔ یاسر نے اپنے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ کولمبو کی ہزارہا آنکھیں ایک ایک کر کے روشن ہوتی جا رہی تھیں۔ آج دوپہر کنول اپنے کسی کام سے گئی تھی۔ وہاں سے شاپنگ کرتی ہوئی وہ شام سے تھوڑی دیر پہلے واپس آئی تھی۔ جب سے یاسر نے اسے دوٹوک لفظوں میں بتایا تھا کہ وہ اس کے ہمراہ کینڈی نہیں جا سکتا وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ درحقیقت ان چند دنوں میں ہی وہ ایک دوجے کے کافی عادی ہو گئے تھے۔

یاسر سوچ رہا تھا، قریباً ڈھائی دن بعد وہ ایک دوسرے سے دور چلے جائیں گے ...... وہ کینڈی جائے گی، وہاں سے انڈیا چلی جائے گی ...... وہ کینڈی نہ جا سکا تو پھر شاید یہیں سے پاکستان چلا جائے۔ دونوں کے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ ہو گا سرحدیں ہوں گی۔ کون جانے پھر کبھی ملنا ہو بھی یا نہیں ...... اور اگر ہو تو کس عالم میں ہو۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نا یہ آخری دو دن اچھے طریقے سے گزار لئے جائیں۔ ان دو دنوں کو دو پھولوں کی طرح دل کی کتاب میں بند کر لیا جائے ...... پھر جب بھی ان کو دیکھا جائے، یادوں کے رنگ آنکھوں میں آنسو لے آئیں۔ میٹھے میٹھے درد والے آنسو۔

اس نے باہر نکل کر کنول کے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ وہ اپنے لمبے بالوں کو جوڑے کی شکل میں سمیٹتی ہوئی باہر نکل آئی۔ وہ ابھی ابھی نہائی تھی۔ بال ہنوز گیلے تھے۔ ایک ہلکا سا گاؤن اس نے پہن رکھا تھا، وہ کہیں کہیں سے نم تھا اور جسم کی رنگت کو نمایاں کرتا تھا۔ گردن سے نیچے گاؤن کی ڈوریاں خطرناک حد تک ڈھیلی تھیں۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اپنی حشر سامانی سے بے خبر تھی۔ یہ بڑی فطری اور بے ساختہ بے خبری تھی۔ یاسر اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

"آؤ چائے پئیں۔"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی اور جس حالت میں تھی اسی میں باہر آ گئی۔ دونوں یاسر کے کمرے میں آ بیٹھے۔ یاسر نے روم سروس کو کال کیا۔ چائے، پیسٹری اور آلو کے چپس منگوائے۔ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جلد ہی کنول کی بجھی ہوئی سی خاموشی دلچسپ فقروں اور مسکراہٹوں میں بدل گئی۔ شاید وہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ انہیں "اپنے ساتھ" کے یہ آخری دن یوں بجھے بجھے انداز میں نہیں گزارنے چاہئیں۔

"کیا ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہیں کچھ دے سکتا ہوں؟" یاسر نے اچانک اس سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ کسی گڑیا کی طرح آنکھیں جھپک کر بولی۔

"مم...... میں کچھ لایا تھا تمہارے لئے۔"

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی، پھر کھلکھلا کر ہنسی اور کہنے لگی۔ "یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے؟"

یاسر الماری کی طرف گیا، دراز کھولی اور ایک لفافہ نکال لیا۔ لفافے میں ایک ہیئر کلپ تھا۔ یہ بہت خوبصورت اور اچھوتے ڈیزائن کی چیز تھی...... سری لنکا کا نقشہ ڈائمنڈ کی طرح ہے۔ بعض لوگ اسے انڈیا کا آنسو بھی کہتے ہیں۔ یہ ہیئر کلپ بعینہٖ سری لنکا کے نقشے کی طرح تھا۔ اس میں دو چار جگہ ننھے ننھے ڈائمنڈ بھی استعمال کئے گئے تھے۔ یہ مہین ڈائمنڈ سنہرے پس منظر میں ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔ یہ ہیئر کلپ بہت زیادہ قیمتی نہیں تھا لیکن اگر اس کے "آرٹسٹک ٹچ" اور تخلیقی حسن کو دیکھا جاتا تو یہ بہت قیمتی تھا۔ یہ کلپ یاسر نے پرسوں گفٹ شاپ سے اٹھائیس سو سری لنکن روپے میں خریدا تھا۔

اس نے لرزتے ہاتھوں سے کلپ کی سرخ ڈبیا کنول کی طرف بڑھائی۔

"ایک دوست کی طرف سے۔" اس نے بمشکل کہا۔

کنول کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکیں۔ اس نے بڑے اشتیاق سے ڈبیا کھول کر کلپ نکال لیا۔

"بہت سندر...... بہت پیارا...... ونڈرفل۔" اس نے کلپ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"تھینک یو یاسر! تھینک یو ویری مچ۔" وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی۔

وہ خاموش کھڑا تھا۔ اس کے ساکت جسم میں دل ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ کنول نے بچوں جیسے شوق سے کہا۔

"یہ تمہیں لگا کر دکھاؤں؟"

یاسر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کنول نے فوراً وہیں پر اپنا "ہیئر کیچر" کھول دیا۔ لمبے ریشمی بال اس کی کمر پر بکھر گئے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے برش پکڑا، ایک دو بار اسے بالوں میں پھیرا، بال بالکل سیدھے اور سلجھے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ آئینے کے سامنے ذرا ترچھے انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے بالوں کو بل دے کر جوڑے کی شکل بنائی اور پھر انہیں کلپ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کلپ کا میکنزم ذرا مشکل تھا اور نیا بھی تھا۔ کنول کو دشواری پیش آ رہی تھی۔

"کیا تم میری مدد کرو گے؟" اس نے یاسر سے کہا۔

یاسر چند لمحے ساکت و جامد کھڑا رہا، پھر کنول کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"تھوڑا سا ترچھا ہے...... پلیز ذرا اسے لیول کرو۔ اور ذرا نیچے بھی۔"

اس کے حسین بال یاسر کے ہاتھوں میں تھے۔ اس نے کلپ کو نیچے کھسکانے کی کوشش کی تو جوڑا کھل گیا جیسے کسی پھولدار شاخ کو ہلایا جائے اور بہت سے مہکتے پھول جھولی میں آ گریں۔ کنول کے مہکتے بال بھی یاسر کے ہاتھوں اور بازوؤں پر بکھر گئے۔ کنول نے پھر جوڑا باندھا اور یاسر کی مدد سے کلپ کو صحیح جگہ پر لگایا۔ کلپ صحیح جگہ بیٹھ گیا تو اس نے پورا گھوم کر آئینے میں دیکھا اور چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما گیا۔

"کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

یاسر اس کے ادھ کھلے گریبان کی ڈوریوں سے نگاہیں چراتے ہوئے بولا۔ "بہت خوب۔"

ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ براہِ راست یاسر کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

"لیکن تمہیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے گی۔" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟"

وہ ہولے سے مسکرائی۔ "میں بھی تمہارے لئے کچھ لائی ہوں...... کسی نے درست کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ تم نے میرے بارے میں سوچا اور میں نے تمہارے بارے میں۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپر تھا۔ شاپر میں گتے کا خوبصورت ڈبہ تھا اور ڈبے میں ایک نہایت نفیس شرٹ۔ یہ شرٹ کسی مہنگی دکان سے مہنگے داموں خریدی گئی تھی۔

"شکریہ...... بہت پیاری ہے۔" یاسر نے کہا۔

"اور مجھے وشواس ہے کہ تمہیں پوری بھی ہو گی۔ تمہاری شرٹ کا نمبر 16 ہے نا...... میں نے پرسوں استری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

یاسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کہنے لگی۔ "اب تم بھی مجھے یہ پہن کر دکھاؤ۔"

یاسر چند لمحے تذبذب میں رہا، پھر بولا۔ "اچھا...... کل......"

"آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہئے۔ چلو اچھے بچوں کی طرح واش روم میں چلے جاؤ۔" وہ اسے باقاعدہ دھکیلتے ہوئے بولی۔

یاسر نے اسے ٹالنا چاہا لیکن وہ ٹلنے والی نہیں تھی۔ مجبوراً یاسر نے شرٹ پہنی۔ اسے کنول کے اندازے کی داد دینا پڑی۔ شرٹ کا سائز بہت مناسب تھا۔ وہ باہر نکلا تو کنول نے اپنے ریشمی ہاتھ سے شرٹ کی سلوٹیں وغیرہ درست کیں۔

"یو آر لکنگ اسمارٹ۔" اس نے کہا۔

وہ جھینپ سا گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ کوئی بھی بات دل میں رکھتی نہیں تھی۔ جو کچھ بھی محسوس کرتی تھی زبان پر لے آتی تھی۔ اس نے سیاہ بالوں میں چمکتے ہوئے کلپ کو دیکھا، اس نے نیچے صراحی دار گردن کو دیکھا...... اور لاپرواہی سے باندھی گئی ڈوریوں کو دیکھا اور اس کا دل چاہا کہ وہ بھی ان معنوں میں "سچ" بول سکے جن معنوں میں کنول سچ کو سچ کہتی ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔ وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک دم یاسر کو محسوس ہوا کہ کنول کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے ستارے بجھ سے گئے

ہیں...... وہ چپ ہوگئی تھی۔ یاسر نے سوچا وہ بھی اس کے منہ سے کسی تعریفی جملے کی امید رکھتی تھی......

"کیا بات ہے...... چپ ہوگئی ہو؟" یاسر نے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں، کہیں ہم ایک دوسرے کو الوداع کہنے کی تیاری تو نہیں کر رہے؟"

"کیا مطلب؟"

"تم نے مجھے تحفہ کیوں دیا...... تحفہ تو اس وقت دیا جاتا ہے جب رخصت ہونا ہو۔"

"ہم نے بھی تو رخصت ہونا ہے۔ سوموار کی صبح تم کینڈی چلی جاؤ گی...... میں شاید واپس پاکستان چلا جاؤں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم کینڈی نہیں جاؤ گے۔"

"میں نے کہا نا کہ اس بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سوموار کو آفس جانے کے بعد ہی اصل صورتحال کا پتہ چلے گا۔"

"ایک تو تمہارے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ تم کھل کر بات نہیں کرتے ہو۔ دل میں کچھ اور ہوتا ہے، کہتے کچھ اور ہو...... مجھے تو لگتا ہے کہ آفس کے کام کا تم بس بہانہ ہی بنا رہے ہو۔"

"جھوٹا شخص جھوٹ نہیں بولے گا تو اور کیا کرے گا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"ٹھیک ہے...... تم کرتے رہو مذاق...... میں سونے جا رہی ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کا موڈ آف نظر آنے لگا تھا۔

وہ دروازے کی طرف گئی لیکن پھر واپس آ گئی۔ یاسر کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آخر تم بتا کیوں نہیں دیتے ہو کہ کیا پروگرام ہے تمہارا...... چار دن پہلے تک تم یہ کہتے رہے ہو کہ آفس کا کام تقریباً مکمل ہے...... اور تم کینڈی ضرور جاؤ گے کیونکہ تمہیں کینڈی دیکھنے کا بڑا شوق ہے...... اب اچانک تم نے کانٹا بدل دیا ہے۔ کیا...... کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے کنول۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"آفس کا کام تھوڑا سا ہی ہے، لیکن اس کی نوعیت ایسی ہے کہ لمبا ہو سکتا ہے۔ پرسوں ہیماننتھا صاحب کا پھر فون آیا تھا۔ یہ وہی صاحب ہیں جو مجھ سے یہاں کام کروا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فالٹ کی ابتدائی وجہ ٹریس کی جائے۔ اور عارضی بندوبست کی بجائے سسٹم کو مجموعی طور پر قابل بھروسہ بنایا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو بالکل مطمئن کرنے کے بعد یہاں سے جاؤں۔"

"اچھا...... پھر مجھ سے وعدہ کرو، کام مکمل کر کے کینڈی ضرور آؤ گے۔"

یاسر نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے...... اگر تین چار دن کے اندر یہاں سے فارغ ہوگیا تو ضرور آ جاؤں گا۔ لیکن اگر اس سے زیادہ ٹائم لگا تو پھر واپس جانا میری مجبوری ہوگی۔"

"تم پرامس کرتے ہو؟"

"ہاں...... پرامس۔" یاسر نے کہا۔

"اوہ، میرا خیال ہے کہ فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔" کنول نے کان کھڑے کرتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

یقیناً اسی کا فون تھا۔ اس کی واپسی دس منٹ سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔

"کون تھا......؟" یاسر نے پوچھا۔

"بڑی دیدی۔" اس نے رسان سے کہا۔

"بڑی دیدی؟ یہ کون محترمہ ہیں؟"

وہ مسکرائی۔ "ان کا نام آشا ہے۔ یہ لوگ بنگلور میں پچھلے دس بارہ سال سے ہمارے پڑوسی ہیں۔ بڑی اچھی فیملی ہیں۔ ان سے ہمارے گھریلو تعلقات ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ اپنوں سے بڑھ کر اپنے ہیں یہ سب...... بڑی دیدی کے والد انکل سرجیت، ابا جان کے گہرے دوست تھے اور اسی بینک میں کام کرتے تھے جس میں ابا جان نے سروس کی۔ پانچ سال پہلے بڑی دیدی کی شادی ہوئی اور وہ سری لنکا چلی آئیں۔ وہ یہاں کینڈی میں رہتی ہیں۔ کینڈی میں ان کے پاس ہی ٹھہروں گی۔ ان کے شوہر یہاں ہسپتال میں ریڈیالوجسٹ ہیں اور بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ابھی ان کا فون ہی آیا تھا۔ پوچھ رہے تھے کہ میں کس ٹرین سے آ رہی ہوں۔"

"کیا بتایا تم نے؟"

"یہی کہ سوموار کی صبح سات بجے والی ٹرین سے۔" کنول نے کہا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولی۔ "چاچو بتا رہے تھے کہ بڑی دیدی کا گھر کینڈی میں جھیل کے کنارے پر ہے۔ بلندی سے جھیل اور آس پاس کا سارا علاقہ اتنا خوبصورت نظر آتا ہے کہ دیکھ دیکھ کر جی نہیں بھرتا۔ ان کا گھر بھی کافی کشادہ ہے۔ میں تو کہوں گی، تم کینڈی آؤ تو ہمارے ساتھ ہی ٹھہرنا۔ سچ، مزا آ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے......" یاسر نے مختصر جواب دیا۔

"تمہارے آنے تک میں تمہارے لئے ایک کمرا تیار کروا چھوڑوں گی۔ وشواس کرو تمہیں وہاں بالکل اجنبیت محسوس نہیں ہوگی۔ بڑی دیدی اور کمار بھائی اتنے اچھے ہیں کہ تم گرویدہ ہو جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے...... جیسے تم کہو گی۔"

"جب تم مختصر سا جواب دیتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ تم گڑبڑ کرو گے۔"

"میں وہی کروں گا جو تم نے ابھی کہا ہے۔ کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔ گڑبڑ تم کر رہی ہو، وقت سے پہلے ہی اندیشوں میں مبتلا ہو کر۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہم خواہ مخواہ کل کی فکر میں دبلے ہو رہے ہیں اور اپنے "آج" کو بھی خراب کر رہے ہیں۔ ابھی تمہاری روانگی میں پورے دو دن باقی ہیں۔ کل کا پورا دن اور پرسوں یعنی اتوار کا بھی پورا دن۔ ان دو دنوں میں ہم گھومتے پھرتے ہیں۔ خاور صاحب کو تلاش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ کچھ اچھی یادیں بھی سمیٹتے ہیں۔ کیوں نہ کل ہم ایک بار پھر گال فیس روڈ چلیں۔ مجھے یہ جگہ پسند آئی ہے۔"

"امبریلا لو کی وجہ سے؟" وہ شوخی سے بولی۔

"ضروری نہیں کہ کسی جگہ یا شخص کے پسند آنے کی کوئی وجہ بھی ہو۔"

"یہ تو خالص رومانوی طرزِ فکر ہے۔ ہر کام اور کیفیت کا کوئی سبب ہوتا ہے...... اور پھر اس کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔"

"کئی کام ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی سبب نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کا کوئی نتیجہ نکلتا

ہے۔" یاسر کے لہجے میں نہ چاہنے کے باوجود اداسی در آئی۔

"تم...... تم بڑے الجھے الجھے سے ہو یاسر...... ہر وقت کچھ نہ کچھ چھپاتے رہتے ہو۔ کبھی کبھی تو تکلیف دہ ہو جاتے ہو...... لیکن......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"لیکن کیا......؟" یاسر نے پوچھا۔

وہ ادا سے مسکرائی۔ "لیکن پھر بھی اچھے لگتے ہو۔ اپنے اپنے سے...... تمہارے ساتھ رہنے کو دل چاہتا ہے...... تم سے باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"اور کیا دل چاہتا ہے؟"

"تمہارے ساتھ گھومنے پھرنے کو، تمہارے ساتھ ہنسنے بولنے کو۔"

"اور......؟" یاسر نے پوچھا۔

"اور...... اور...... تمہیں اپنے ساتھ کینڈی لے جانے کو۔" اس نے شوخی سے کہا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

ہنستے ہوئے اس کی گردن میں دلکش گڑھا پڑتا تھا۔ اس گڑھے سے نیچے گاؤن کی الجھی سلجھی ڈوریاں تھیں۔ نصف آستینوں سے آگے کنول کی نرم ملائم بانہیں مومی شمعوں کی طرح روشن روشن نظر آتی تھیں۔ خوبصورت اور مقدس...... کسی عبادت گاہ کی پاکیزہ روشنی کی طرح۔ اس نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا، گرجا گھر کے احاطے میں بھی مومی شمعیں گردش کر رہی تھیں۔ اپنی اپنی تمنائیں، اپنے اپنے غم...... اور اپنے اپنے شکرانے لئے لوگ احاطے میں داخل ہو رہے تھے، آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ ایک نوجوان لکڑی کے بینچوں پر گھٹنوں کے بل گرا ہوا تھا۔ ایک لڑکی شمعوں کے ساتھ بے حرکت کھڑی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت مراقبے کی سی حالت میں بیٹھی تھی۔ احاطے سے باہر کی دنیا اور تھی، احاطے کے اندر کی دنیا اور تھی۔ احاطے سے باہر تمنائیں پالی جا رہی تھیں، احاطے کے اندر معافیاں مانگی جا رہی تھیں، مرادیں مانگی جا رہی تھیں۔ احاطے سے باہر ہیپون ہوٹل کے اس کمرے میں بھی شاید کوئی شخص تمنا پال رہا تھا، غلطی کر رہا تھا۔

اگلے روز پروگرام کے مطابق وہ ناشتے کے بعد سیدھے گال فیس روڈ پہنچ گئے۔ وہ

قریباً دو گھنٹے تک وہاں گھومتے رہے۔ امبریلا لو کے مناظر جوں کے توں تھے..... سمندر کا شور بھی وہی تھا۔ ہوا میں ڈولتی پتنگیں بھی وہی تھیں...... اور محمد نذیر بھی وہی تھا۔ کنول نے محمد نذیر سے کینڈی جانے والی ٹرین کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں، اس کا ایڈریس لیا، اس کو اپنا ایڈریس دیا۔ پھر وہ پتنگ باز کے پاس چلی گئی۔ اس کے ساتھ بھی گرم جوشی سے ملی۔ اس کے پاس خاور کی ایک پاسپورٹ سائز تصویر کی کئی کاپیاں بھی تھیں۔ اس نے ایک کاپی محمد نذیر کو بھی دی۔

وہ ہر اہم اور غیر اہم شخص کے ساتھ ایک جیسی گرم جوشی سے ملتی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ اسے برسوں سے جانتی ہے۔ میدان میں اسپیشل پولیس فورس کا ایک دستہ پریڈ میں مصروف تھا۔ دستے کا انچارج ایک درمیانی عمر کا سنہالی تھا۔ پچھلی دفعہ کنول نے اس کا بھی مختصر انٹرویو لیا تھا۔ آج کنول کو دوبارہ ساحل پر دیکھ کر انچارج اس کے پاس چلا آیا اور خیر خیریت دریافت کرنے لگا۔ پچھلی ملاقات میں کنول نے اسے بھی خاور کی ایک تصویر دی تھی۔ انچارج بے حد شائستہ شخص تھا۔ وہ کنول سے اس کے گمشدہ منگیتر کے حوالے سے بات کرنے لگا۔ اس کا انداز تسلی تشفی کا تھا۔ یاسر کو یہ شخص پاکستانی پولیس افسران سے یکسر مختلف نظر آیا۔

جس دوران میں یاسر اور کنول پولیس آفیسر کے پاس کھڑے تھے، پتنگ باز لڑکا جھجکتا ہوا ان کے پاس آن کھڑا ہوا۔ جب پولیس آفیسر اپنے دستے کی طرف واپس چلا گیا تو لڑکے نے دو خوبصورت پتنگیں کنول کی طرف بڑھاتے ہوئے کچھ کہا۔ وہ مقامی زبان میں انگریزی کے دو چار لفظ مکس کر کے بول رہا تھا۔ کافی کوشش کے بعد پتہ چلا کہ وہ یہ خوش رنگ پتنگیں کنول کو تحفے کے طور پر پیش کر رہا ہے۔

وہ بولی۔ ''میں کینڈی جا رہی ہوں۔ یہ تو راستے میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔ میں انہیں رکھوں گی کہاں؟''

پتنگ والے نے مسکرا کر سر ہلایا اور دونوں پتنگوں کو کپڑے کی طرح یوں تہ کیا کہ وہ بالکل مختصر ہو کر رہ گئیں۔ اس نے ان کی تسلی کے لئے پتنگوں کو دوبارہ کھول کر دکھایا اور پھر سے تہ کر کے چھوٹے سے شاپر میں بند کر دیا۔ پتنگوں کی ایسی ڈاؤن سائزنگ کا نظارہ یاسر نے پہلی بار کیا تھا۔ کنول اور یاسر نے اسے قیمت دینے کی بہت کوشش

کی لیکن وہ انکاری رہا۔ پھر اس خطرے سے کہ وہ ناراض ہی نہ ہو جائے وہ دونوں چپ ہو گئے۔

اپنے پسندیدہ ''کرس کیٹ'' سے لنچ کرنے کے بعد وہ ہوٹل واپس آ گئے۔ کنول اچھے پھل کی شوقین تھی۔ کرس کیٹ سے نکلتے ہوئے اسے نچلے فلور پر ایک نئی چیز نظر آ گئی تھی۔ یہ خوبانی کے سائز کے ننھے منے کینو تھے۔ یاسر اور کنول کا خیال تھا کہ یہ ''منی کینو'' شاید ترش ہوں گے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ بے حد شیریں اور خوشبودار تھے۔ انہوں نے ڈیڑھ کلو لے لئے۔ ہوٹل واپس پہنچ کر وہ چھیلتے رہے اور کھاتے رہے۔ کنول بولی۔

''جب تم لاہور پہنچ کر بتاؤ گے کہ تم نے ہوٹل کے کمرے میں پندرہ منٹ کے اندر تیس کے قریب کینو کھا لئے تھے تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔''

یاسر بولا۔ ''اور اگر میں نے یہ بتایا کہ میرے ساتھ ایک لڑکی نے بھی قریباً اتنے ہی کھائے تھے تو وہ بالکل بھی یقین نہیں کریں گے۔''

''کیوں، اگر تم کھا سکتے ہو تو لڑکی کیوں نہیں کھا سکتی۔''

''لڑکی کھا سکتی ہے لیکن وہ میرے کمرے میں نہیں ہو سکتی۔''

کنول قہقہہ مار کر ہنس دی۔

شام کو پروگرام کے مطابق انہیں شائن کلب جانا تھا۔ وہ شام کی چائے پی کر سات بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد وہ شائن کلب میں تھے۔ ان کے اندازے کے برخلاف یہ ایک خاصی غیر سنجیدہ جگہ تھی۔ چند سیڑھیاں اتر کر وہ ایک کشادہ بیسمنٹ میں پہنچے۔ یہاں الکحل کی بُو تھی، تیز میوزک تھا اور دعوتِ عیش دینے والی لڑکیاں تتلیوں کی طرح منڈلاتی پھر رہی تھیں۔ ایک کونے میں بار بھی بنا ہوا تھا۔ یہاں کچھ امیر زادے مے نوشی اور ہم آغوشی میں مصروف تھے۔ یاسر کو ان غیر شائستہ مناظر نے اپ سیٹ کیا۔ کنول کے چہرے پر بھی ناپسندیدگی کی شکنیں نظر آئیں۔ ہال میں ایک جانب چھوٹی سی پارٹیشن کھڑی کی گئی تھی۔ فوٹو گرافر خواتین و حضرات اس پارٹیشن کی دوسری جانب جمع تھے۔ فوٹو گرافرز کی محفل میں بھی پیمانے گردش کر رہے تھے اور بار بار قہقہے گونجتے تھے۔ کنول اور یاسر ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئے۔ ان

کے عین سامنے کلب کی چند تتلیاں محو رقص تھیں۔ ان میں سے بیشتر نے سفید رنگ کی نہایت چست پتلونیں اور سرخ شرٹس پہن رکھی تھیں۔ رقص کرتے ہوئے وہ آپس میں اٹکھیلیاں بھی کرتی تھیں۔ ایک محو رقص لڑکی جس کی انگلیوں میں سگریٹ بھی دبا ہوا تھا، ان کے قریب آئی اور بولی۔

"کسی چیز کی ضرورت ہے جناب؟"

"صرف دو کوک۔" یاسر نے جلدی سے کہا۔

وہ انہیں ذرا حیرت سے دیکھتی ہوئی بار کی طرف چلی گئی اور کوک لے آئی۔

"یہ کہاں لے آئی ہو؟" یاسر بڑبڑایا۔

"مجبوری ہے بھئی۔ کوئی شوق سے تو نہیں آئے۔"

اس دوران میں ایک دروازے سے سانولے رنگ کا ایک فربہ اندام شخص برآمد ہوا۔ اس کی پتلون بڑھی ہوئی توند سے نیچے پتہ نہیں کہاں اور کیونکر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کنول کے ساتھ گرم جوشی سے ملا۔ معلوم ہوا کہ یہی عبدالواحد صاحب ہیں۔ عبدالواحد پانچ دس منٹ کنول اور یاسر کے ساتھ بیٹھا، پھر وہ کنول کو لے کر فوٹو گرافرز کی محفل کی طرف چلا گیا۔ وہ یاسر کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن یاسر کنی کترا گیا۔

کنول کے جانے کے بعد یاسر میز پر اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ تتلیاں اس کے اردگرد منڈلا رہی تھیں، اٹکھیلیوں میں مصروف تھیں۔ جونہی کوئی امیر زادہ ہاتھ میں داخلے کا ٹکٹ تھامے سیڑھیاں اترتا تھا، کوئی ایک لڑکی آگے بڑھ کر اسے انگیج کر لیتی تھی۔ اس کے بعد ہر قسم کی "سروس" وہ لڑکی ہی اسے مہیا کرتی تھی۔ جس رنگین تتلی نے یاسر اور کنول کو سروس دی تھی، اس نے اب ان کی میز کی طرف خصوصی توجہ رکھی ہوئی تھی۔ خاص طور سے کنول کے جانے کے بعد اس کی توجہ زیادہ معنی خیز ہو گئی تھی۔ دورانِ رقص وہ گاہے گاہے مسکراتی ہوئی سوالیہ نظروں سے یاسر کو دیکھتی تھی جیسے کہہ رہی ہو

"کاٹھ کے الّو! تیرے اشارے کی منتظر ہوں۔ کہو تو وہسکی کی بوتل کھول دوں...... کہو تو خود کھل جاؤں۔"

غالباً لڑکی نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ یاسر کے ساتھ "آنے والی" ابھی کلب میں ہی موجود ہے۔ وہ رقص کرتے کرتے یاسر کے قریب آئی اور بولی۔

"کسی چیز کی ضرورت جناب؟"

"کسی چیز" کے الفاظ میں اس نے ہزار ہا معنی سمو دیئے تھے۔ یاسر نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اپنے جسم کے مختلف حصوں کو واہیات انداز میں اچھالتی اور تھرکاتی ہوئی اپنی ناچتی گاتی ٹولی میں واپس چلی گئی۔

پتہ نہیں کیوں، یاسر کو کراہت محسوس ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر چلا جائے۔ مگر اس دوران میں اسے کنول نظر آ گئی۔ اس کے ساتھ عبدالواحد کے علاوہ ایک سری لنکن صحافی بھی تھا۔ دونوں زینوں سے اترے اور ہال میں ایک جانب بیٹھ گئے۔ کنول نے دور سے یاسر کی بیزار صورت دیکھی تو ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ بس دو چار منٹ کی بات ہے، پھر چلتے ہیں۔

اچانک یاسر کو اپنے بالکل قریب خوشبو کا جھونکا محسوس ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی اس کے بائیں کان میں ایک تیز آواز داخل ہوئی بالکل جیسے فون کی گھنٹی بجے۔ لیکن یہ آواز گھنٹی کی نہیں تھی، ایک لڑکی کی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ یاسر کے کان سے قریب تر کرتے ہوئے منہ سے "ترررر" کی طویل آواز نکالی تھی۔ آواز کو زیادہ تیز نہیں تھی مگر کان سے بالکل قریب پیدا کی گئی تھی لہٰذا یاسر کے پورے دماغ میں گونج گئی۔ اس کے ساتھ ہی کان کے اندر شدید گدگدی کا احساس ہوا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ایک دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔ یہ لڑکی دیگر تتلیوں سے دلکش نظر آ رہی تھی۔ یاسر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ احتجاج کرے یا خود بھی مسکرا دے۔ اس ادھیڑ بُن میں وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ لڑکی یاسر کی طرف جگر پاش نظروں سے دیکھتی رہی، پھر دوسری لڑکیوں سے چہلیں کرنے لگی۔

یاسر نے اندازہ لگایا کہ یہاں کے ماحول میں شرارت کا ایک انداز ہے یا شاید کوئی مقامی رواج۔ اس کے کان میں ابھی تک کھجلی ہو رہی تھی۔

اسی دوران میں یاسر کی نگاہ اس گوشے کی طرف اٹھ گئی جہاں کنول بیٹھی تھی۔ کنول نے یاسر کے ساتھ ہونے والی شرارت کا نظارہ کیا تھا۔ وہ دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ یاسر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

یاسر کی کوک اختتام پذیر ہوئے دس پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ جس دوران میں اس

نے 300 ''ملی لیٹر'' کی ایک کوک پی تھی اس دوران میں دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے مقامی امیرزادے ہزاروں کی شراب پی گئے تھے۔ یاسر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس قسم کے کلبوں میں اشیائے خورد و نوش کی قیمت ساتویں آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ سامنے کاؤنٹر پر بڑے شاندار سے فنگر چپس موجود تھے لیکن وہ آرڈر دینے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

شاید وہ اٹھ ہی جاتا لیکن اس اثناء میں اسے کنول اپنی طرف آتی نظر آئی۔ شولڈر بیگ میز پر رکھ کر وہ یاسر کے عین سامنے بیٹھ گئی۔

''ویری سوری...... مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ دراصل عبدالواحد کے ایک مقامی دوست کے پاس سری لنکن اور انڈین فوٹو گرافرز کی ایک ڈائریکٹری تھی۔ ہم اس ڈائریکٹری کی ورق گردانی کرتے رہے۔''

''پھر...... کچھ کھوج ملا؟'' یاسر نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ نجانے کیوں اس کے اندر عجیب سی کیفیت تھی۔ کنول سے ہمدردی رکھنے کے باوجود اس کے اندر کہیں گہرائی میں یہ خواہش دبی ہوئی تھی کہ کنول کو خاور کا کوئی کھوج نہ ملا ہو۔

کنول نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ڈائریکٹری میں خاور نام کا ایک پریس فوٹو گرافر تو موجود ہے لیکن وہ سری لنکن مسلمان ہے۔ عمر اور ولدیت بھی مختلف ہے۔''

''اور کس سے ملاقات ہوئی؟''

''اس انجمن کے صدر سے۔ انہوں نے اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا ہے۔ ایک اچھی خبر بھی ان کے ذریعے سے ملی ہے۔''

''کیسی خبر؟'' یاسر کا دل ایک بار پھر دھڑک اٹھا۔

''ان کا خیال ہے کہ انہوں نے تقریباً دو ماہ پہلے خاور اور اس کے ایک دوست کو یہاں شائن کلب میں دیکھا ہے۔ وہ دونوں کسی انگریزی میگزین کے لئے کچھ تصویریں خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ صدر صاحب کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے وہ اس ''پرچیزنگ'' کے سلسلے میں پھر ان سے رابطہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو وہ مجھے فوراً کینڈی کے پتے پر اطلاع کریں گے...... میں خاور کی تصویر انہیں دے آئی ہوں۔ اس کے

علاوہ کینڈی میں کمار بھائی کے فون نمبرز بھی انہیں لکھوا دیئے ہیں۔''

بات کرتے ہوئے کنول کی بلوریں آنکھوں میں امید کی ایک کرن سی تھی۔ اس کرن کو دیکھ کر یاسر کے سینے میں کوئی نوکیلی شے چبھنے لگی۔ ایک درد سا ابھرا اور جسم میں پھیلنے لگا۔ کنول اسے پوری رپورٹ دے رہی تھی۔ اپنی اور عبدالواحد کی کوشش کے حوالے سے سب کچھ بتا رہی تھی۔ مگر یاسر تو جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ خبر نہیں کہاں کھو گیا تھا۔ وہ سر جھکا کر میز کی شفاف سطح کو گھور رہا تھا اور بس ہوں ہاں کرتا جا رہا تھا۔ ذہن میں بار بار یہی خیال ڈوب کر ابھر رہا تھا...... پرسوں وہ چلی جائے گی...... ہمیشہ کے لئے...... زندگی کتنی خالی ہو جائے گی...... سب کچھ وہی رہے گا لیکن کچھ بھی وہ نہیں رہے گا......

یکا یک وہ بدک گیا۔ اس کے کان میں ......ٹرررر...... کی وہی تیز آواز گھسی تھی لیکن اس مرتبہ یہ آواز رقصاں تتلی کی نہیں تھی، کنول کی تھی۔ اس نے یاسر کو خیالوں سے چونکانے کے لئے شرارت آمیز انداز میں یہ حربہ استعمال کیا تھا۔

وہ ناراض نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ہنس رہی تھی اور سرخ ہو رہی تھی۔

''یہ کیا مذاق ہے؟'' یاسر نے کہا۔

یاسر کی آواز آرکسٹرا کے بلند شور میں دب کر رہ گئی۔

''کیا کہا تم نے؟'' کنول نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''یہ کیا مذاق ہے؟'' یاسر نے دُہرایا۔

''مذاق تو اُس لڑکی نے کیا تھا...... میں نے تو نقل کی ہے۔'' یاسر نے اسے گھورا اور کان کھجانے لگا۔ وہ اس کی کلائی کو جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

''کہاں کھو گئے تھے تم...... میں بک بک کر رہی ہوں اور تم اپنے آپ میں مست ہو۔''

''چلو چلیں۔ یہاں تو دم گھٹ رہا ہے۔'' یاسر نے چاروں طرف تھرکتے ہوئے جسموں کو دیکھ کر کہا۔

''دم تو میرا بھی گھٹ رہا ہے۔ لیکن صرف دو منٹ۔ ابھی واحد صاحب آتے ہیں تو ان سے آگیا لے کر چلتے ہیں۔'' وہ کسی وقت غیر ارادی طور پر ہندی لفظ استعمال کر

جاتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ الکحل، دھوئیں اور تھرکتے جسموں کے گھیرے سے باہر تھے۔ اب رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کم تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ پیدل ہی چلنے لگے۔ وہ گاڑیوں کے چند بڑے بڑے شو رومز کے قریب سے گزرے۔ جدید ترین ماڈلز کی مہنگی گاڑیاں تھوک کے حساب سے نظر آ رہی تھیں۔ اور یہ کیفیت ان شو رومز میں ہی نہیں تھی، پورے کولمبو میں چم چم کرتی لگژری گاڑیوں کی بھرمار تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ یہاں کسٹم ڈیوٹی اور دیگر ٹیکس خاصے کم ہیں جس کے سبب لوگ ایسی آسائشیں افورڈ کر لیتے ہیں۔

ایک انڈین ریستوران سے حلال کھانا کھانے کے بعد وہ ہوٹل واپس پہنچ گئے۔

مطلع ابر آلود تھا، بارش کا امکان نظر آ رہا تھا۔ کنول اپنے گھر فون کرنے کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ ایسے موقعوں پر اس کے چہرے پر عجیب سی بے تابی نظر آنے لگتی تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر یاسر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نہایت چکنے فرش پر دیر تک ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا، کیا جذبے یکطرفہ بھی ہوتے ہیں؟ کیا اتنے شدید جذبے یکطرفہ بھی ہوتے ہیں؟ کیا کنول کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ یاسر کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ وہ پچھلے دنوں میں بیتے ہوئے ایک ایک لمحے کو یاد کرنے لگا۔ ایسے اشارے ڈھونڈنے لگا جن سے اس کا دل تسلی پا سکے۔ اسے یہ سمجھنے کا جواز مل سکے کہ اس کے سینے میں بھڑکتے ہوئے جوالا مکھی کی کچھ نہ کچھ آنچ کنول تک بھی پہنچی ہے۔

بے شک وہ اس سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی...... لیکن وہ تو ہر کسی سے بے تکلف ہو جاتی تھی۔ بے شک اس نے اسے تحائف دیئے تھے لیکن تحائف تو اس نے پتنگ فروش لڑکے اور ہوٹل کے دو ویٹرز کو بھی دیئے تھے۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اُسے Miss کرتی تھی۔ مگر وہ تو جس سے بھی تھوڑی دیر ہنس بول لیتی تھی، اُسے Miss کرنے لگتی تھی۔ گال فیس روڈ کا محمد نذیر اور وہاں کا گڈی فروش...... اور پولیس آفیسر سب اس کی مثال تھے۔ اور ایسا نہیں تھا کہ وہی لوگوں کو Miss کرتی تھی، لوگ بھی اسے ایک بار مل کر بھولتے نہیں تھے۔ وہ اسے پھر دیکھنا چاہتے تھے، پھر اس سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ ہر دلعزیز تھی۔ نجانے کس کس کی آنکھ کا تارا تھی۔

وہ اس کی اداؤں اور اس کی شوخیوں کو اپنے لئے مخصوص سمجھ بیٹھا تھا۔ اس کی شخصیت کے قدرتی سحر کو سمجھے بغیر وہ اس کی محبوبیت کا اسیر ہوتا چلا گیا تھا۔ اس حوالے سے ایک معروف شعر اُسے یاد آنے لگا...... موقع کی مناسبت سے بالکل حسب حال شعر تھا۔ شعر کے الفاظ اس کے ذہن کی گرفت میں آتے آتے پھر نکل رہے تھے۔ کچھ اس قسم کا مضمون تھا کہ...... ہم جس عنایت اور لگاوٹ کو محبت سمجھ رہے ہیں، وہ کہیں اس حسین کا طرزِ تکلم ہی نہ ہو......

وہ ایزی چیئر پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر ابر آلود آسمان کو دیکھتا رہا اور شعر کے اصل الفاظ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بادلوں میں بجلی چمک رہی تھی۔ اسی طرح شعر کے الفاظ بھی اس کے ذہن میں چمک چمک کر اوجھل ہو رہے تھے۔ پھر اچانک شعر کے دونوں مصرعے اُسے یاد آ گئے۔

ہم جس کو ترا پیار سمجھ بیٹھے اے شوخ
وہ ناز و انداز تری عادت ہی نہ ہو

نہ صرف شعر یاد آ گیا بلکہ پوری غزل ہی یادداشت کے پردے پر ابھر آئی۔ پاس ہی ٹیبل پر سادہ کاغذ پڑا تھا۔ اس نے تین چار شعر کاغذ پر لکھ ڈالے۔ نیچے اس نے لکھا...... بچھڑنے سے ایک رات پہلے نیپون ہوٹل کے کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوں۔ گہرے سیاہ بادلوں میں بجلی چمک رہی ہے، ساحل کی ہوا میری آنکھوں کی طرح پانی سے لدی ہوئی ہے......

اچانک اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر دیکھتا، کنول نے لکھے ہوئے کاغذ پر جھپٹا مارا۔ یاسر نے تیزی سے کاغذ بچایا۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا پھٹ کر کنول کے ہاتھ میں چلا گیا۔ باقی کاغذ یاسر کے ہاتھ میں رہ گیا۔

وہ ایک بار پھر کاغذ پر جھپٹی۔ اس مرتبہ یاسر نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس کا شوخ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ یاسر سے کاغذ چھیننے کے لئے اس سے الجھنے لگی۔

”نو...... نو...... ناٹ ایٹ آل۔“ یاسر نے کاغذ پتلون کی جیب میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

"یس...... یس...... وٹ سو ایور......" وہ اسے صوفے پر گراتے ہوئے بولی۔

ایسے لمحوں میں وہ شاید بھول ہی جاتی تھی کہ وہ ایک نرم و نازک لڑکی ہے۔ وہ ایک غیر مرد سے گتھم گتھا ہوگی تو اس کا لمس قیامت برپا کر دے گا۔

پانچ دس سیکنڈ تک ان میں کشمکش ہوئی۔ پھر وہ ہانپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کشمکش کے نتیجے میں ایک خوبصورت ٹیبل لیمپ دارِ فانی سے کوچ کر گیا اور ایک ایش ٹرے کو فریکچر کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جو ٹکڑا کنول کے ہاتھ میں آیا تھا وہ ابھی تک اس کے پاس تھا۔ وہ اس سے دور ہٹ کر کمرے کے گوشے میں چلی گئی اور پڑھنے لگی۔ دراصل اس کے پاس صرف دو سطور ہی تھیں اور وہ بھی آدھی آدھی کٹی ہوئی تھیں۔ اس نے پڑھا۔

......مپون ہوٹل کے کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوں...... آنکھوں کی طرح پانی سے لدی ہوئی ہے......

"بھئی یہ کیا بات ہوئی......" وہ ٹھنک کر بولی۔ "کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا...... مپون ہوٹل کے کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوں...... آنکھوں کی طرح پانی سے لدی ہوئی ہے...... کیا چیز، کس کی آنکھوں کی طرح پانی سے لدی ہوئی ہے؟ پلیز یاسر! مجھے دکھاؤ نا، کیا لکھ رہے تھے؟"

"شاید دکھا ہی دیتا، لیکن تم نے چھینا جھپٹی کی ہے، اس لئے بالکل نہیں دکھاؤں گا۔ ناٹ ایٹ آل۔"

"پلیز دکھاؤ نا۔" وہ ان لمحوں میں کسی بچی کی طرح معصوم نظر آتی تھی۔

"بھئی ہر بندے کے ذاتی معاملات ہوتے ہیں، ان میں دخل اندازی اخلاقیات کے خلاف ہے...... اب تم روزانہ اپنے سفر کی ڈائری لکھتی ہو، میں نے تو کبھی نہیں کہا کہ دکھاؤ کیا لکھا ہے، کس کے لئے لکھا ہے۔"

"تو میں دکھا دیتی ہوں۔ اس میں کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں۔ وہ ایک سچی لڑکی کی سچی ڈائری ہے۔ میں اسے حرف بحرف اخبار میں پرنٹ کروا سکتی ہوں۔"

"بات پھر وہیں آ جاتی ہے۔" یاسر نے کہا۔ "دنیا میں سب لوگ ان معنوں میں سچے نہیں ہیں جن معنوں میں تم لوگوں کو سچا سمجھتی ہو۔"

"بالکل غلط...... سچ اور جھوٹ بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ ایک سیاہ...... ایک

سفید...... ان کے درمیان کوئی رنگ نہیں ہوتا۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ ایک شخص سچ یا جھوٹ بولے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اور ایسا ہونا چاہئے۔ بے رحم سچ سے مہربان خاموشی بہتر ہے۔ ایسی خاموشی سے زندگی زیادہ قابل قبول اور خوبصورت ہو سکتی ہے۔"

"غالباً تم منافقت کی وکالت کرنا چاہ رہے ہو۔"

"منافقت اور چیز ہے...... خاموش سچائی اور چیز ہے۔"

ان کی بحث طویل ہونے لگی۔ باہر بونداباندی شروع ہو گئی تھی۔ اچانک ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ کنول سب کچھ بھول بھال کر اپنا فون ریسیو کرنے کے لئے اپنے کمرے کی طرف لپک گئی۔ یاسر جانتا تھا کہ اب وہ آدھ پون گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آئے گی۔

یہ ہوٹل صاف ستھرا تھا، اس کے باوجود رات کو مچھر کاٹتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یاسر کمرے کی ایک دو کھڑکیاں کھلی رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ واش روم کے لئے ایک چپل کی ضرورت بھی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ یاسر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہ دونوں چیزیں خرید لائے، ساتھ میں رم جھم کا بھی لطف اٹھایا جا سکتا تھا۔ ان کے ہوٹل کے پاس ہی ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور رات گئے تک کھلا رہتا تھا۔

وہ کمرا لاک کر کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ہلکی بونداباندی میں وہ دور تک اکیلا ہی چلتا چلا گیا۔ کنول کی ہنسی، اس کی شوخی، اس کا لمس سب کچھ اس کے ذہن میں تھا اور رگوں میں آگ بھڑکا رہا تھا۔ وہ کیا چیز تھی؟ کیسے اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی تھی۔ اس کا سارا بدن جل رہا تھا۔ بارش کی بوندیں اس کے جلتے بدن کو بھلی لگنے لگیں۔ بارش تیز ہو گئی لیکن وہ پھر بھی اسی طرح چلتا رہا، بھیگتا رہا...... جل تھل ہوتا رہا۔ کولمبو کے تاریک آسمان پر رہ رہ کر بجلی چمکتی رہی اور ناریل بھیگی ہوا میں جھومتے رہے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

وہ واپس مڑا اور اسٹور پر پہنچا۔ اسٹور کا عملہ شٹر ڈاؤن کی تیاری کر رہا تھا۔ یاسر کو اپنی دونوں مطلوبہ چیزیں مل گئیں۔ یعنی چپل اور سری لنکا کے اسپیشل مچھروں کے لئے

اسپیشل تیل۔ اچانک اس کا دایاں کان جھنجھنا اٹھا...... ٹرررر...... کی تیز آواز کان سے گزر کر ساری کھوپڑی میں گونج گئی تھی۔ مڑ کر دیکھنے سے پہلے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہ کنول ہے...... وہ رنگین چھتری لئے عقب میں موجود تھی اور ہنس ہنس کر دُہری ہو رہی تھی۔

"میں تم پر ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر دوں گا۔"

"میں بھی تم پر بے جا تشدد کا دعویٰ دائر کر سکتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب وطلب کچھ نہیں ہے۔ آپ جناب کیا کر رہے ہیں یہاں؟"

"میں مچھر کا تیل اور چپل لینے آیا ہوں...... اور تم؟"

"میں یہ آیوڈیکس۔"

"کس لئے؟"

"آیوڈیکس کس لئے لی جاتی ہے؟...... چوٹ پر لگانے کے لئے۔"

"کہاں چوٹ آئی ہے تمہیں؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟"

"اچھا نہ بتاؤ...... لیکن کیسے آئی ہے؟"

"واہ...... واہ...... بلکہ سبحان اللہ...... مارتے بھی ہو اور یہ بھی نہیں جانتے کہ کہ مارا ہے......"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ، کیا ہوا تھا...... کہیں ٹیبل لیمپ کا ٹکڑا تو نہیں لگا؟"

"ٹکڑا نہیں، پورا ٹیبل لیمپ لگا ہے۔" اس نے کندھے پر سے قمیض کو تھوڑ سرکاتے ہوئے کہا۔

بلوری جلد پر گہری خراش نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ خراش آگے تک گئی تھی لیکن "بے حد سچی" ہونے کے باوجود اس سے آگے قمیض نہیں سرکا سکتی تھی۔

"اوہو...... ویری سوری......" یاسر نے تاسف سے کہا۔

"نو مینشن...... معمولی سی رگڑ ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ واپس چل دیئے۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ کنول نے کہا۔

"چھتری کے نیچے آ جاؤ۔"

وہ بولا۔ "میں تو بھیگ ہی گیا ہوں...... تم بھی بھیگ جاؤ گی۔"

"میرے اکیلے خشک رہنے سے بہتر ہے کہ دونوں تھوڑا تھوڑا بھیگ جائیں۔"

"نہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" وہ اس کے ہیجانی لمس سے خوفزدہ ہو کر بولا۔

"تو پھر میں بھی ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" وہ تنک کر بولی اور چھتری بند کر کے بارش کی بوچھاڑ میں آ گئی۔

یاسر اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ لمحوں میں تربتر ہو گئی تھی۔ اب چھتری کھولنا فضول تھا۔ دونوں فٹ پاتھ پر چلتے ہوٹل نیپون کی طرف بڑھنے لگے۔

"ارے میں تو بھول ہی گئی، کہاں ہے وہ باقی کاغذ؟"

یاسر نے مسکرا کر اپنی شرابور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور تربتر کاغذ کے مڑے تڑے ٹکڑے کنول کے ہاتھ پر رکھ دیئے......

"یہ کیا ہے؟" وہ ٹھنک کر بولی۔ پھر اس نے ٹکڑے پانی میں پھینک دیئے اور یاسر کو بالوں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ "چلو زبانی بتاؤ کیا لکھا تھا؟"

"اب تو بھول بھی گیا ہوں...... پتہ نہیں کیا اوٹ پٹانگ تھا۔"

"تم بہت برے ہو یاسر۔" اس نے کہا۔ شاید کچھ اور بھی کہتی لیکن تکہ شاپ والا لڑکا اپنی شریر آنکھوں کے ساتھ ان کے سامنے آ گیا۔

"ہمارا تکہ کولمبو میں سب سے بہتر ہے صاحب...... اور چرغہ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔" وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ "اس کا سینہ دیکھیں، کتنی موٹی موٹی بوٹی ہے...... اور ٹانگیں، کتنی سڈول...... اور تو اور گردن بھی کڑکڑ چبانے کی چیز ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ہی نہیں لہجے میں بھی شرارت تھی...... بلکہ ہر ہر حرکت سے شرارت اور معنویت ٹپکتی تھی۔

"گیٹ لاسٹ۔" یاسر نے ناگواری سے کہا۔

وہ ادب سے سر جھکا کر پیچھے ہٹ گیا۔



اگلا روز کولمبو میں ان کے ''ساتھ'' کا آخری روز تھا۔ وہ حسب معمول منرل واٹ
پھل اور کیمرا لے کر مختلف جگہوں پر گھومتے رہے۔

یاسر کا خیال تھا کہ مختلف ممالک کے کھانے کھانا بھی ان ممالک کی سیاحت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ مگر کنول کا رویہ کھانے پینے کے حوالے سے بے حد محتاط تھا...... وہ گِ
چنی چیزیں کھاتی تھی اور وہ بھی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اعلیٰ ترین کوالٹی کی۔

یاسر کو بہت دیر سے ملائشین فوڈ کے بارے میں جاننے کا شوق تھا۔ وہ کنول کو ساحل کے قریب سے گھسیٹ کر سیدھا میلینیم پارک لے گیا۔ یہاں بھی ایک فوڈ کو
موجود تھا۔ یاسر کے بے حد اصرار کے باوجود کنول نے ملائشین ڈش کا آرڈر نہیں د
اور اپنے لئے وہی چائنیز پلاؤ اور چلی چکن منگوالیا۔

''تمہیں دیکھ کر سیاحوں کے بارے میں ایک مقولہ یاد آرہا ہے۔'' وہ بولی۔

''کون سا مقولہ؟''

''کسی نے کہا ہے کہ کسی ملک کی سیاحت وہاں کی تفریح گاہوں، وہاں کے کھانوں اور وہاں کی عورتوں کو جانے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ تم نے بھی کہیں
واہیات مقولہ سن رکھا ہے۔''

''اگر اس مقولے کو صرف کھانوں اور تفریح گاہوں تک محدود کر دیا جائے تو
ایک نہایت معقول مقولہ ہے...... بلکہ معقولہ ہے۔ اور میں اس کا پُرزور حامی ہوں۔''

''خود کو اتنا پارسا ثابت کرنے کی کوشش نہ فرمائیں یاسر صاحب...... مجھے تو ا
بھی شک ہے کہ آپ چھپے رستم ہیں...... اب میں پھر سچ جھوٹ کی بات کروں گی
بحث چھڑ جائے گی۔ میرے خیال میں ہمیں ایک اچھے لنچ کے لئے خاموش ر
چاہئے۔'' اس کے گداز ہونٹوں پر بھیگی سی مسکراہٹ تھی۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ لیکن یاسر کے لئے لنچ پھر بھی اچھا ثابت نہیں ہوا۔ ملائشین کھانے نے اس کے پسینے چھڑا دیئے اور دماغ کی چولیں ہلا دیں۔ موٹے سے چاول تھے، ان پر اُبلا ہوا انڈا رکھا گیا تھا۔ پیاز کے تڑکے والے چاولوں کے اندر بدذائقہ مچھلی کے ٹکڑے تھے اور کوکونٹ آئل کی تیز بُو تھی۔ مرچ اتنی زیادہ تھی کہ یاسر کو اپنے کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہوا۔ کنول منہ دبا کر ہنس رہی تھی۔ اس نے کھٹاک سے یاسر کی ایک تصویر بھی کھینچ لی اور بولی۔

''اس تصویر کا کیپشن لگاؤں گی، عبرت ناک کھانا اور ایک پاکستانی۔''

سہ پہر تک وہ خوش رہی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس پر بھی اداسی طاری ہونے لگی۔ یہ جدا ہونے کی اداسی تھی۔ اس اداسی نے یاسر کو تین دن پہلے ہی گھیر لیا تھا لیکن اس نے یہ کیفیت کنول پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ بے شک ان معنوں میں بھی وہ جھوٹا ہی تھا۔

شام کے وقت وہ ہوٹل کی بالکونی میں خاموش بیٹھے رہے۔ کنول نے اپنے بیگ میں سے ایک کاغذ نکالا، اس پر ایک ایڈریس اور تین چار فون نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ ایڈریس اور نمبرز کا تعلق کینڈی سے تھا۔ وہ کاغذ اسے تھماتے ہوئے بولی۔

''یہ آشا دیدی کا ایڈریس ہے۔ ایک فون نمبر گھر کا ہے، دو نمبرز کمار بھائی کے آفس کے ہیں۔ کل تم آفس جاؤ گے۔ اگر تمہارا کام ختم ہو گیا تو شام تک ہر صورت مجھے فون کرو گے...... اور...... اگر کام ختم نہیں ہوا تو بھی جمعے کے دن تک تم نے ہر صورت مجھے فون کرنا ہے۔ اگر نہ کیا تو یاد رکھو میں بقلم خود یہاں پہنچ جاؤں گی اور اتنی لڑائی کروں گی کہ تمہیں دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔''

یاسر کو لمبی چوڑی تاکید کرنے کے بعد وہ کسی حد تک مطمئن نظر آنے لگی۔ پھر ان کی گفتگو کا رخ لاہور کی طرف اور یاسر کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ وہ یاسر سے اس کے والد کے بارے میں کرید کرید کر سوال پوچھنے لگی۔ والدہ کے بارے میں تو اسے معلوم ہو چکا تھا کہ فوت ہو چکی ہیں۔ یاسر کی بہن شائلہ انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ کنول کو لٹریچر وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر وہ انگریزی زبان میں دلچسپی رکھتی تھی اور اس پر مکمل عبور حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ پچھلے چند دنوں میں وہ دونوں اکثر

شائلہ کا ذکر کرتے رہے تھے۔ یوں شائلہ سے کنول کا غائبانہ تعارف ہو گیا تھا اور وہ اس سے ملنے کی خواہش مند تھی۔

رات نو بجے کے لگ بھگ انہوں نے ہوٹل میں ہی کھانا کھایا اور پھر کنول پیکنگ کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

یاسر کچھ دیر کمرے میں اکیلا بیٹھا رہا پھر کنول کی پیکنگ دیکھنے کے لئے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ بے شک یہ ایک تکلیف دہ کام تھا مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بندے کا دل خوامخواہ تکلیف اٹھانے کو چاہتا ہے۔ وہ جب کمرے میں پہنچا تو کنول اس کے دیئے ہوئے کلپ کو بڑی احتیاط کے ساتھ کپڑوں کی تہہ میں رکھ رہی تھی۔ کلپ کے علاوہ اس نے گفٹ پیک کا کاغذ بھی بڑی احتیاط سے اٹیچی کیس میں رکھا ہوا تھا۔ نجانے کیوں یاسر کے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں جاگ گئیں۔

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ پیکنگ میں مصروف رہی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''تم نے اپنا وارڈروب دیکھا ہے؟''

''نہیں تو...... کیا بات ہے؟''

''جب تم لابی میں ٹی وی دیکھ رہے تھے، میں نے تمہارے دو جوڑے استری کر دیئے تھے۔ تولیہ گندا ہو رہا تھا، وہ بھی دھو دیا ہے۔ یہ کپڑے جو تم نے پہن رکھے ہیں کل لانڈری میں دے دینا اور دونوں بنیانیں بھی۔''

''ٹھیک ہے......'' یاسر نے کہا۔ وہ اٹیچی پر جھکی ہوئی تھی۔ کندھے پر لگی ہوئی خراش آگے تک نظر آ رہی تھی۔

وہ اٹیچی بند کر کے سیدھی ہوئی۔ ''جس دن کینڈی آنا ہو، وہ براؤن پینٹ اور گرے دھاریوں والی شرٹ پہن لینا۔ سفر میں کاٹن کے کپڑے چرمر ہو جاتے ہیں۔''

وہ ایسے یقین سے کہہ رہی تھی جیسے یاسر کا کینڈی آنا سو فیصد طے ہو چکا ہو۔ یاسر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے روز وہ بہت جلدی اٹھ گئے۔ کنول نے ہی دروازے پر دستک دے کر یاسر کو جگایا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔ اسٹیشن سے ٹرین کی روانگی کا وقت سات بجے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں انہیں نہ صرف اسٹیشن پہنچنا تھا بلکہ ٹکٹ وغیرہ بھی لینا تھا۔

چہرے پر پانی کے چھینٹے دے کر یاسر نے کپڑے بدلے اور کنول کو ''سی آف'' کرنے کے لئے اس کے ساتھ چل دیا۔ ہوٹل کا بل وغیرہ کنول نے شام ہی کو چکتا کر دیا تھا۔

یاسر نے کنول کا اٹیچی تھام لیا۔ کنول کے ہاتھ میں تھیلا نما شاپر تھا جس میں دیدی آشا اور ان کے بچوں کے لئے تحفے وغیرہ تھے۔ ابھی سڑکوں پر ملگجا اندھیرا تھا، ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔

''کتنا اچھا ہوتا یاسر! ہم دونوں ساتھ جا رہے ہوتے۔'' کنول نے اس کی طرف شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

یاسر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور چونک سا گیا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں نجانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ کنول کی آنکھیں روئی روئی ہیں۔ یا شاید یہ صرف اس کا وہم تھا...... اس نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا لیکن کوشش کے باوجود ایسا کر نہیں سکا۔

''میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' وہ اسے کندھے سے ٹھوکا دیتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ میں اس بات کا جواب ایک سو دس بار دے چکا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی، ایک رکشا پھٹ پھٹ کرتا ان کے پاس آ رکا۔ بھاؤ تاؤ کا وقت نہیں تھا، چھ بج چکے تھے۔ وہ فوراً سامان سمیت رکشا میں گھس گئے۔

''اسٹیشن چلو۔'' یاسر نے رکشا والے سے کہا۔

رکشا والے نے بڑے [illegible] اثبات میں سر ہلایا۔

''اوہ مائی گاڈ......'' کنول نے چیخنے والے انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مضبوطی سے یاسر کا بازو تھام لیا۔

یاسر نے تعجب سے کنول کو دیکھا، پھر اس کی نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے رکشا والے کی طرف دیکھا۔ اب یاسر کے چونکنے کی باری تھی...... رکشا والا فلائنگ ہارس تھا...... وہی طوفانی ڈرائیور جو انہیں دس روز پہلے ایئر پورٹ سے کولمبو میں لایا تھا۔ رکشا سڑک پر رواں دواں ہو چکا تھا۔ ورنہ شاید ٹائم شارٹ ہونے کے باوجود وہ اتر ہی

جاتے۔ دونوں نے پریشان نظروں سے ایک دوجے کو دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

رکشا والا اپنے مخصوص اسٹائل میں رکشا کی رفتار بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ سونے پہ سہاگہ یہ تھا کہ آج سڑکیں بھی خالی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ آج ضرور رکشے کو پرواز کرا دے گا۔ وہ دونوں سوچ رہے تھے کہ رکشا والے سے اپنا تعارف کروائیں یا نہیں اس اثناء میں وہ خود ہی بول پڑا۔

”آپ دونوں صاحب...... وہی ہیں نا...... جن کو میں جمعے کے دن ایئر پورٹ سے لایا تھا۔“

یہ سوال کرتے ہوئے اس نے حسب عادت پورا گھوم کر ان کی طرف دیکھا اور بتیسی کی نمائش کی تھی۔

یاسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہم ہی وہ قسمت کے مارے ہیں۔“

وہ خوش ہو کر ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ”شہر بہت بڑا ہے...... پھر بھی ایک شہر میں ہوں تو ملاقات ہوتی ہے۔“

”سب قسمت کے کھیل ہیں۔“ یاسر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”کیا کہا آپ نے؟“ اس نے حسب عادت پورا گھوم کر یاسر سے پوچھا۔

رکشا مرلی دھرن کے بال کی طرح ہوا میں لہرایا اور یوں لگا کہ ”آف بریک“ کر فٹ پاتھ پر چڑھ جائے گا۔

”مم...... میں نے گزارش کی ہے کہ رفتار ذرا آہستہ رکھو۔“

اس نے ایک بار پھر شدت سے اثبات میں سر ہلایا۔ اندازہ ہوا کہ یاسر کے فقرے میں سے صرف ”رفتار“ کا لفظ ہی اس کی سمجھ میں آیا ہے...... رفتار تھوڑی اور بڑھ گئی۔ اب خاموش رہنے اور کسی معجزے کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دونوں بڑی مضبوطی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ کنول کی انگلیاں یاسر کے گوشت میں پیوست تھیں اور پیوست تر ہو رہی تھیں۔

پانچ دس منٹ گزرے لیکن انہیں یہی لگا کہ مدتیں گزر گئی ہیں۔ بالآخر معجزہ رونما ہو گیا۔ وہ اسٹیشن پہنچ گئے۔ رکشے نے ایک آخری طوفانی موڑ کاٹا اور ایک احتجاجی چیخ

کر رک گیا۔ یاسر اور کنول پہلی فرصت میں نیچے اتر گئے اور ایک دوسرے کو مبارکبادی نظروں سے دیکھنے لگے۔

رکشا والا بار بار بتیسی نکال رہا تھا اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں مسلسل دوستانہ خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ان دونوں کے لئے مزید خدمات بھی انجام دے یعنی انہیں معلوم کر کے بتائے کہ کینڈی جانے والی ٹرین کے ٹکٹ کہاں سے ملیں گے، ٹرین کتنے بجے روانہ ہوگی، کس پلیٹ فارم سے روانہ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ وہ قطار میں کھڑے ہو کر ان کے لئے ٹکٹ خریدنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان خدمات کا صلہ اس نے ٹپ کے ساتھ ہی وصول کرنا تھا۔

یاسر نے شائستہ الفاظ میں اسے سمجھا دیا کہ وہ جو خدمات پیش کر رہا ہے ان کی انہیں مطلق ضرورت نہیں ہے...... اسے کرایہ اور ٹپ دے کر انہوں نے بمشکل رخصت کیا۔ جب اس کا طوفانی رکشا سماعت شکن شور مچاتا ہوا کولمبو کے جھٹپٹے میں اوجھل ہو گیا تو دونوں نے اطمینان کی طویل سانس لی...... دو تین منٹ انہیں اپنے حواس درست کرنے میں لگے پھر وہ ٹکٹ گھر کی طرف بڑھ گئے۔ صبح صبح اس عجیب اتفاق نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

فرسٹ کلاس کا ٹکٹ 200 سری لنکن روپے میں دستیاب تھا۔ سیکنڈ کلاس 100 روپے کا تھا۔ فرسٹ کلاس کے ٹکٹ گھر پر ٹورسٹ خواتین و حضرات کی بھرمار تھی۔ قریباً بیس منٹ بعد ٹکٹ کنول کے ہاتھ میں تھا اور وہ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اس سے رخصت ہو رہی تھی۔ ان آخری لمحوں میں وہ ایک دم ہی بہت اداس ہو گئی تھی۔

”آؤ گے نا؟“ اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

”کہا ہے نا، کوشش کروں گا۔“

”میں وہاں پہنچتے ہی تمہارے فون کا انتظار شروع کر دوں گی۔“

”اور جو کام کرنے جا رہی ہو، اس کا کیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ خاور کی تلاش۔“

”وہ اور سلسلہ ہے...... یہ اور سلسلہ ہے۔ تم نے...... تم نے یاسر! مجھے دوستی کے ایسے جذبے سے آشنا کیا ہے جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔“

"میں نے بھی ان احساسات کا کبھی تصور نہیں کیا تھا جن کا تجربہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" یاسر نے روانی میں کہہ دیا۔

وقت اب بہت کم تھا۔ کنول نے الوداعی انداز میں یاسر کے ہاتھ تھام لئے۔ وہ بس اب جا ہی رہی تھی۔ شاید اسے پھر کبھی ملنا تھا یا نہیں ...... یاسر کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔ کوئی فقرہ...... کوئی لفظ...... کوئی بات...... جو اس آگ کی نشاندہی کر سکے جو یاسر کے بدن کے صحرا میں اُفق تا اُفق پھیلی ہوئی تھی...... وہ کچھ کہہ دینا چاہتا تھا، آنکھیں بند کر کے اپنے لب ہلا دینا چاہتا تھا...... مگر وہ کچھ نہ بول سکا۔ اس نے بس اتنا کہا۔

"کنول! Zoo میں بطخوں والا تالاب یاد ہے نا...... جس کے کنارے ایک کیفے تھا۔"

"ہاں یاسر...... مجھے یاد ہے۔"

"اُس کیفے میں بیٹھ کر میں نے تم سے ایک لڑکی کا ذکر کیا تھا...... وہ جو ملنے سے پہلے ہی مجھ سے بچھڑ گئی تھی......"

"ہاں...... مجھے یاد ہے...... تم نے بعد میں بتایا تھا کہ وہ مذاق ہے۔"

وہ چند لمحے براہِ راست اس کی بلوریں آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر عجیب بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"وہ...... مذاق نہیں تھا کنول۔"

کنول خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کی وسل سنائی دینے لگی۔ مسافر تیزی سے پلیٹ فارم کی طرف لپک رہے تھے۔

ایک گارڈ نے کنول کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "پلیز میڈم! اندر آ جائیں۔"

کنول کی اُلجھن زدہ نظریں ابھی تک یاسر کے چہرے پر تھیں۔

"خدا حافظ کنول!" یاسر نے کہا۔

سفید فام سیاحوں کی ایک شور مچاتی ٹولی کنول اور یاسر کے درمیان حائل ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یاسر کچھ دیر تک ساکت کھڑا رہا، تب رخ پھیر کر آہستہ آہستہ اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

کولمبو اس کے سامنے تھا۔ کولمبو میں دن کا اجالا پھیل گیا تھا لیکن یہ اجالا یاسر کو نظر

نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تو ایک زود رنگ اداسی تھی۔ پورا شہر ویرانہ نظر آ رہا تھا۔ دھول اُڑاتا ویرانہ۔



وہ چلی گئی اور یاسر کو ایک لق و دق صحرا میں چھوڑ گئی۔ سب کچھ وہی تھا لیکن کچھ بھی وہ نہیں تھا۔ ہر جاندار و بے جان شے اپنی اچھی صفات سے خالی ہو گئی تھی۔ یہ کیسے ہو گیا تھا؟ طشتری میں وہی پھل یاسر کے سامنے رکھے تھے لیکن ان میں لذت نہیں تھی۔ کمرے کی بالکونی میں رجنی گندھا کے وہی پھول کھلے تھے لیکن ان میں خوشبو نہیں تھی۔ کولمبو اسی طرح جگمگاتا تھا لیکن اس میں خوبصورتی اور ترنگ نہیں تھی...... ناریل اُداس، ہوا نڈھال...... یوں لگتا تھا وہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے۔

کنول کے جانے کے بعد یاسر آفس گیا تھا۔ حسب توقع اس کا سارا کام چار پانچ گھنٹے میں مکمل ہو گیا تھا۔ لاہور میں سینئرز بھی اس کے کام سے مطمئن ہوئے تھے۔ اب وہ دفتر والوں کی طرف سے بالکل آزاد تھا۔

کنول نے کہا تھا کہ اگر دفتر میں کام ختم ہو جائے تو وہ شام تک اسے ضرور فون کرے۔ اس نے نہیں کیا تھا۔ فون کرنا ہوتا تو پھر وہ اس کے ساتھ ہی نہ چلا جاتا؟ کنول نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ صبح والی ٹرین سے نہیں جائے گی۔ وہ جب آفس سے فارغ ہو جائے گا تو دونوں اکٹھے سہ پہر کو کینڈی روانہ ہو جائیں گے۔ درحقیقت وہ کینڈی جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بے شک کنول کی دوری اُسے تڑپا رہی تھی مگر اُس کی قربت اسے زیادہ اذیت دیتی۔ یہ احساسات اس کے لئے سوہانِ روح تھے۔ وہ کسی اور کی ہے۔ وہ کسی اور کی تلاش میں ہے، کوئی اور اس کی نگاہ کا مرکز ہے۔

دو دن یاسر نے اسی طرح گہری اُداسی اور الم کے گھیرے میں گزار دیئے۔ پھر اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ کمرے میں بند رہا تو گھٹ کر مر جائے گا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا لیکن باہر بھی تو امان نہیں تھی۔ وہی سڑکیں، وہی گلیاں اور راستے جن پر سے وہ اکٹھے گزر رہے تھے، جہاں ان کے قہقہے گونجے تھے اور کنول کی دلنواز شوخیوں نے یاسر کے دل میں محبت کے شگوفے کھلائے تھے۔

رات نو بجے کا وقت تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر سیدھا چلتا گیا۔ ڈیڑھ دو فرلانگ آگے

جانے کے بعد وہ واپس مڑا اور دوسری سمت کے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل کے سامنے وہ گرجا گھر کے قریب سے گزرا۔ آگے تکہ شاپ تھی۔ سنہالی لڑکا حسب معمول ایک کونے میں کھڑا تھا۔ آج اس کی شریر آنکھوں کی چمک ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ آگے آ کر شکستہ انگریزی میں بولا۔

”صاحب! آپ اکیلے ہیں؟“

”ہاں...... تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”میں جانتا ہوں صاحب! آپ کی دوست چلی گئی ہے۔ وہ پرسوں صبح سویرے چلی گئی تھی...... اب آپ کو کسی اور دوست کی ضرورت ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ یاسر نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

”میں کسی لڑکی سے آپ کی دوستی کرا سکتا ہوں۔ ایک دم فرسٹ کلاس لڑکی۔ آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ لمبا قد...... موٹی آنکھیں...... کالج گرل......“

وہ یوں بول رہا تھا جیسے اپنے چرغے کی تعریف کر رہا ہو...... خستہ...... مصالحے دار...... ایک دم مزیدار۔ یاسر کا موڈ پہلے ہی خراب تھا۔ لڑکے کی بات سے اور بھی خراب ہو گیا۔

”تو تم تکہ شاپ چلانے کے ساتھ عورتوں کی دلالی بھی کرتے ہو؟“ وہ گرجا۔

”جج...... جی...... میں سمجھا نہیں۔“

”میرا دل چاہ رہا ہے تمہارے منہ پر اتنے زور کا تھپڑ ماروں کہ آواز تمہارے گھر تک جائے۔ دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے...... دفع ہو جاؤ۔“ یاسر نے اُسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرجے کی دیوار تک چلا گیا۔

”حرام زادے! شرم نہیں آتی تجھے...... گرجے کے سامنے بیٹھ کر کنجر خانہ چلا رہا ہے۔ لعنت ہے تیری شکل پر اور تیرے کام پر......“ یاسر کے منہ میں جو کچھ آیا، بولتا چلا گیا۔

پتہ نہیں کہ سارے الفاظ لڑکے کی سمجھ میں آ رہے تھے یا نہیں مگر یاسر کا تمتمایا ہوا چہرہ اور آگ بگولہ لہجہ اسے سب کچھ سمجھا رہا تھا۔ اس کا سانولا رنگ ایک دم ہی زرد

گیا اور ہونٹ تھرانے لگے۔

”دس...... سوری...... سر......“ اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

پچھلے کئی دنوں کا سارا غصہ یاسر کے لب و لہجے میں آ گیا تھا اور منہ سے لڑکے کے لئے سخت ترین الفاظ نکل رہے تھے۔ آخر میں وہ اس کے سینے پر انگلی چبھوتے ہوئے بولا۔

”اگر آئندہ تم نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی یا میرے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا بھی تو میں تمہارا حشر خراب کر دوں گا......“

لڑکے کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ مجرم کی طرح کھڑا تھا۔ پاس سے گزرنے والے چند راہ گیر رک کر ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ تکہ شاپ کے اندر سے بھی دو پریشان آنکھیں انہیں دیکھ رہی تھیں۔ جاتے جاتے یاسر نے ایک بار پھر لڑکے کو دھکیلا اور پاؤں سے سڑک کو کوٹتا ہوا ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

رات کو یاسر دو بجے کے لگ بھگ سویا۔ دو بجے تک اس نے کئی بار کھڑکی سے جھانکا۔ شریر آنکھوں والا لڑکا اسے نظر نہیں آیا۔ غالباً وہ شاپ پر ہی نہیں تھا...... شاید ڈھیر ساری بے عزتی ہضم کرنے کے لئے چند گھنٹوں کے لئے کہیں چلا گیا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے یاسر نے پھر کھڑکی سے جھانکا، بس اسٹاپ پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ گرجا گھر کے صحن میں مریم کے مجسمے کے آس پاس شمعیں گردش کر رہی تھیں۔ تکہ شاپ پر ناشتہ کرنے والے کھڑے تھے مگر لڑکا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا...... شام تک یاسر نے گاہے گاہے کئی مرتبہ کھڑکی سے جھانکا مگر وہ نظر نہیں آیا۔ تکہ شاپ کا فربہ اندام مالک جو موٹر سائیکل پر آتا جاتا رہتا تھا، ایک دو بار دکھائی دیا یا پھر دوسرا ملازم لڑکا جو ہر وقت نیکر اور بنیان پہنے رکھتا تھا۔

شام تک یاسر کو الجھن محسوس ہونے لگی۔ اس الجھن میں تھوڑا سا افسوس بھی شامل تھا۔ شاید اس نے لڑکے کو زیادہ ہی سخت سست کہہ دیا تھا۔ وہ کچی عمر کا تھا۔ غالباً ابھی اسے اپنے پیشے کے ادب آداب زیادہ نہیں آئے تھے۔

رات دس بجے کے لگ بھگ یاسر ٹہلتا ہوا تکہ شاپ کے قریب سے گزرا تو اس کے قدم یونہی شاپ کی طرف اٹھ گئے۔ شاپ پر اس وقت صرف ایک ملازم لڑکا تھا۔

وہ چکن کے چند پیس کوئلوں پر سینک رہا تھا۔ کھوکھا نما دکان کے اندر لکڑی کے دو چا
بینچ رکھے تھے۔ یاسر کو دیکھ کر ملازم لڑکا ایک دم نروس نظر آنے لگا۔

یاسر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تمہارا ساتھی کہاں ہے...... آج نظر نہیں آیا۔''

لڑکا ہکلا کر بولا۔ ''اُسے ...... مم...... مالک نے نکال دیا ہے...... مالک پہلے ہ
اس سے ناراض تھا۔ کل ایک دم ناراض ہو گیا۔ مالک کا کہنا ہے کہ اس نے آپ سے
بدتمیزی کی ہے۔''

یاسر ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔ اسے اتنے سخت ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

''کہاں گیا ہے وہ اب؟''

''پتہ نہیں جی...... اس کا تو کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ نہ ماں ہے نہ باپ۔ مالک
کے گھر میں ہی ایک شیڈ تلے پڑا رہتا تھا۔'' لڑکے کی گدلی آنکھوں میں آنسو چمک
گئے۔

یاسر خاموش کھڑا رہا۔ کھوکھا نما دکان کے اندر لکڑی کے ایک بینچ پر ایک خوبرو سفید
فام لڑکی بیٹھی تھی اور اُبلے چاول کھا رہی تھی۔

لڑکے کی آواز نے یاسر کو چونکایا۔ وہ شکستہ انگریزی میں بولا۔ ''صاحب! آپ
اُسے دربدر بھٹکنے سے بچا سکتے ہیں۔ آپ...... مالک سے اُس کی سفارش کریں...... و
اُسے پھر نوکری پر رکھ لے گا۔''

''بڑی فکر ہے تمہیں اس شاندار نوکری کی۔'' یاسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

لڑکا سمجھ نہیں سکا، بس اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ کہنے لگا۔ ''سر! ابھی وہ نیا نیا ہے۔
اسے گاہک سے بات کرنے کا پتہ نہیں ہے۔ جس کو چرغہ چاہئے ہوتا ہے اس کے
سامنے لڑکی کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے۔''

لڑکا یوں کہہ رہا تھا جیسے چرغہ اور لڑکی بیچنے میں کوئی خاص فرق نہیں۔ دونوں کا
ایک ہی جیسے قابلِ عزت پیشے کے زمرے میں آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس خاص
ماحول کا اثر تھا جس میں یہ نوعمر لڑکا رہتا تھا۔

''آ جاؤ مسٹر! میرے ساتھ یہ چاول شیئر کرو۔'' اندر بیٹھی لڑکی نے یاسر کو مخاطب کر
کے خوش اخلاقی سے کہا۔

''نہیں، شکریہ۔'' یاسر نے جواب دیا۔

''دو چمچ لے کر دیکھو...... بے حد مزیدار ہیں۔'' وہ اصرار سے بولی۔ اس کے ساتھ
اس نے رکابی میں سے کچھ چاول علیحدہ پلیٹ میں ڈال دیئے۔

یاسر مجبوراً اندر چلا گیا۔ یہ اُبلے ہوئے چاول تھے تاہم ان میں ذائقہ تھا۔ یاسر
ان ہوا کہ ڈالروں کی مالک یہ سفید فام لڑکی اس کھوکھا نما ہوٹل میں یہ اُبلے ہوئے
ول کھا رہی ہے۔

''آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''پاکستان سے۔''

''پھر تو آپ مسلمان ہوں گے۔ آپ کو اس ساتھ والے خوانچہ فروش سے حلال
شت بھی مل سکتا ہے۔ یہ دیکھئے، اس نے شوکیس میں اسٹکر لگا رکھا ہے۔''

تکہ شاپ کے ساتھ ہی ایک ریڑھی پر شیشے کے بکس میں چند چکن پیس اور مچھلیاں
ہوئی تھیں۔ ریڑھی بان بھی شکل وصورت سے مسلمان نظر آتا تھا۔ چکن کے ادھ
پکے ٹکڑوں کو مسالے وغیرہ لگا کر دیدہ زیب بنایا گیا تھا۔ یاسر کو بھوک بھی لگ رہی
ی۔ اس نے ہاف چکن کا آرڈر دے دیا۔ ریڑھی بان نے بڑے اسٹائلش انداز میں
ی شتابی سے ادھ پکے چرغے کو پانچ منٹ میں تیار کر دیا۔ یاسر کو اندیشہ محسوس ہو رہا
ا کہ اگر اس نے سفید فام لڑکی کو کھانے میں شامل ہونے کی دعوت دی تو یہ دعوت بلا
قف قبول کر لی جائے گی۔ پھر بھی وہ اخلاقی تقاضے کے تحت خاموش نہیں رہ سکا۔ اس
نے لڑکی کو اپنے ساتھ چکن شیئر کرنے کے لئے کہا۔ وہ تو جیسے اشارے کی منتظر بیٹھی
تھی۔ چاولوں کی رکابی اٹھا کر فوراً اس کی میز پر چلی آئی۔ اس نے کچھ چاول یاسر کی
پلیٹ میں ڈالے اور آدھا چکن اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے ٹھیک ٹھاک
بھوک لگی ہوئی تھی، بس مجبوری کے تحت خالی چاولوں پر گزارا کر رہی تھی۔

یاسر کھانے کے دوران میں چور نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی عمر چوبیس
پچیس سال رہی ہو گی۔ بال سنہری، آنکھیں نیلی اور جلد سفیدی مائل سرخ تھی۔ اس کا
تعلق یقیناً کسی یورپی ملک سے تھا۔ جسم تھوڑا سا فربہ تھا لیکن ایسا نہیں کہ بھدا محسوس
ہو۔ وہ کسی اچھے گھرانے سے لگتی تھی۔ کھانے کے دوران میں ہی اس نے اپنا نام

راکیل بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ ''پولینڈ'' سے تعلق رکھتی ہے۔

یاسر نے بھی اپنا مختصر تعارف کرایا۔

''تم کس ہوٹل میں رہتے ہو؟''

''یہ سامنے نیپون ہوٹل میں۔''

''اوہ گاڈ، میں بھی تو اسی ہوٹل میں ہوں۔ بلکہ پچھلے تین ہفتے سے ہوں۔ کون ر کمرا ہے تمہارا؟''

یاسر نے اپنے کمرے کا نمبر بتایا۔ وہ بولی۔

''اچھا، یہ کمرا تو سڑک کی طرف آتا ہے۔ میں ٹریفک کے شور سے الرجک ہوں اس لئے میرا کمرا دوسری طرف ہے۔ بہر حال ہم دونوں کا فلور ایک ہی ہے۔''

اچانک یاسر کو یاد آیا کہ اس نے ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھتے اترتے ہوئے اس سفید فام لڑکی کی جھلک دیکھی ہے۔ ایک روز شاید اس کے ساتھ کوئی انگریز فیملی بھی تھی۔ ب لوگ لابی میں کھڑے گپیں لگا رہے تھے۔

کھانا ختم ہوتے ہی یاسر نے اٹھنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ اپنی اپنی ادائیگی کے بعد دونوں اکٹھے ہی باہر آئے۔ ملازم لڑکے نے ایک بار پھر یاسر سے التجا کی۔

''آپ مالک سے میرے دوست کی سفارش ضرور کریئے گا۔''

یاسر نے کہا۔ ''اچھا کروں گا۔''

جبکہ دل میں اس نے کہا۔ ''اے کولمبو کے نادان لڑکے! تیرے دوست کی سفارش نہ کرنا ہی دراصل اس کی سفارش ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دنیا کے بدترین پیشے کی بجائے کوئی باعزت پیشہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجائے۔''

لڑکے کی ملتجی نگاہوں سے نظریں بچاتا ہوا یاسر آگے بڑھ گیا۔ لڑکی اس کے ساتھ ہی تھی۔ شستہ انگریزی میں بولی۔

''یہ کیا کہہ رہا تھا...... مجھے ان کا لہجہ سمجھ میں نہیں آتا۔''

یاسر بولا۔ ''یہ اپنے ساتھی کی بات کر رہا تھا۔ اسے نوکری دلوانا چاہتا ہے۔''

''تو تم یہاں نوکریاں دیتے ہو؟''

''نہیں، لوگوں کو نامناسب نوکریوں سے نکلواتا ہوں۔'' وہ ہولے سے مسکرایا۔

وہ بات کو پوری طرح سمجھی نہیں...... بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

یاسر ہوٹل کی طرف مڑنا چاہتا تھا لیکن وہ بولی۔ ''آئس کریم کھاؤ گے؟ یہاں منے ہی بڑی اچھی دکان ہے۔''

''مم...... میرا تو دل نہیں چاہتا...... اگر تم نے...... کھانی ہے تو چلے چلتے ہیں۔''

''سری لنکا کے مسالے بڑے تیز ہوتے ہیں۔ گلا جلنے لگا ہے۔''

''تو آؤ...... کھا لیتے ہیں۔'' یاسر کو ایک بار پھر اخلاقاً کہنا پڑا۔

وہ فوراً چل دی۔ یاسر کا قد چھ فٹ تھا۔ لڑکی کا قد یاسر سے ڈیڑھ دو انچ ہی کم ہو ا۔ اس نے ایک باریک سی ہیجان خیز شرٹ پہن رکھی تھی۔ زیریں جسم پر پتلون تھی۔ رٹ اور پتلون کے درمیان کمر کا کچھ علاقہ دیدارِ عام کے لئے خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔

وہ دو تین منٹ میں آئس کریم پارلر پر پہنچ گئے۔ یاسر نے ایک کپ کھایا لیکن اس ناء میں وہ دو کھا گئی۔ یاسر کا خیال تھا کہ اس مرتبہ وہ ادائیگی کے لئے اصرار کرے ی۔ مگر اسے حیرت ہوئی جب وہ خاموش رہی اور ادائیگی یاسر کو کرنا پڑی۔

کن کن مزاجوں کے کیسے کیسے لوگ پائے جاتے ہیں؟...... یاسر سوچنے پر مجبور ہو ا تھا۔

آئس کریم کھا کر وہ نکلے تو راکیل سرِ راہ ایک دکان پر کھڑی ہوگئی۔ وہ بڑے تجسس ے شوکیس میں رکھی ہوئی اشیاء دیکھنے لگی۔ اس شاپ میں زیادہ تر گفٹ آئٹمز تھے۔ ر اور بانس کے چھلکے سے بنی ہوئی مصنوعات، تنکوں کے ہیٹ، ڈیکوریشن پیس، تریاں اور پتہ نہیں کیا کچھ۔ راکیل کی نظریں ایک خوبصورت شولڈر بیگ پر تھیں۔ یہ ا گوان اور بید کے نفیس ریشوں سے بنایا گیا تھا۔ وہ اندر گئی، بیگ کو اُلٹ پلٹ کر بھتی رہی پھر خرید لیا۔ اپنی پتلون کے بیلٹ پرس میں سے اس نے ادائیگی کے لئے م نکالی تو یاسر نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن جلد ہی یہ اطمینان رخصت بھی ہوگیا۔ کیل نے رقم گن لی۔ وہ کم تھی۔ اس نے چہرے پر اُلجھن کے آثار سجا لئے۔

''یہ تو غلطی ہوگئی۔'' وہ بولی۔ ''میں نے سمجھا 800 روپے پورے ہوجائیں گے۔''

''کتنے ہیں؟'' یاسر نے پوچھا۔

"صرف پانچ سو۔"

سیلز گرل رسید کاٹ چکی تھی اور اب سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف د رہی تھی۔ یاسر نے جلدی سے حساب لگایا، 300 سری لنکن۔ اس کا مطلب ہے کہ ق 175 پاکستانی۔ رقم کوئی بہت زیادہ نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ لڑکی اتنی گئی گزری نہیں لگ تھی۔ ممکن تھا کہ ہوٹل پہنچ کر یہ رقم لوٹا ہی دیتی۔

وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ "کوئی بات نہیں...... اگر تمہارے پرس میں نہیں تو م دے دیتا ہوں۔"

"شکریہ...... بہت شکریہ۔ میں تمہیں لوٹا دوں گی۔ دراصل میرے پاس اٹا ڈالرز تو اب بھی موجود ہیں لیکن ان کی ویلیو یہاں کم ہے۔ مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں ہی ڈالر لے لیتی۔"

یاسر نے 300 سری لنکن روپے اپنے پاس سے ادا کر دیئے۔ دونوں باتیں کر ہوئے ہوٹل کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔

ہوٹل کی قالین پوش سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ بولی۔ "آؤ میں تمہیں اپنا کمرا دوں۔"

یاسر ایک بار پھر اخلاقاً انکار نہ کر سکا۔ ہوٹل کی راہداری میں وہ اس کے آگے آ جا رہی تھی۔ یاسر پتلون اور شرٹ کے درمیانی علاقے سے نگاہ بچاتا ہوا اس کے چل رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک کشادہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ یاسر کے کمر اور اس کمرے میں بس اتنا فرق تھا کہ یہاں ٹریفک کا شور سنائی نہیں دیتا تھا۔ کمر میں وہ ساری اشیاء بکھری ہوئی تھیں جو سیاحوں اور سیلانیوں کے اسباب کا حصہ ہیں۔ رُک سیک، جوگرز، ٹیلی اسکوپ، کیمرا، اٹلس اور اس قسم کی دوسری اشیاء۔ صو پر راکیل کے کپڑے بے ترتیب پڑے تھے۔ اس نے جلدی سے سمیٹ کر یاسر بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔

"نہیں، میں چلتا ہوں۔" وہ بولا۔

"دو منٹ تو بیٹھو...... ورنہ میں سمجھنے پر مجبور ہوں گی کہ انڈین تم سے زیادہ با ا

دیتے ہیں۔ پرسوں ایک سردار صاحب ملے تھے، ان کے جوشیلے قہقہے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔"

اس نے دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ یاسر بیٹھ گیا۔

"ایک سیکنڈ، میں چینج کر کے آتی ہوں۔ گرمی لگ رہی ہے۔"

وہ شڑاپ سے واش روم میں چلی گئی۔ جاتے جاتے آڈیو پر مائیکل جیکسن کو چیختا چھوڑ گئی۔ سائیڈ ٹیبل پر سستے سے چاکلیٹ، بسکٹ اور عام سے دودھ کا پیکٹ پڑا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ تو کچھ تنگ لگ رہا تھا۔ (تنگ دستی کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ ایک نان ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں مقیم تھی۔ کوئی بھی باحیثیت یورپین سخت مجبوری کے بغیر کولمبو میں اس طرح کی مفاہمت نہیں کر سکتا)

دو چار منٹ بعد وہ باہر نکلی تو اس نے چھوٹا سا سلیولیس کرتہ پہن رکھا تھا، ساتھ میں چست نیکر تھی۔ اس لباس میں اس کا جسم بھی مائیکل جیکسن کے گانے کی طرح لگ رہا تھا، یعنی چیختا چنگھاڑتا اور تھرتھراتا ہوا۔ یاسر کی رائے لئے بغیر ہی اس نے الماری سے سری لنکا کی چہیتی بیئر "لائن" نکالی اور گلاس لبالب بھر لیا۔

"تمہارے لئے بھی؟" اس نے پوچھا۔

"بہت شکریہ...... میں چلتا ہوں۔"

"اوہو...... نہ پینا...... لیکن بیٹھو تو سہی۔"

وہ پورا گلاس ایک سانس میں چڑھا گئی۔ یاسر یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ تین سانس میں پیتے ہیں۔

وہ صوفے پر پیچھے کو کھسکتے ہوئے بولی۔

"میں اور میرا دوست راجر پولینڈ سے اکٹھے ہی روانہ ہوئے تھے۔ ہم پہلے چیکوسلواکیہ گئے، پھر آسٹریا، پھر اٹلی آئے۔ ہم قریباً چھ مہینے رات دن ایک ساتھ رہے۔ تم جانتے ہی ہو جب بندہ دن رات ایک ساتھ رہتا ہے تو بعض اوقات "اپ سیٹ" ہو جاتا ہے، چھوٹی چھوٹی بات پر جھگڑنے لگتا ہے، جھنجلانے لگتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہماری لڑائیاں ویانا میں ہی شروع ہو گئی تھیں۔ روم پہنچتے پہنچتے باقاعدہ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ راجر نے مجھے تھپڑ مارا، میں نے اُس کے پیٹ میں لات

ماری۔ یہ لات کھا کر اُس کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ وہ سیدھا ملائشیا چلا گیا، میں یہاں سری لنکا آ گئی۔ ہم نے سوچا کہ ایک ساتھ رہ رہ کر لڑنے جھگڑنے اور تعلقات کا خ... کر دینے سے بہتر ہے کہ ہم علیحدہ علیحدہ سفر کریں اور انجوائے کریں۔ عین ممکن ہے کہ کچھ عرصے بعد ہماری رنجشیں دور ہو جائیں، ہم پھر کسی موقع پر اکٹھے سفر کرنے کے قابل ہو جائیں۔''

''یعنی اب تم اکیلی چل رہی ہو۔''

''ہاں...... میں یہاں سے انڈیا جاؤں گی۔ انڈیا مجھے سات آٹھ ہفتے تک رہنا ہے۔ جب میں انڈیا چھوڑ رہی ہوں گی، راجر سنگا پور میں ہوگا۔ اُس وقت میں ایک بار اُس سے رابطہ کروں گی۔ اگر ہمارے تعلقات کی بحالی کی کوئی شکل نکل آئی تو ہم دونوں سری لنکا میں آئیں گے، یہاں دو ہفتے اکٹھے گزاریں گے اور واپس پولینڈ چلے جائیں گے۔ دوسری صورت میں، میں انڈیا سے ہی وارسا واپس روانہ ہو جاؤں گی۔''

''وارسا میں تم کیا کرتی ہو؟''

''میں وہاں گونگے بہرے بچوں کے ایک سکول میں ٹیچر ہوں۔ ابتدائی کلاسوں کو پڑھاتی ہوں۔''

''اور راجر؟''

''وہ ایک میوزیکل گروپ میں FLUTE بجاتا ہے۔ پروفیشنل میوزیشن ہے۔''

اس کی نیلی آنکھوں سے خمار جھانکنے لگا تھا۔ یقیناً یہ اُس گلاس کا کرشمہ تھا جو تھوڑی دیر پہلے غٹاغٹ پی گئی تھی۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' یاسر اٹھتے ہوئے بولا۔

''تھوڑی دیر تو بیٹھو۔ جا کر سونا ہی ہے۔ میں تمہیں جیکسن کا ایک نیا گانا سنا... ہوں...... بالکل نیا...... تم اس کا وڈیو دیکھو تو پاگل ہو جاؤ۔''

''میں وڈیو دیکھے بغیر بھی پاگل ہو رہا ہوں۔'' یاسر نے کہا۔

وہ اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے حرکت میں آئی اور بلی کی طرح ہاتھوں ا... گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی آڈیو سسٹم کے پاس پہنچ گئی۔ اس ''مختصر سفر'' کے دوران م... اس نے اپنے جسم کے زاویوں کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ جیکسن کا نیا گ...

کمرے میں گونجنے لگا۔ میوزک کے شور میں الفاظ دب گئے تھے۔ بس خال خال ہی کوئی بول سمجھ میں آتا تھا ...... وقت نے گزر جانا ہے...... ایسے بھی اور ایسے بھی...... بس اس سے لطف اٹھا لو......

لطف اٹھا لو کے الفاظ قوالی کی صورت میں بار بار استعمال کیے گئے تھے۔ راکیل نے عجیب نظروں سے یاسر کی طرف دیکھا اور بولی۔

''یہ اپنا جیکسن اکثر بڑے پتے کی بات کہتا ہے۔''

اچانک یاسر بری طرح چونک گیا۔ اس پر یہ عقدہ کھلا کہ راکیل ''قیمت'' چکانا چاہ رہی ہے۔ ایک چھوٹے سے چکن پیس، دو کپ آئس کریم اور 300 سری لنکن روپے کی قیمت۔ وہ حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک خوبصورت یورپین لڑکی اتنی سستی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں معنی خیز دعوت تھی۔ یاسر ایک دم کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا......؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''میں تمہاری طرح مائیکل جیکسن کا پرستار نہیں ہوں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''لیکن میں سمجھ گیا ہوں۔'' اس نے کہا اور ہانپتا ہوا سا باہر نکل آیا۔

اگلے روز تک وہ یہ اہم واقعہ بھول چکا تھا۔ درحقیقت کنول کے خیالات اس کے دل و دماغ پر اتنی شدت سے حاوی تھے کہ کوئی اور بات یاد ہی نہیں رہتی تھی۔ کنول کو کولمبو سے گئے تین روز ہو چکے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے فون کا انتظار کر رہی ہوگی۔ کنول کے انتظار کو پرسوں تک عروج پر پہنچ جانا تھا۔ پرسوں جمعہ تھا اور طے یہ ہوا تھا کہ اگر یاسر نے سوموار کی شام کو فون نہ کیا تو جمعے کو ہر صورت فون کرے گا اور تازہ ترین صورت حال بتائے گا۔ ابھی جمعہ آنے میں دو دن باقی تھے۔

بدھ کا سارا دن بھی یاسر نے کمرے میں رہ کر گزار دیا۔ پتہ نہیں کیوں وہ گاہے گاہے فون سیٹ کو گھورنے لگتا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر اسے کسی کے فون کا انتظار تھا۔ کنول سے رخصتی کے لمحات بار بار یاسر کی نگاہوں کے سامنے آ جاتے تھے۔ ان الوداعی لمحوں میں یاسر نے ڈھکے چھپے لفظوں میں ایک بات کہی تھی۔ خبر نہیں کہ وہ بات

کنول کی سمجھ میں آئی تھی یا نہیں...... اور اگر آئی تھی تو اس کا کیا ردِعمل ہوا تھا۔ ان لمحوں میں وہ کچھ کھوسی گئی تھی۔ چہرہ بے تاثر سا ہو گیا تھا۔ پھر ایک دم سیاحوں کے ایک پُرشور ریلے نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے اوجھل کر دیا تھا۔ یاسر کئی بار سوچ چکا تھا...... اگر کنول کو کچھ کہنے کا موقع ملتا تو وہ کیا کہتی؟

شام کی چائے کے وقت راکیل اُس کے کمرے میں آ دھمکی۔ یاسر کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ اسے لگا کہ راکیل سے جان پہچان پیدا کر کے اس نے اپنی آزادی کے پاؤں پر کلہاڑا مار لیا ہے۔ بہتر تھا کہ وہ تکہ شاپ میں اس کے اُبلے ہوئے چاولوں کی دعوت مروتاً بھی قبول نہ کرتا۔

راکیل نے چائے اس کے ساتھ پی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش دعوت اب بھی موجود تھی۔ سری لنکا میں عام چیزوں کے علاوہ امپورٹڈ چیزیں بھی سستی تھیں لیکن اتنی سستی ہوں گی، یاسر کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ ایک چکن پیس اور دو کپ آئس کریم کے بدلے میں ...... مائیکل جیکسن کے ذریعے پیغام ...... وقت نے گزر ہی جانا ہے، ایسے بھی...... اور ایسے بھی...... لطف اٹھا لو...... لطف اٹھا لو......

راکیل کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' یاسر نے پوچھا۔

''آج کل ہیری پوٹر پڑھ رہی ہوں۔''

''کتابیں پڑھنے کے باوجود زندگی کے بارے میں تمہارا رویہ غیر کتابی ہے۔'' یاسر نے کہا۔

''کیوں...... تم نے یہ کیوں محسوس کیا؟''

''خیر چھوڑو اس بات کو...... کولمبو سے کہاں جانے کا پروگرام ہے؟''

''کینڈی یا پھر...... نوریلیا...... لل...... لیکن......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ یاسر اس سے ادھورا فقرہ مکمل کرنے کو کہے گا۔ یہ توقع پوری نہیں ہوئی تو وہ خود ہی بولی۔ ''دراصل آج کل میں کچھ تنگ دستی کا شکار ہوں۔ بہتر تھا کہ میرے پاس ٹریول چیک ہوتے۔ کیش رقم کسی بھی وقت دھوکا دے دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ پندرہ بیس روز پہلے میرا پرس ماؤنٹ لیوینیا میں کہیں گر گیا یا شاید

میں کہیں رکھ کر بھول گئی۔ دراصل اس دن ساحل پر موسم بہت خوشگوار تھا اور میں نے ریڈ وائن کے دو پیگ لگا رکھے تھے...... میری زیادہ تر رقم پرس میں ہی تھی...... اب میں نے خط لکھ کر اپنے چچا سے مزید رقم منگوائی ہے۔ امید ہے کہ دو چار روز تک پہنچ جائے گی۔ اس کے بعد ہی پروگرام کو حتمی شکل دوں گی۔''

یاسر نے اس معاملے کو مزید نہیں کریدا۔ اس سے اپنی جیب ہلکی ہونے کا اندیشہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہو مگر فی الوقت یاسر کے پاس بھی زرِمبادلہ محدود ہی تھا۔

اگلے دو روز میں راکیل سے گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہی۔ کبھی لابی میں ٹی وی کے سامنے، کبھی کوریڈور میں۔ ایک دو بار وہ کمرے میں بھی آئی لیکن یاسر نے اسے کمرے سے باہر ملنا ہی مناسب سمجھا۔ یوں تو وہ شائستہ تھی، اس کی گفتگو کا انداز بھی خوبصورت تھا لیکن یاسر کو یوں لگتا تھا کہ وہ آج کل سرِ راہ رکھی ہوئی مشین کی طرح ہے جس میں کوئی بھی چند سکے ڈال کر اپنی مرضی کا کولڈ ڈرنک نکال سکتا ہے۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلو یاسر کے لئے بے حد کراہت آمیز تھا۔



وقت دھیرے دھیرے کھسکتا رہا اور آخر جمعہ کی شام بھی پہنچ گئی۔ آج یاسر کا وعدہ تھا...... فون کا وعدہ...... آج اسے کینڈی فون کرنا تھا۔ مگر آج اس نے فون نہیں کرنا تھا...... دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ہُو...... پتہ نہیں یہ کیا تھا؟ خود اذیتی تھی، خود پسندی تھی، فرسٹریشن تھی یا کوئی اور بلا؟ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کنول کو انکار کر رہا تھا اور اس انکار میں ایک طرح کی لذت بھی پوشیدہ تھی۔ اس نے نگاہِ تصور سے دیکھا، کینڈی کی جھیل کے کنارے کسی مکان میں کنول اُس کے فون کا انتظار کر رہی ہے۔ بار بار گھڑی دیکھ رہی ہے، بے چین ہو رہی ہے۔

ہوٹل کے فون عارضی طور پر خراب تھے لیکن اگر یاسر چاہتا تو وہ سڑک کے پار سبز بورڈ والے پی سی او پر جا کر فون کر سکتا تھا۔ مگر وہ کمرے میں بیٹھا رہا۔ اس درد کا لطف لیتا رہا جو وہ خود جھیل رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کوئی اور بھی جھیل رہا تھا۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ یاسر کے فون کا مسلسل انتظار کرنے کے بعد کنول ہوٹل کے نمبر پر اسے فون کرے۔ لیکن فون تو خراب پڑے تھے۔

رات ایک عجیب سی کیفیت میں گزری۔ اگلے روز دس گیارہ بجے تک ہوٹل کا ٹیلیفونک نظام درست ہو گیا۔ یاسر کے دل میں میٹھی میٹھی تمنا جاگی کہ کنول اسے فون کرے۔ اس سے پوچھے کہ اس نے کل اسے کیوں انتظار کی سُولی پر لٹکائے رکھا؟ کیوں فون نہیں کیا؟ یہ ایک لاحاصل تمنا تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں یاسر کے دل میں آج کل ایسی ہی تمنائیں جاگ رہی تھیں۔

موسم بہت خوشگوار تھا۔ ویسے بھی یہ ہفتے کی شام تھی۔ راکیل نے آکر اُسے بتایا کہ ہوٹل گلاداری میں بڑا شاندار میوزیکل شو ہو رہا ہے۔ ایک امریکی ٹی وی چینل کے اسٹار گلوکار پرفارم کر رہے ہیں۔ ٹکٹ بھی معمولی ہے۔ وہ اسے ساتھ لے جانا چاہتی تھی

لیکن یاسر کو تو سری لنکا کے سربراہ کا آفیشل بلاوا بھی آجاتا تو وہ نہ جاتا۔ اُسے اس کمرے میں رہنا تھا اور کنول کے فون کا انتظار کرنا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ راکیل نے بدمزہ ہوئے بغیر مسکرائی اور بل کھاتی ہوئی چلی گئی۔ پتلون اور شرٹ کے "درمیانی علاقے" کی سرحدیں آج کچھ اور بھی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

یاسر رات گئے تک فون کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آیا۔ اگلا دن بھی اسی انتظار کے ساتھ شروع ہوا۔ گزرنے والے ہر پل کے ساتھ اس کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب ایک بار پھر اُس کا دھیان آخری لمحات کی صورت حال کی طرف جانے لگا تھا۔ آخری لمحات میں یاسر نے جو کچھ کہا تھا وہ معنی خیز تھا۔ شاید کنول اس کے معنی جان گئی تھی۔ اگر وہ جان گئی تھی تو پھر اس کا گریز سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ وہ اپنے منگیتر کی تلاش میں تھی۔ وہ اسے چاہتی تھی، اس کے گھر والے اسے چاہتے تھے اور خاص طور سے کنول کی والدہ...... ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ کنول ان کے پیارے بھانجے کی دُلہن بنے...... برسوں سے قائم رشتوں ناطوں کے درمیان دس دن کے رشتے کی کیا اہمیت تھی۔ ہاں وہ دس دن ہی تو تھے، جمعہ سے لے کر اگلے ویک اینڈ تک۔

کبھی یاسر کا ذہن دوسرے رُخ پر سفر کرنے لگتا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اُس نے پرسوں ہوٹل کے نمبر پر فون کیا ہو۔ کل وہ کہیں کینڈی سے باہر چلی گئی ہو اور آج واپس آکر اُسے پھر کال کرے۔ یا پھر...... یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ کسی نجی مسئلے میں الجھی ہوئی ہو۔ زندگی میں شدید قسم کے مدوجزر ہوتے ہیں۔ اس نے اپنی والدہ کی آنکھوں کی تکلیف کے بارے میں بتایا تھا، کہیں ان کی تکلیف نہ بڑھ گئی ہو۔ ایک امکان اور بھی تھا۔ کنول سے ہوٹل کا فون نمبر گم ہو سکتا تھا۔ کمرے کے کرائے کی ایک رسید ہی تو تھی اس کے پاس۔ ممکن تھا کہ وہ کہیں گم ہو گئی ہو یا وہ کہیں رکھ کر بھول گئی ہو۔ ایسے ان گنت خوشگوار اور ناخوشگوار امکانات تھے۔

کل رات یاسر نے کولمبو میں اپنی ایکسپوز کی ہوئی فلموں میں سے ایک فلم پرنٹ کروا لی تھی۔ اس میں کنول کی بھی کئی تصویریں تھیں۔ وہ یہ تصویریں کل سے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ آج پھر اس نے یہ تصویریں دیکھنا شروع کر دیں۔ وہ کھو سا گیا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ یہ گھنٹی جیسے یاسر کے پورے جسم میں گونج گئی۔ اُسے لگا کہ گرد و پیش کی ہر شے میں جیسے برقی رو دوڑ گئی ہے۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف یاسر کی بہن شمائلہ تھی۔

"بھائی جان! کن چکروں میں پھنس گئے ہیں...... کہیں دال میں کالا تو نہیں؟" وہ چھوٹتے ہی بولی۔

یاسر چند لمحے خاموش رہا پھر سنبھل کر بولا۔ "یہاں تو ساری دال ہی کالی ہے بھئی ...... اور اگر کالی نہیں تو سانولی ضرور ہے۔"

"مگر بڑے بھائی جان کہتے ہیں کہ آج کل وہاں گورے چٹے ٹورسٹ بھی بے شمار ہوتے ہیں۔ ہر ہوٹل میں دندناتے پھرتے ہیں۔"

"بے فکر رہو...... یہاں کوئی نہیں۔" یاسر ہکلایا۔ غالباً اس کا دھیان ایک لحظہ کے لئے راکیل کی طرف چلا گیا تھا۔

کچھ دیر چھیڑ چھاڑ کے بعد وہ بولی۔ "اچھا ابو سے بات کریں۔"

چند سیکنڈ بعد ابو کی شفقت بھری آواز ریسیور پر ابھری اور یاسر کے رگ و پے میں تازگی دوڑ گئی۔ والدہ کی وفات کے بعد ابو نے حقیقتاً دوہری ذمے داری نبھائی تھی۔ یاسر اور شمائلہ کو امی کے حصے کا پیار بھی دیا تھا......

"ابو! آپ کیسے ہیں؟"

"ہم تو سب ٹھیک ہیں...... تم سناؤ، اپنے اونٹ کی مہاریں کب موڑ رہے ہو؟"

"ابو! سری لنکا ایک دم بیوٹی فل ہے۔ ایک انڈین یہاں دوست بن گیا ہے۔ سوچ رہا ہوں دو چار دن اس کے ساتھ گھوم لوں۔ ویسے دفتر کا کام تو ختم ہی ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو پہلی فلائٹ سے واپس آ جاتا ہوں۔"

"نہیں، نہیں...... ایسی بھی کوئی جلدی نہیں۔ تم چند دن مزید انجوائے کر لو۔ مگر دفتر کا حرج تو نہیں ہوگا؟"

"دراصل ایک نئی اسائن منٹ پر کام شروع ہونے والا ہے۔ شاید کافی سے زیادہ اوور ٹائم بھی کرنا پڑے۔ آج کل کچھ فرصت ہے۔ میں نے لاہور میں چغتائی صاحب سے بات کی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے، دو چار دن گھوم لو۔

دو چار منٹ تک ابو اور شمائلہ سے یاسر کی بات ہوئی۔ اس گفتگو نے کچھ دیر کے لئے ہی سہی لیکن اس کا دھیان اپنی اندرونی ہلچل سے ہٹا دیا۔

یہ اتوار کا دن تھا، سامنے گرجے کے اندر غیر معمولی چہل پہل تھی۔ مریم کے شیشہ بند مجسمے کے سامنے شمعیں گردش کر رہی تھیں اور دعائیں سرسرا رہی تھیں۔ جب اذیت برداشت کی حدوں کو چھونے لگتی ہے تو اکثر اپنے پیدا کرنے والے کی طرف دھیان جاتا ہے۔ یاسر کا دھیان بھی اپنے قادرِ مطلق، اپنے رب العزت کی طرف جا رہا تھا۔

وہ رات یاسر نے شدید ترین بے چینی کے عالم میں گزاری۔ درد کا عفریت اس کے سینے کو ہی نہیں بھنبھوڑ رہا تھا اس کی ہڈیوں میں بھی سرایت کر رہا تھا۔ ایک ایسی اذیت تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا مگر اس کے باوجود اس اذیت میں لذت کا عنصر بھی تھا۔ یہ کیسی کیفیت تھی، کیسا تجربہ تھا، اس میں شدید ترین غصہ بھی تھا اور شدید ترین پیار بھی۔ اس میں انتہا درجے کی دوستی تھی اور انتہا درجے کی دشمنی بھی۔ اس میں حیران کن انکساری بھی تھی اور غیر معمولی جارحیت بھی۔ یہ کیفیت بیک وقت دلگداز اور بھیانک تھی۔ اسے ماضی میں پڑھی ہوئی ایک انگلش کہانی یاد آنے لگی۔ اس کا عنوان بھی بھیانک محبت تھا۔ محبت جو خون کو بھاپ بناتی ہے، جو ہڈیوں کو چباتی ہے، بندے کو توڑ پھوڑ کر ریزہ ریزہ کرتی ہے، پھر بھی اتنی پیاری لگتی ہے کہ کرب میں ڈوب کر بھی اس کا منہ چومنے کو دل چاہتا ہے۔ ہاں، یہ بھیانک محبت تھی۔

اگلا دن سوموار کا تھا۔ کسی سے جدا ہوئے پورا ہفتہ ہو گیا تھا۔ یاسر کی نگاہیں فون سیٹ پر منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ استقبالیہ کے کئی چکر لگا آیا تھا۔ وہاں بیٹھی ہوئی ساڑھی پوش، سنجیدہ صورت خاتون کو بڑی صراحت سے سمجھا آیا تھا کہ اگر اس کی کال آئے تو اسے فوراً کمرے کے فون پر منتقل کر دیا جائے۔ سوموار کا سارا دن بھی شدید ترین کرب کے عالم میں گزرا۔ شام تک یاسر کی یہ کیفیت ہوئی کہ اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسے لگا کہ کچھ ہو جائے گا۔ شاید سینے میں اس کا دل پھٹ جائے، یا مضطرب خون اس کی آنکھوں کے راستے اچھل کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

وہ کمرے سے نکل آیا۔ اس نے بے چینی کے عالم میں گریبان کے بٹن کھول دیئے اور تیز تیز چلنے لگا۔ تکہ شاپ اور گرجا گھر کے سامنے سے ہوتا ہوا وہ بڑی سڑک

پر آ گیا۔ وہ چلتا گیا اور بس چلتا گیا...... چلنے سے اسے سکون مل رہا تھا لیکن پھر اس سکون میں یہ بے قراری بھی شامل ہوگئی کہ کہیں اس کی غیر موجودگی میں کنول کا فون نہ آ جائے...... ہاں اس کے پاؤں میں زنجیر تھی۔ وہ اپنے قفس سے زیادہ دور بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ واپس آ گیا۔ رات کے نو بج رہے تھے، وہ بمشکل آدھ گھنٹہ باہر رہا تھا۔ واپس آتے ہی اس نے استقبالیہ کی ساڑھی پوش خاتون سے پوچھا۔

''کوئی فون تو نہیں آیا میڈم؟''

وہ مسکرائی اور نفی میں جواب دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کی ذہنی صحت پر شک کر رہی ہو۔

وہ نڈھال قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آ گیا۔ اس نے وارڈ روب کھولی۔ کنول کی تحفے میں دی ہوئی خوبصورت شرٹ ہینگر میں جھول رہی تھی۔ وہ عجیب بے خودی کے عالم میں اس پر ہاتھ پھیرتا رہا، پھر اس کی نگاہ دوسرے جوڑے پر پڑی۔ براؤن پتلون اور گرے دھاریوں والی قمیص...... یہ جوڑا کنول کے ہاتھوں نے استری کیا تھا اور اسی کے ہاتھوں نے ہینگر پر لٹکایا تھا اور اس نے جانے سے پہلے کہا تھا۔

''کینڈی آتے ہوئے یہی کپڑے پہن کر آنا۔''

یاسر کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بے ساختہ ہینگر کی طرف بڑھ گئے۔ اس نے یہ جوڑا اتار کر سامنے صوفے پر رکھ دیا...... پتہ نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کینڈی جائے...... ضرور جائے...... یوں ہار مان کر، شکست کھا کر پاکستان واپس لوٹ جانا کسی طور ٹھیک نہیں تھا۔ یہ تو اپنے سینے میں ساری عمر کا روگ پالنے والی بات تھی۔ اسے کم از کم ایک بار ضرور کنول سے ملنا چاہئے...... جاننا چاہئے کہ وہ کیا سوچ رہی ہے، اس نے فون کیوں نہیں کیا ہے، یا کیوں نہیں کر سکی ہے۔ کینڈی جا کر اس کے حالات کیا ہوئے ہیں؟...... وہ سوچتا رہا اور بے قراری سے شفاف فرش پر چکراتا رہا۔ گاہے گاہے اس کی نگاہ فون سیٹ کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ فون سیٹ خاموش تھا۔

وہ کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ اس کی نگاہ نیچے سڑک پر گئی۔ راکیل ایک خوش شکل سری لنکن نوجوان کے بازو میں بازو ڈالے ہوٹل کے مین دروازے میں داخل ہو رہی

تھی۔ شاید آج اس نے پھر چکن کھایا تھا اور آئس کریم پارلر تک گئی تھی......



منگل کے روز یاسر نے قریباً بارہ بجے تک کنول کے فون کا انتظار کیا، پھر اچانک اس کے سینے میں درد و کرب کی ایک بلند لہر اٹھی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کو جو پتلون قمیص اس نے وارڈ روب سے نکالی تھی وہ ابھی تک صوفے پر پڑی تھی۔ یہ کپڑے لے کر وہ واش روم میں گھس گیا۔ وہ کینڈی جانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا اور یہ ارادہ بھی کر چکا تھا کہ آج ہی جائے گا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ سیدھا کنول کے پاس ہی جاتا۔ وہ کینڈی میں کہیں بھی ٹھہر سکتا تھا۔ کینڈی بہت بڑا شہر نہیں تھا۔ وہاں کنول سے اس کا ٹاکرا ہو سکتا تھا۔ وہ وہاں اپنے منگیتر کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اس مقصد سے اس نے تفریحی مقامات کے چکر لگانا تھے، بازاروں میں گھومنا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اسے اتفاقاً کہیں مل جاتی۔ اور اگر نہ بھی ملتی تو پھر اسے فون کیا جا سکتا تھا۔ فون کرنے میں ایک طرح سے انا کو ٹھیس تو پہنچتی تھی، لیکن جب کوئی صورت نہ بچتی تو بہ امر مجبوری ایسا کیا جا سکتا تھا۔

کچھ عجیب ذہنی کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔ خود اپنے آپ کو بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ نہا کر اور کپڑے پہن کر پیکنگ میں مصروف ہو گیا۔ جب تیاری مکمل ہوگئی اور وہ استقبالیہ پر واجبات کی ادائیگی کے لئے کمرے سے نکلا تو ایکا ایکی اس کے اندر کا موسم پھر بدل گیا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ وہ واپس کمرے میں گھس گیا اور دروازہ بند کر کے بستر پر گر گیا۔

وہ کیوں جا رہا ہے کینڈی؟ کس کے لئے جا رہا ہے؟ وہ تو اتنی بے حس ہے کہ اس نے اسے فون تک کرنا گوارا نہیں کیا...... یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ کس حال میں ہے...... جی رہا ہے کہ مر رہا ہے۔ وہ کیوں جائے اس کے پاس؟ لعنت ہے اس پر...... اور اس کے حالات پر...... وہ اس کی ہے ہی نہیں...... وہ تو کسی اور کی ہے۔ اس کی محبتیں، مسکراہٹیں اور لگاوٹیں سب رسمی چیزیں تھیں۔ اس کی جگہ کوئی بھی بکر زید ہوتا وہ اس کے ساتھ اسی طرح وقت گزارتی۔

غم و غصے کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی۔ سامنے ہی تپائی پر وہ خوبصورت

ڈبہ پڑا تھا جس میں کنول نے اسے قمیص کا تحفہ دیا تھا۔ یاسر نے ڈبے کے ٹکڑے دیئے۔ پھر وہ وارڈ روب کی طرف بڑھا۔ اس نے گریبان کو جھٹکا دیا، قیمتی قمیص کے بٹن ٹوٹتے چلے گئے مگر کپڑا مضبوط تھا۔ قمیص پھٹی نہیں۔ یاسر نے اسے دو تین جھٹکے دیئے، پھر قمیص کو پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر ڈسٹ بن کی طرف پھینک دیا۔ اگر کنول اس کے سامنے ہوتی تو شاید وہ اس کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا سلوک کرتا۔

اس نے پیک کیا ہوا سامان پھر سے کھول دیا۔ ٹائی اتار کر بستر پر پھینک دی اور خود صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

بمشکل دو یا تین منٹ گزرے ہوں گے کہ فون کی گھنٹی بجی...... اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف کنول تھی۔

"ہیلو، کون؟" کنول کی سپاٹ آواز سنائی دی۔

"ہیلو...... میں یاسر بول رہا ہوں۔"

"کیسے ہو یاسر؟" کنول نے کہا۔ آواز میں کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

"بس ٹھیک ہوں۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"تم نے فون نہیں کیا؟"

"تمہیں بڑی جلدی خیال آ گیا میرے فون کا۔"

"دراصل یہاں آتے ہی کچھ الجھ گئی تھی...... اور ایک خبر بھی ہے تمہارے لئے۔"

یکبارگی یاسر کا دل زور سے دھڑکا۔ اندیشے کی ایک لہر جسم میں دوڑی۔ خاور کا نام ذہن میں گونجنے لگا۔

"کیسی خبر؟" اس نے پوچھا۔

"امی بھی یہاں آ گئی ہیں...... چاچو بھی ساتھ ہیں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"خیر اتنی اچھی بھی نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ امی کی آنکھوں کا مسئلہ ہے۔ آج کل تکلیف کچھ بڑھ گئی ہے۔ یہاں دیدی آشا نے ایک بڑے اچھے آئی سپیشلسٹ سے رابطہ کیا تھا، انہوں نے امی کو فوراً سری لنکا بلوا لیا۔ امی آئیں تو ساتھ میں چاچو کو بھی آنا پڑا...... لیکن یہ ساری باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی، ابھی تم یہ بتاؤ کہ تم نے

کیوں نہیں کیا تھا؟ تمہیں پتہ ہے میں نے کتنا انتظار کیا ہے تمہارے فون کا؟"

ری الفاظ کہتے کہتے اس کا اسپاٹ لہجہ "اسپاٹ" نہیں رہا۔

"اگر میں کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں کر سکا تھا تو تم کر لیتیں۔"

"میں نے کیا تھا...... لیکن ہوٹل کے فون خراب تھے۔"

"تو تم اگلے روز کر لیتیں۔"

"میں نے سوچا...... شاید تم ملنا ہی نہیں چاہتے ہو۔" وہ اداسی سے بولی۔

"پھر اب کیوں کیا ہے؟"

"اب بھی ڈرتے ڈرتے کیا ہے...... کیا پتہ تم کیا جواب دو یا پھر آواز سن کر ہی بند دو۔"

"بہت افسوس کی بات ہے......" یاسر کے سینے میں جمی ہوئی ساری برف ایک گوار دھوپ سے پگھلنے لگی۔

"افسوس تو مجھے ہونا چاہئے...... فون کرنے کا وعدہ تم نے کیا تھا۔ میں سوموار کو ظار کرتی رہی، پھر جمعے کو بھی۔"

"میں یہاں بری طرح پھنس گیا تھا۔"

"مجھے تو نہیں لگتا۔"

"اچھا شکوے شکایت ہی کرتی رہو گی یا کچھ بتاؤ گی بھی...... خاور صاحب کا کچھ چلا یا نہیں؟"

"میں فون پر کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"یعنی تم ہر صورت مجھے کینڈی یاترا کرانے پر تلی ہوئی ہو۔"

"میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

یاسر نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "یہاں کام ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ آج ہوا ہے۔ میں تم سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہارا فون آ گیا اب بتاؤ کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم سچ بولا کرو۔"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" یاسر کے لہجے میں بھاری پن آ گیا۔

"میں نے تو بس رسمی بات کی ہے۔ خیر بتاؤ کیا پروگرام ہے تمہارا؟" وہ پھیکے پن سے انداز میں ہنسی۔

یاسر نے تھوڑا سا توقف کیا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے...... میں کل صبح والی ٹرین کینڈی پہنچ رہا ہوں۔"



رات نو بجے کے لگ بھگ وہ کولمبو کے بازاروں کا ایک آخری چکر لگانے کے اور تھوڑی سی شاپنگ کرنے کے لئے ہوٹل سے نکلا۔ تکہ شاپ کے سامنے گزرتے ہوئے اس کی نگاہیں خوامخواہ ملازم لڑکے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ کاؤنٹر سامنے کھڑا تھا۔ اس نے چھ سات دن پہلے یاسر سے درخواست کی تھی کہ وہ اس معطل ہونے والے ساتھی کے لئے مالک سے سفارش کرے تا کہ اسے دوبارہ نو مل جائے۔ یاسر نے سفارش نہیں کی تھی، اور وہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا شریر آنکھوں والا وہ زندگی سے بھرپور لڑکا، دنیا کے بدنام ترین پیشے سے بچ جا ایسی شریر آنکھوں والے...... زندگی سے بھرپور نجانے اور کتنے لڑکے تھے جو کولمبو کے کوچوں میں موجود تھے۔ وہ یہی کام کرتے تھے جو یہ لڑکا کرتا تھا۔ یاسر ان سب لئے تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں وہ اس لڑکے کے لئے ضرور کچھ کر سکتا تھا اور وہ یہ وہ اس کی سفارش نہ کرتا۔

وہ تکہ شاپ پر کھڑے لڑکے سے نظر بچا کر آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر اچانک ٹھ گیا۔ اس کی اُڑتی ہوئی سی نگاہ لڑکے کے چہرے پر پڑی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ اس میلے چہرے پر اس کی گدلی آنکھیں، آج گدلی نہیں تھیں۔ وہ سرخ تھیں...... کوشش کے باوجود آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ رک گیا۔ سنہالی لڑکے کے پاس پہنچ کر لمحے وہ اسے خاموش نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"کیا بات ہے...... کیوں رو رہے ہو؟"

لڑکے نے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے کپڑے سے کاؤنٹر کی ٹاپ صاف کی اشک بار لہجے میں بولا۔

"صاحب! اجے کے ساتھ بہت برا ہوا...... بہت برا۔"

اجے یقیناً اُسی شریر آنکھوں والے لڑکے کا نام تھا۔ یاسر کی سوالیہ نظریں لڑکے کے تے چہرے پر تھیں...... کیا ہوا ہے اُسے؟" یاسر نے پوچھا۔

"اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا صاحب...... اس کی دونوں ٹانگیں......" وہ فقرہ ادھورا ڑ کر ہچکیوں سے رونے لگا۔

"کب ہوا ایکسیڈنٹ؟" یاسر نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"پرسوں رات...... لیکن ہمیں تو آج خبر ملی ہے۔ وہ ڈیمبولا DAMBULLA چلا گیا پریشانی کی حالت میں سڑکوں پر گھوم رہا تھا، ایک گاڑی سے ٹکرا گیا...... اس کی یں ٹوٹ گئیں صاحب جی...... وہ برباد ہو گیا...... اس کی بہنیں بھی برباد ہو جائیں "

"نہیں...... کہاں ہیں اس کی بہنیں؟"

یاسر کے سوال کے جواب میں ملازم لڑکا بے دم سا ہو کر لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ یا۔ یاسر نے اس کے ساتھ والا اسٹول سنبھال لیا۔ وہ لڑکے سے اس کے دوست جے کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا، جاننا چاہتا تھا۔

اگلے آدھ گھنٹے میں سویاز نامی اس لڑکے نے غم ناک لہجے میں آہوں اور سسکیوں کے درمیان یاسر کو اجے کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔

"اجے نوکری سے نکالے جانے کے بعد سے بے حد دکھی تھی۔ وہ کسی کو بتائے بغیر ینڈی کے قریبی شہر ڈیمبولا چلا گیا۔ شراب خانے میں گھس کر اس نے بہت ساری کی پی اور پھر رات گئے لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر نکل آیا۔ ایک تیز رفتار کار نے اسے ھال کر پندرہ بیس قدم دور پھینک دیا۔ گاڑی والا بھاگ گیا۔ اب اجے معذور ہو کر یمبولا کے سرکاری ہسپتال میں پڑا ہے۔ اجے کے والدین اجے کے بچپن میں ہی ت ہو گئے تھے۔ اس کی دو بہنیں ہیں۔ ایک اجے سے بڑی ہے، ایک اجے کی ہم عمر نی جڑواں ہے۔ بڑی بہن کو خون کی بیماری (تھیلیسیما) ہے۔ مہینے میں ایک بار اور بھی کبھی دو بار اس کا خون بدلوانا پڑتا ہے۔ اجے نے دونوں بہنوں کو کولمبو کے ایک احی گاؤں میں اپنی چچی کے پاس رکھا ہوا ہے۔ چند ماہ پہلے تک اجے نوکری کی تلاش ں مارا مارا پھر رہا تھا۔ وہ خاکروب تک بننے کو تیار تھا لیکن قسمت کا پھیر کچھ ایسا تھا

کہ دو ٹکے کی نوکری بھی نہیں مل رہی تھی۔ ایک طرف بھوک اور بیماری تھی، دو
طرف بیروزگاری۔ ایک موقع پر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یاسر کو اپنی بہن فروخ
کرنے کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اپنی بڑی بہن کی بیماری اور اپنے گھرانے کی بھ
سے لڑنے کے لئے اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنی ہم
بہن کو ''پیشے'' پر بٹھا دے۔ اجے کو یہ مشورہ دینے والا اس تکہ شاپ کا مالک ہی تھا۔
تکہ شاپ کے ساتھ ساتھ یہ دھندا بھی کرتا ہے۔ وہ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی
بول لیتا ہے۔ عیش پسند سیاحوں کے ساتھ اس کے رابطے رہتے ہیں۔

جب بات بہن کو فروخت کرنے تک پہنچ گئی تو اجے نے مجبوراً ایک درمیانی را
اپنا لیا۔ وہ تکہ شاپ پر چوبیس گھنٹے کا ملازم ہو گیا۔ اس ملازمت کے لئے اسے ما
کی یہ شرط ماننا پڑی کی وہ دلالی کرے گا۔ مالک کے ''دھندے'' کے لئے سیاح
گھیرے گا۔ انگریزی کے سو پچاس لفظ اجے کو آتے تھے، سو پچاس مالک نے
دیئے تھے۔ اب وہ سرِ شام فٹ پاتھ پر کھڑا ہو جاتا تھا اور ان لفظوں کی مدد سے
نوکری پکی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ کچھ لاپرواہ تھا، کچھ ویسے بھی یہ کام اس
طبیعت کے مطابق نہیں تھا۔ وہ سیکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ تین چار مہینے تک تو وہ ا
گاہک بھی نہیں لا سکا۔ جب سے سیزن شروع ہوا تھا، اس کے کام میں تھوڑی
بہتری آئی تھی۔ لیکن اب بھی مسئلہ یہ تھا کہ وہ لاپرواہی برتتا تھا۔ کبھی گاہک کے
بات کرنے سے پہلے اس کی ہنسی نکل جاتی تھی، کبھی وہ کچھ اوٹ پٹانگ بول دیتا
سویاز نے اسے بہت سمجھایا کہ یہ اس کی نوکری کا معاملہ ہے، کسی دن مالک اسے لا
مار کر شاپ سے نکال دے گا اور اس کے حالات ایسے نہیں کہ وہ چند روز کی بیروزگ
بھی برداشت کر سکے۔''

سویاز نامی وہ لڑکا ساری بات بتا کر خاموش ہو گیا۔ اس کی سرخ آنکھوں م
تیر رہی تھی...... یہ نمی جیسے یاسر سے شکوہ کناں تھی۔ یہ کہہ رہی تھی...... اے دور
کے آنے والے سیاح، یہ تم نے کیا، کیا؟ چند شامیں پہلے تم نے اجے کے تابوت
آخری کیل ٹھونک دیا...... تمہاری وجہ سے وہ نوکری سے نکال دیا گیا، تمہاری وجہ
وہ دربدر ہوا اور نشے میں ڈوبا۔ تمہاری وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹوٹیں۔ اب آگے بھ

کچھ ہو گا، وہ تمہاری وجہ سے ہو گا۔ شاید...... اب اجے کی بہن کو اس پیشے میں آنا ہو گا
جس پیشے میں وہ خود تھا۔

یاسر ابھی سویاز سے مزید سوال جواب کرنا چاہتا تھا لیکن اس دوران میں دور سے
ایک اسکوٹر آتا دکھائی دیا۔ تکہ شاپ کا مالک آ رہا تھا۔ وہ شخص جونیپون ہوٹل سے کچھ
ہی فاصلے پر مسالے دار چرغے اور چٹ پٹی لڑکیاں ایک منفرد اسٹائل سے فروخت کرتا
تھا۔ مالک کو دیکھتے ہی لڑکا جلدی سے کھڑا ہو گیا اور ٹماٹو کیچپ کی ایک بوتل اس کی
کہنی سے ٹکرا کر کاؤنٹر سے گرتے گرتے بچی۔

لڑکا اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یاسر اٹھ کر بڑی سڑک کی طرف چل دیا۔ قدم
فٹ پاتھ پر حرکت کرنے لگے اور ذہن سویاز کی گفتگو میں الجھنے لگا۔ اس کی سرخ
آنکھوں کی نمی بار بار ذہن میں چمکنے لگی۔ یہ نمی یاسر سے شکوہ کناں تھی۔ لیکن شاید یاسر
زیادہ حساسیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یاسر نے ایسا کون سا انہونا کام کیا تھا۔ چند شامیں
پہلے اس نے جو کیا تھا، ٹھیک کیا تھا۔ باقی رہی بات اجے کو نوکری سے نکالے جانے کی
تو...... وہ تو پہلے ہی آخری کنارے پر کھڑا تھا۔ اپنی ناقص کارکردگی کی بنا پر وہ کسی
وقت بھی اپنی ''شاندار'' نوکری سے محروم ہو سکتا تھا اور وہ ہو گیا تھا۔ یاسر نے تو شاید
وہی کردار ادا کیا تھا جو روایتی کہانیوں میں ''سب سے پہلے شہر میں داخل ہونے والا''
شخص کرتا ہے۔ سب کچھ تو پہلے ہی طے کر لیا گیا ہوتا ہے۔ جونہی وہ شخص شہر میں قدم
رنجہ فرماتا ہے، اسے کسی واقعے یا عہدے کا سزاوار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

یاسر بازاروں میں گھومتا رہا...... ہلکی پھلکی شاپنگ کرتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ
اجے کے حوالے سے اپنے ذہنی تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر پتہ نہیں کیا بات
تھی، اُجلے بستر پر لیٹا ہوا ایک لڑکا بار بار اس کے پردۂ تصور پر آ جاتا تھا...... ایک لڑکا
جس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

گیارہ بجے کے قریب ہاتھوں میں چند پیکٹ لئے یاسر ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہا
تھا جب اچانک ایک پرچھائیں سی اس کی طرف آئی۔ یہ راکیل تھی۔ وہ یاسر سے ٹکرائی
اور اسے دھکیلتی ہوئی دیوار تک لے گئی۔ وہ یاسر سے تقریباً بغل گیر ہو چکی تھی۔ یاسر
کے ایک ہاتھ سے پیکٹ گر گیا اور ننھے سائز کے خوشنما کینو نکل کر قالین پر لڑھک

گئے۔ اس نے راکیل کو بمشکل دھکیل کر پیچھے ہٹایا۔

وہ چہکی۔ ''آج میں بہت خوش ہوں...... ایک دم خوش۔''

''خوش ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم ایک شریف بندے کو ہوٹل نیپون کی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکانے کی کوشش کرو۔''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''آج وارسا سے چچا جان کا خط آیا ہے۔ پرسوں تک رقم بھی پہنچ رہی ہے۔ میں ایک دم خوشحال ہو جاؤں گی...... پھر ہم دونوں ساحل پر ایک بھرپور پکنک منائیں گے۔ شام کو ہوٹل گلاداری میں چلیں گے، ایک زبردست ڈنر کریں گے۔ ایک پرائیویٹ کار ہائر کریں گے اور رات گئے تک جگمگاتے کولمبو میں آوارہ گردی کریں گے۔''

''اور یہ سب کچھ کب ہوگا؟'' یاسر نے پوچھا۔

''پرسوں...... یعنی بروز جمعرات۔''

''اور آج کیا ہوگا؟'' یاسر نے کینو سمیٹتے ہوئے دریافت کیا۔

''آج...... مجھے تھوڑی سی مالی مدد کی ضرورت ہے، صرف آٹھ سو سری لنکن روپے۔ میرا خیال ہے کہ پرسوں تک اتنی رقم سے کام چل جائے گا۔'' وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔

''لل...... لیکن......'' یاسر ہکلایا۔

''پریشانی کی بات بالکل نہیں...... وارسا سے رقم آتے ہی میں سب سے پہلے تمہارے روپے لوٹاؤں گی۔''

یاسر نے جلدی جلدی اپنے ذہن میں حساب جوڑا۔ آٹھ سو سری لنکن روپے یعنی قریباً 475 پاکستانی روپے۔ رقم تو اتنی زیادہ نہیں تھی۔ یاسر اسے دے سکتا تھا لیکن ڈر بھی رہا تھا۔ ڈر اس بات کا نہیں تھا کہ وہ یہ قرضہ لوٹائے گی نہیں...... ڈر اس بات کا تھا کہ وہ کہیں پھر اپنے انداز سے قرضہ لوٹانے کی کوشش نہ کرے۔ اس کا انداز دو دن پہلے یاسر ملاحظہ کر ہی چکا تھا۔ مائیکل جیکسن کی آواز یاسر کے کانوں میں گونجنے لگی...... وقت گزر ہی جانا ہے...... ایسے بھی اور ایسے بھی...... لطف اٹھا لو...... لطف اٹھا لو...... یعنی یاسر کو ڈر رقم کے مارے جانے کا نہیں تھا، رقم کے ''وصول'' ہونے کا تھا۔

اگر وہ آج رات ہی ادائیگی پر تل جاتی تو یاسر کیا کر لیتا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ اسے اپنے گداز کندھے سے ٹھوکا دیتے ہوئے بولی۔

''کک...... کچھ نہیں۔ دراصل بجٹ میرے پاس بھی محدود ہی ہے۔''

''میں نے کہا ہے نا ڈیئر، میں پرسوں تک لوٹا دوں گی۔''

''پرسوں تک؟......'' یاسر نے دہرایا۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ کہیں پرسوں سے پہلے لوٹانے کی کوشش تو نہیں کرو گی۔''

راکیل نے دلنشیں انداز میں مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

یاسر نے جیب سے پرس نکالا اور آٹھ صد روپے گن کر راکیل کو دے دیئے۔ غالباً وہ شکریے کے طور پر یاسر کا رخسار چومنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر اس دوران میں چند لڑکے دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر پہنچے اور وہ اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکی۔ یاسر نے موقع غنیمت جانا اور اس سے اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف لپک گیا۔

کمرے میں پہنچ کر بھی اسے دیر تک ان چاہی دستک کا دھڑکا لگا رہا۔ بہرحال یہ دستک نہیں ہوئی۔ پتہ نہیں کیا شے تھی یہ لڑکی۔ یاسر اسے ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ وہ کسی خوشحال فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور وقتی طور پر مالی پریشانی کا شکار ہے۔ لیکن کسی وقت محسوس ہوتا تھا کہ شاید اس کا لائف اسٹائل ہی یہی ہے۔ کہیں دوستی کی آڑ میں مانگ لیا، کہیں اپنی دلکشی کے زور سے اینٹھ لیا۔ کبھی حالات زیادہ مشکل ہوں تو اپنے جسم کے بدلے چکن پیس اور آئس کریم کا کپ حاصل کر لیا۔

بہرحال اس سارے معاملے میں یاسر کے لئے اطمینان کا پہلو ایک ہی تھا...... وہ کل صبح سویرے یہاں سے جا رہا تھا...... بڑی خاموشی کے ساتھ...... مائیکل جیکسن کی پرستار سے ملے بغیر۔

❑●❑

یاسر ٹھیک چھ بجے بذریعہ بس اسٹیشن پہنچ گیا۔ یہ وہی اسٹیشن تھا جہاں سے چند روز پہلے اس نے کنول کو کینڈی روانہ کیا تھا لیکن آج اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے پہلی بار اسٹیشن دیکھا ہے۔ دراصل تب کنول اس کے آس پاس موجود تھی اور شاید کنول کے سوا اسے کچھ اور نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

اسٹیشن کی عمارت قدیم طرز کی تھی اور زیادہ متاثر کن بھی نہیں تھی۔ ابن انشاء نے اپنے سفرنامے میں کولمبو کے فورٹ ریلوے اسٹیشن کو ایک ''دھول اُڑاتا معمولی سا اسٹیشن'' قرار دیا تھا۔ شاید پچھلے تیس پینتیس برس میں یہاں کچھ مثبت تبدیلیاں آئی ہوں لیکن یہ اب بھی ایک عام سا اسٹیشن ہی تھا۔ اسٹیشن سے باہر لاتعداد ٹک ٹک (موٹر رکشا) اپنی ناخوشگوار آوازوں میں ٹرا رہے تھے اور اسٹیشن کے اندر روایتی پٹریوں پر کہنہ سال ریل گاڑیاں شور مچاتی تھیں۔ بہرحال جس ٹرین کو کینڈی جانا تھا اس کی صورت حال قدرے مختلف تھی۔ خاص طور سے وہ دو تین کوچز خاصی بہتر تھیں جن میں مقامی اور غیر مقامی سیاح سفر کرتے تھے۔

یاسر نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ 200 سری لنکن روپے میں لیا تھا اور یوں درجنوں سفید فام سیاحوں کی ہمسفری کا شرف حاصل کر لیا تھا۔ کمپارٹمنٹ کے اندر ہر طرف خوبصورت چہرے تھے۔ ننگی پنڈلیاں، کھلے گریبان، نیلی آنکھیں، سنہری بال۔ سیاحوں کی آسانی کے لئے کمپارٹمنٹ کی چاروں طرف جہازی سائز کے شیشے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ریل کے ڈبے کی بجائے کسی کلاس روم میں سفر کر رہے ہیں۔

حسینوں کے اس میلے میں بھی یاسر یکسر تنہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں تو بس ایک ہی چہرہ ٹھہرا ہوا تھا۔ کانوں میں بس ایک ہی لہجے کی گونج تھی، باقی سب کچھ بہت دور تھا۔ بہت دور اور دھندلایا ہوا۔ گال فیس روڈ، ماؤنٹ لیوینیا، نیپون ہوٹل، گرجا گھر

تکہ شاپ، اجے، راکیل، مائیکل جیکسن، سب کچھ دور افتادہ ہو گیا تھا...... اگر کوئی قریب تھا تو وہ کنول تھی، اس کی باتیں تھیں، اس کی خوشبو تھی...... اور اس کی دی ہوئی شرٹ تھی۔ یاسر نے جان بوجھ کر گرے دھاریوں والی شرٹ نہیں پہنی تھی۔ اس نے کنول کی دی ہوئی شرٹ پہنی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اکیلا سفر نہیں کر رہا، اس شرٹ کے ساتھ سفر کر رہا ہے، کنول کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ کنول اس کے سینے سے لگی ہوئی ہے۔ اس کے بازوؤں پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کی پشت کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں ان لمحوں میں کیا بات تھی، کنول کی دی ہوئی شرٹ خود کنول بن گئی تھی اور اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی...... ہاں، ہنستے گاتے ان سفید فام جوڑوں کے درمیان وہ اکیلا نہیں تھا۔

شیشوں سے باہر کے مناظر دلفریب تھے اور یاسر تصور ہی تصور میں انہیں کنول کے ساتھ مل کر دیکھ رہا تھا۔ کولمبو سے ''پہاڑی مقام کینڈی'' تک کا سفر مسلسل چڑھائی کا سفر ہے۔ کہیں یہ چڑھائی غیر محسوس ہے اور کہیں واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ یہ نان اسٹاپ ٹرین تھی اور عام اسٹیشنوں پر بغیر رکے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ راستے میں آنے والے ان اسٹیشنوں پر یاسر کو مسافروں کا اژدھام نظر آیا۔ ان میں زیادہ تعداد نوجوان مرد و زن کی تھی۔ مردوں کا لباس پینٹ شرٹ اور ٹائی تھا۔ کچھ عورتیں اور لڑکیاں بھی اسی لباس میں نظر آتی تھیں تاہم اکثریت نے اسکرٹ پہن رکھے تھے جو ان کی نصف پنڈلیوں کو ڈھانپتے تھے۔ یہ سب دفتری لوگ تھے یا کالجوں، یونیورسٹیوں میں جانے والے طلباء تھے۔ ان سب کا رخ کولمبو کی طرف تھا۔ چھوٹے بڑے اسٹیشنوں پر موجود یہ ہجوم دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ سری لنکا میں خواندگی کی شرح سو فیصد ہے۔

یاسر کا خیال تھا کہ شاید یہ ٹرین بھی پاکستانی ٹرینوں کی طرح اسٹیشنوں پر رکے گی اور کمپارٹمنٹ کی کئی کھڑکیوں میں خوانچہ فروشوں کے چہرے نظر آئیں گے۔ لیکن ایک مقام کے سوا ٹرین کہیں رکی ہی نہیں۔ جہاں رکی وہاں بھی بس ایک دو پھیری والے دکھائی دیئے۔ وہ آم اور اناس وغیرہ کی قاشیں بیچ رہے تھے۔

جوں جوں کینڈی نزدیک آتا گیا، سرسبز اور نظر نواز مناظر کی بہتات ہوتی گئی۔

پہاڑوں نے سبزے اور پھولوں کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وادیوں میں چمکیلا پانی بہتا تھا اور سورج کی کرنیں رقص کرتی تھیں۔ ہوا میں خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ یہ ہوا یاسر کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ کینڈی کی طرف سے آ رہی تھی۔ کینڈی ...... جہاں کوئی تھا...... جہاں کوئی ایسا تھا جسے یاسر دیکھنا چاہتا تھا۔ کنول نے فون پر اس سے کہا تھا کہ وہ اسٹیشن پر اسے لینے کے لئے موجود ہو گی، یعنی کینڈی پہنچتے ہی کنول سے ملاقات ہونے کا قوی امکان موجود تھا۔ وہ اس سے کیا کہے گی؟ وہ جواب میں کیا کہے گا؟ وہ کیسی لگ رہی ہو گی؟ اسی قسم کے سوالات تھے جو اس کے ذہن میں مسلسل گردش کر رہے تھے۔ ان سوالات سے دھیان ہٹانے کے لئے وہ گاہے گاہے اپنی توجہ اپنے ہمسفروں پر مرکوز کر دیتا تھا ...... اور ہمسفروں کی مصروفیات واقعی اس قابل تھیں کہ یاسر کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکتی تھیں۔

کمپارٹمنٹ میں نصف سے زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ بیشتر شوخ اور آزاد خیال جوڑے تھے۔ وہ سفر کے دوران میں مسلسل ایک دوسرے سے چھیڑ خانیوں میں مصروف تھے۔ کسی کا سر کسی کے کندھے پر تھا، کسی کے ہاتھ کسی کے بالوں پر آوارہ تھے، اور کسی کا چہرہ کسی کی گود میں چھپا ہوا تھا۔ تاہم کچھ ایسے بھی تھے جو صنفِ مخالف کی دلکشی کی بجائے بیرونی مناظر کی دلکشی پر توجہ دے رہے تھے۔

ایک نوجوان انگریز خاتون جو اکیلی سفر کر رہی تھی، گاہے گاہے کیمرا اٹھاتی تھی اور قدرتی مناظر کا عکس محفوظ کر لیتی تھی۔ ایک درمیانی عمر کا ڈچ جوڑا تصویریں اتارنے کے ساتھ ساتھ خوبصورت مناظر پر تبصرے بھی کر رہا تھا۔ ڈچ مرد نے یاسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کے ملک میں بھی نچلے درجے کے مسافروں کو ایسے ہی سفر کرنا پڑتا ہے؟ میں نے ابھی سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کے ڈبے دیکھے ہیں، ان کا حال اچھا نہیں۔“

یاسر نے کہا۔ ”ہمارے ہاں صورت حال بہتر ہو رہی ہے۔ سری لنکا کے برعکس وہاں الیکٹرک ٹرینیں چل رہی ہیں۔ پٹریوں کی حالت بھی بہت بہتر ہے۔“

وہ جان بوجھ کر سیکنڈ اور تھرڈ کلاس والی بات گول کر گیا تھا۔ وہ ڈچ کو کیسے بتاتا کہ یہاں سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کا حال اچھا نہیں لیکن ہمارے ہاں تو ”حال“ ہے ہی

نہیں۔ بس ایک ”بے حالی“ کی کیفیت ہے۔

اس دوران میں دفتر جانے والے بابو لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ایک لوکل ٹرین قریب سے گزری اور یاسر کو اپنے ہاں برانچ لائنوں پر چلنے والی گاڑیاں یاد آ گئیں جنہیں عرف عام میں ”کھوتا گڈیاں“ بھی کہا جاتا ہے۔

کینڈی کے مضافات میں پہنچ کر پہاڑ بلند تر اور سبز تر ہو گئے۔ فضا میں نباتات کی مہک تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی ایک افسانوی سا ماحول نظر آتا تھا ٹرین اب تک پانچ چھ سرنگوں سے گزر چکی تھی۔ بالآخر کینڈی کے آثار نظر آنے لگے۔

مخروطی چھتوں والا سرسبز کینڈی اپنی تمام تر پہاڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کے سامنے تھا...... اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی اس کے سامنے تھی۔

کمپارٹمنٹ کے اندر سے ہی یاسر کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ وہ ایک ساڑھی پوش خاتون اور ایک چھوٹے بچے کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ اسکرٹ میں تھی۔ بال تیز ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ ان بالوں کو دیکھ کر یاسر کو چہرے پر گدگدی محسوس ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کولمبو کا فلائنگ ہارس اور اس کا رکشا یاد آ گیا۔

یاسر کو دیکھ کر کنول کے چہرے پر رنگ لہرائے اور اس نے تیزی سے دونوں ہاتھ ہلائے۔ جواب میں یاسر نے بھی ہاتھ ہلایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے مختصر سامان سمیت دونوں خواتین کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیسے ہو یاسر؟“ کنول نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ ہاتھوں کی نرمی و گرمی نے یاسر کو مسحور کر دیا۔

”میں ٹھیک ہوں...... اور تم؟“

”ہم سب بھی ٹھیک ہیں...... ان سے ملو، یہ ہیں دیدی آشا اور یہ ان کا نٹ کھٹ بلکہ ہم سب کا نٹ کھٹ۔ اس کا نام تو اکشے ہے لیکن ہم سب اسے نٹ کھٹ ہی کہتے ہیں۔“

”نمستے۔“ دیدی آشا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“

”اور مجھے بھی۔“ یاسر بولا۔

اس دوران میں کئی ٹک ٹک ان کے اردگرد منڈلانے لگے تھے۔ ایک مخنی سے ڈرائیور نے یاسر سے باقاعدہ رابطہ بھی کیا اور اسے بتایا کہ اگر وہ ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا ہے تو کینڈی کے بہترین ہوٹلوں سے اس کے رابطے ہیں اور وہ ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس تک پہنچانے کا کرایہ بھی نہایت معقول وصول کرے گا۔

کنول نے چیخ کر کہا۔ ”تمہارے چہرے پر آنکھیں ہیں یا بٹن...... دیکھ نہیں رہے ہو، ہم انہیں یہاں ریسیو کرنے کے لئے آئے ہیں۔“

رکشا والا خجل سا ہو کر واپس مڑ گیا۔ کنول بولی۔ ”ان لوگوں کے ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز سے ٹانکے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ سیاحوں سے دوگنا کرایہ اینٹھتے ہیں اور ہوٹل والوں سے کمیشن بٹورتے ہیں۔“

یاسر کینڈی اسٹیشن پر رنگ برنگی ٹرینوں کے ساتھ چند تصویریں کھنچوانا چاہتا تھا۔ کنول نے جلدی جلدی اس کی یہ خواہش پوری کی۔ یاسر نے کیمرا بیگ میں رکھا اور دونوں خواتین کے ساتھ ایک کشادہ اسٹیشن وین میں آ بیٹھا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی کہ اسٹیشن وین چلانے کے لئے دیدی آشا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس کے برابر میں آٹھ سالہ نٹ کھٹ بیٹھ گیا۔ یاسر اور کنول پچھلی نشست پر براجمان ہو گئے۔ کنول کے قرب کی مخصوص مہک یاسر کے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کے مشامِ جاں کو معطر کر گئی۔

وین تیزی سے ایک سڑک پر دوڑنے لگی۔ یاسر کے اردگرد کینڈی اپنی تمام تر رعنائی کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ دوپہر کے قریباً بارہ بجے تھے۔ زندگی اپنے جوبن پر تھی۔ کینڈی پہنچنے کے بعد جو پہلا خوشگوار احساس یاسر کو ہوا وہ یہ تھا کہ کولمبو کی گرمی سے جان چھوٹ گئی ہے۔ وہ شہر سے گزر رہے تھے اور کنول مسلسل کمنٹری کر رہی تھی۔ یہ فلاں بلڈنگ ہے، یہ فلاں چوراہا ہے، یہ سڑک فلاں طرف جاتی ہے۔ پھر اس نے بائیں طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

”وہ دیکھو، جھیل کا پانی چمک رہا ہے...... اور وہ دیکھو...... ان درختوں کی دائیں طرف...... کلس نظر آ رہے ہیں۔ یہی ہے بدھا کے دانت کا مندر...... اسے ٹتھ ٹمپل بھی کہتے ہیں۔ نظر آ رہا ہے نا تمہیں؟“

”کہاں؟“ یاسر نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔

”بھئی وہ دیکھو...... اُس سفید بلڈنگ کے ساتھ ان درختوں کے پیچھے۔“

ایک دم یاسر کو پرانا تجربہ یاد آ گیا۔ ہوٹل کی کھڑکی سے پی سی او کا سبز بورڈ دکھانے کے لئے کنول نے جو کچھ کیا تھا وہ ابھی تک ایک کھٹی میٹھی یاد کی صورت یاسر کے ذہن پر نقش تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا جی چاہا کہ کنول اسے بدھا کا مندر دکھانے کے لئے بھی ویسا ہی طریقۂ کار اختیار کرے۔ لیکن پھر فوراً ہی اس خواہش کا جواز ختم ہو گیا۔ ایک موڑ مڑتے ہی جھیل اور اس کے پار بدھا کا مندر صاف نظر آنے لگا۔ اور یہ منظر اتنا خوبصورت تھا کہ چند لمحے کے لئے یاسر سب کچھ بھول گیا۔ یہ کافی بڑی جھیل تھی۔ اسے چاروں طرف سے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اکثر درختوں پر پھل بھی موجود تھے۔ کنکریٹ کی بنی ہوئی ایک خوش نما منڈیر جھیل کی حد بندی کرتی تھی۔ اس حد بندی کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ تھا جس پر مقامی و غیر مقامی سیاح چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے۔ ان کی وین اب ڈھلواں سڑک پر اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ جلد ہی جھیل اور بدھا کا مندر نشیب میں دکھائی دینے لگے۔

وین ایک صاف ستھری بنگلہ نما کوٹھی کے سامنے جا کر رکی۔ ”ڈرائیو وے“ سے گزر کر وہ پورچ میں پہنچے۔ گنجے سر والے ایک ادھیڑ عمر شخص نے ان کا استقبال کیا۔ یہ شخص پائجامہ قمیض میں تھا اور صورت سے سنجیدہ نظر آتا تھا۔ کنول کے تعارف کرانے سے پہلے ہی یاسر جان گیا کہ یہ کنول کے چاچو سلیمان ہیں۔ انہوں نے خوش دلی سے یاسر کا استقبال کیا۔

کوٹھی اندر سے نہایت صاف ستھری اور ہوادار تھی۔ روشن کھڑکیوں میں سے نشیب میں جھیل کا پانی دعوت نظارہ دیتا تھا اور جھیل کے پار بدھا کا مندر جھلک دکھاتا تھا۔

ایک کمرے میں پینتالیس پچاس سال کی ایک خاتون نماز پڑھ رہی تھیں۔ یاسر کے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سلام پھیرا پھر اٹھ کر یاسر کے سر پر پیار دیا اور دعا دی۔ اس نیک صورت خاتون کو دیکھتے ہی یاسر کو عجیب سی اپنائیت اور محبت کا احساس ہوا، بالکل جیسے کولمبو ایئرپورٹ کے باہر کنول کو دیکھنے کے فوراً بعد اپنائیت کا احساس ہوا

تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں پہلی بار دیکھ کر ہی یوں لگتا ہے جیسے عرص
سے جان پہچان ہو۔ خاتون کی آنکھیں کچھ سرخ تھیں اور انہوں نے آنکھوں سے بہ
والا پانی پونچھنے کے لئے ہاتھ میں ٹشو پیپر پکڑ رکھا تھا۔ یاسر جان گیا کہ یہ کنول کی والد
ہیں۔

''کنول تمہاری بہت تعریفیں کرتی ہے۔ جب سے آئی ہے تمہاری ہی باتیں کرتی
رہتی ہے۔'' ادھیڑ عمر خاتون نے عام سے لہجے میں کہا۔

اس معمولی سے فقرے نے پتہ نہیں کیوں یاسر کے اندر جلترنگ بجا دیئے۔ اس
نے اپنے تاثرات پر بمشکل قابو پایا اور بولا۔

''یہ خود بہت اچھی ہیں...... اس لئے ہر شخص میں اچھائی ڈھونڈ لیتی ہیں۔''

''اچھا زیادہ باتکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ آؤ میں تمہیں تمہارا کمرا دکھاؤں۔''
کنول یاسر کو بازو سے تھامتے ہوئے بولی۔

نہایت چمکیلی اور صاف ستھری سیڑھیاں چڑھ کر وہ بالائی منزل پر آئے۔ کمرہ
کشادہ اور دیدہ زیب تھا۔ ایک بڑی کھڑکی بائیں جانب کھلتی تھی۔ جس میں سے بل
کھاتی سڑک نظر آتی تھی ...... برآمدے کی کھڑکی میں سے جھیل کا نظارہ کیا جا سکتا تھا
ایک ملازم نے یاسر کا اٹیچی کیس کمرے میں لا کر رکھ دیا۔

''چلو نہا کر کپڑے بدل لو۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔'' کنول نے کہا۔

''نہا لیتا ہوں...... لیکن کپڑے بدلنے کی تو کوئی خاص ضرورت نہیں، کپڑے ٹھیک
ہی ہیں۔'' یاسر کا اشارہ اپنی قمیص کی طرف تھا۔

''ہاں کپڑے تو ٹھیک ہیں اور اچھے بھی لگ رہے ہیں۔'' وہ تعریفی نظروں سے
دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یہ قمیص کے نیچے والے بٹن کا رنگ کچھ بدلا بدلا ہے۔
بٹن تبدیل کیا تھا؟''

یاسر اس کی باریک بینی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ بہرحال یہ داد اس کی زبان
نہیں آئی۔ فوراً سنبھل کر بولا۔

''میں نے تو کچھ نہیں کیا۔''

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ یاسر اسے کیسے بتاتا کہ قریباً چوبیس گھنٹے پہلے اس نے اس قمیص

کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ مایوسی کے عالم میں اس نے قمیص کے چیتھڑے اُڑانے کی
کوشش کی تھی اور صرف اس کی ناتوانی کے طفیل قمیص سلامت رہی تھی۔

ایک شاندار باتھ روم میں نیم گرم پانی سے شاندار غسل کرنے کے بعد یاسر
برآمدے میں آیا تو کھڑکی کے عین سامنے رکھی ہوئی چوکور میز پر لنچ رکھا جا چکا تھا۔ لنچ
کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر آئیڈیل جگہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ دائیں طرف جھیل تھی
اور جھیل کو چھو کر آنے والی نیم سرد ہوا تھی۔ اس ہوا میں کھڑکیوں کے دبیز پردے
ہولے ہولے ہلتے تھے اور چائنیز کھانے کی مہک اطراف میں پھیلتی تھی۔

لنچ میں کنول کے علاوہ کنول کے چاچو، دیدی اور نٹ کھٹ بھی شامل تھے۔ چاچو
کی آنکھوں پر نظر کی موٹے شیشوں والی عینک تھی۔ وہ بس ضرورت کے تحت ہی بات
کرتے تھے۔ بہرحال ان کے لہجے میں شگفتگی تھی۔ الفاظ کے انتخاب سے اندازہ ہو
جاتا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ کنول کی یہ بات درست معلوم ہوتی تھی کہ اس کا
خاندان زبردست قسم کے پڑھاکو اور سنجیدہ لوگوں کا خاندان ہے۔ چاچو سلیمان کے
برعکس دیدی آشا اور نٹ کھٹ شوخ طبیعت کے مالک تھے۔ لنچ کے دوران میں اپنی
شگفتہ باتوں سے انہوں نے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھا۔

قریباً ایک گھنٹے کی نشست ہوئی۔ اس دوران میں یاسر نے ایک خاص بات نوٹ
کی ...... دیدی آشا اسے مسلسل معنی خیز نظروں سے دیکھتی رہیں۔ جب کبھی بھی ان
دونوں کی نگاہیں ملیں ...... یاسر کو جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ دیدی آشا کی
نگاہوں میں اس کے لئے دبی دبی ہنسی اور چھپی چھپی شرم تھی۔

کھانے کے بعد کنول بولی۔

''اب کچھ دیر آرام کر لو۔ شام کو گھومنے چلیں گے۔''

یاسر کہنا چاہتا تھا کہ آرام تو تم سے باتیں کرنے کے بعد آئے گا لیکن کنول کے
سنجیدہ صورت چاچو کے سامنے وہ اس قسم کی حماقت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ
سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگے تو کنول ایک ننھی گڑیا کی طرح اپنے لحیم شحیم چاچو کی
بغل میں دبی ہوئی تھی۔ چاچو گاہے گاہے کنول کا سر چوم رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ
یاسر کو دکھانے کے لئے تو نہیں تھا ...... یہ بے تکلفی اور قربت ان کے ماحول میں رچی

ہوئی تھی۔

یاسر بستر پر لیٹا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ شام چھ بجے کے قریب جاگا۔ ملازم نے اسے بتایا کہ وہ تیار ہو کر نیچے چلا جائے، چھوٹی میڈم کافی دیر سے اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ چھوٹی میڈم سے اس کی مراد کنول تھی۔

یاسر نیچے پہنچا تو وہ پینٹ شرٹ اور جوگرز پہنے تیار بیٹھی تھی۔ دونوں باہر نکل آئے۔ دروازے کے قریب سیاہ رنگ کا ایک بڑا کتا استراحت فرما رہا تھا۔ اس کے پاس ہی سفید رنگ کا ایک چھوٹا کتا بھی تھا۔ یہ کتا بھی بہت چھوٹا نہیں تھا لیکن اپنے کیم شیم ساتھی کے قریب لیٹا ہوا چھوٹا نظر آتا تھا۔ وہ دونوں پاس سے گزرے تو سیاہ کتے نے اپنے بڑے بڑے کان کھڑے کئے اور ناراضگی بھری آواز نکالی۔ کنول نے لاڈ سے ''شاڈی ...... نو شاڈی'' کہا تو اس کے کان ڈھیلے پڑ گئے اور اس نے اپنی تھوتھنی پھر سے زمین پر ڈال دی۔ جلد ہی وہ دونوں ڈھلوان اتر کر جھیل کے کنارے تھے۔ ہوا میں پھولوں کی مہک تھی۔ یاسر نے کہا۔

''ہاں ...... اب بتاؤ خاور صاحب کی تلاش کہاں تک پہنچی؟''

''کچھ سراغ لگا تو ہے۔'' کنول نے کہا اور یاسر کے سینے میں ایک تیز سرد لہر دوڑ گئی۔

کنول بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہاں سے کچھ فاصلے پر DAMBULLA کا شہر ہے۔ وہاں لوگ زیادہ تر راک ٹمپل دیکھنے جاتے ہیں۔ راک ٹمپل سیاحوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ قریباً دو ہفتے پہلے بھائی جان کمار کے چھوٹے بھائی سریش آنند نے خاور کو راک ٹمپل میں دیکھا ہے۔ سریش کو معلوم تھا کہ ہم سب پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ خاور کو دیکھتے ساتھ ہی سریش نے یہاں کینڈی میں دیدی آشا کو فون کر دیا۔ بھائی جان کمار اور دیدی آشا بذریعہ وین بڑی تیزی سے ڈمبولا کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس دوران میں سریش نے خاور پر نگاہ رکھی لیکن وہ اس کے پاس نہیں گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اُسے دیکھتے ہی خاور راک ٹمپل سے نکل جائے گا۔ سریش کا ارادہ تھا کہ اگر بھائی جان اور دیدی کے آنے سے پہلے خاور نے کہیں جانے کی کوشش کی تو وہ اپنی موٹر بائیک پر اس کا پیچھا کرے گا۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بھائی

جان اور دیدی کے پہنچنے سے صرف دس پندرہ منٹ پہلے خاور اچانک وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ ٹمپل کی سیڑیوں سے اُترا، سریش کا خیال تھا کہ وہ پارکنگ کی طرف جائے گا مگر اچانک ہی ایک کار آئی اور وہ اس میں بیٹھ کر چلا گیا۔

سریش کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی موٹر بائیک نکال سکتا۔ وہ بس کار کا نمبر ہی نوٹ کر سکا۔ یہ نمبر بھی مکمل نہیں ہے۔ بہرحال اس نمبر کے ذریعے بھائی جان کمار اور چاچو وغیرہ کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں آشا ہے کہ کوئی نہ کوئی کھوج لگ جائے گا۔ بھائی جان کمار آج بھی ڈمبولا گئے ہوئے ہیں۔ امی جان بھی اس دن کی مصلّے پر بیٹھی ہوئی ہیں، دعائیں مانگ مانگ کر وہ تو نڈھال ہو رہی ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا، جب تم آئے تب بھی وہ مصلّے پر ہی تھیں۔''

''ہاں دیکھا تھا......'' یاسر نے اپنی اندرونی ہلچل پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیسی لگیں میری امی؟''

''بہت پیاری...... بڑی محبت کرنے والی...... بڑی شاندار......تمہاری امی کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔''

''اور میرے چاچو؟''

''تم سب لوگ ہی خوبصورت ہو، شاندار اور منفرد۔''

''تمہاری بات بالکل درست ہے...... اگر تم سب لوگوں میں سے مجھے نکال دو تو۔ میں تو بس یونہی سی ہی ہوں۔ کبھی کبھی تو سوچتی ہوں کہ مجھے اس فیملی میں ہونا ہی نہیں چاہئے تھا۔''

''اپنی تعریف کرانے کا یہ طریقہ تو بہت پرانا ہے۔''

''میں وہی کہتی ہوں جو میرے من میں ہوتا ہے...... خیر چھوڑو اس موضوع کو، تمہارے دن کیسے گزرے کولمبو میں؟''

''بہت اچھے...... بڑے پُرسکون...... بہت انجوائے کیا میں نے......اور تم جانتی ہی ہو کہ میں ہمیشہ جھوٹ بولتا ہوں۔''

''جھوٹے لوگ بھی تو ہمیشہ جھوٹ نہیں بولتے۔''

''چلو...... سچے لوگ تو ہمیشہ سچ بولتے ہیں نا......تم بتاؤ تم کیا کرتی رہی ہو؟''

اس نے ایک لمحے کے لئے مڑ کر یاسر کی طرف دیکھا، جھیل کے پار ڈوبتے سورج کا عکس اس کی آنکھوں میں تھا۔ وہ بولی۔ ''میں خاور کو تلاش کرتی رہی...... اور تمہارے فون کا انتظار بھی کرتی رہی۔''

''یہ دونوں کام ایک ساتھ کیسے ہو سکتے تھے؟''

''کیوں...... ان کاموں میں ایسی کون سی بات ہے؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''اچھا...... یہ بتاؤ، ان دونوں کاموں میں سے کون سا کام زیادہ کیا...... خاور کی تلاش یا میرے فون کا انتظار؟''

''میرا خیال ہے کہ تم الٹے پلٹے سوال پوچھ کر مجھے اصل موضوع سے ہٹا رہے ہو۔ مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے وعدے کے مطابق مجھے فون کیوں نہیں کیا؟''

''ایک جھوٹے شخص سے اس قسم کے پیچیدہ سوال پوچھ کر تم خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔''

''پیچیدہ سوال؟'' اس نے ایک بار پھر حیرت سے اپنی خوبصورت آنکھیں کھولیں۔ ''اس میں بھلا پیچیدگی کی کیا بات ہے؟''

''کچھ باتیں بہت سادہ ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں اتنی سادہ نہیں ہوتیں۔''

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ یوں لگا جیسے شفق رنگ شام میں گلاب اور رجنی گندھا کے ان گنت پھول بکھر گئے ہیں۔

''لگتا ہے کہ تم پر پھر فلسفیانہ موڈ طاری ہو رہا ہے...... وہ سامنے آئس کریم والا آ رہا ہے...... اسے تھوڑا سا بزنس دیتے ہیں۔ اس سے تمہیں بھی افاقہ ہو گا۔'' کنول نے کہا۔

انہوں نے دو آئس کریم اسٹکس لیں اور کھاتے ہوئے ٹیتھ ٹمپل کی طرف بڑھتے رہے۔ ٹمپل کی عمارت سادہ اور قدیم تھی۔ بہرحال عمارت کی سادگی میں بھی ایک طرح کی شوکت تھی۔ اندر سے ڈھول پیٹنے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز قریباً ایک کلومیٹر دور سے ہی آنے لگی تھی۔ دراصل اس آواز کو دور تک پھیلانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر استعمال کئے جاتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ٹمپل کے اندر تھے۔ کنول مسلسل ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی

وہ بتا رہی تھی کہ ڈمبولا میں خاور کا کھوج لگانے کے لئے بھائی جان کمار اور چاچو کیا کر رہے ہیں۔ گاڑی کا نمبر سریش ٹھیک سے نوٹ نہیں کر سکا تھا۔ خاص طور آخری ایک ہندسے کے بارے میں شک تھا۔ سیکنڈ لاسٹ ہندسہ یقینی طور پر پانچ تھا یعنی کم از کم بیس گاڑیاں ایسی تھیں جن کے بارے میں انہیں کھوج لگانا تھا۔ میں سے کوئی ایک ایسی سرخ جیگوار تھی جس میں پندرہ روز پہلے خاور بیٹھا تھا اور ٹمپل سے روانہ ہوا تھا۔

بظاہر کنول کی یہ ''ہلکی پھلکی'' باتیں یاسر دلچسپی سے سن رہا تھا۔ لیکن یہ باتیں اسے رے بے قرار کر رہی تھیں۔ وہی زہریلا دھواں تھا جو اس کے سینے میں خاموشی بھرتا چلا جاتا تھا۔

جب وہ دونوں ٹمپل کے اندر داخل ہو گئے تو یاسر کو قدرے سکون محسوس ہوا۔ اب کی گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔ وہ ایک ایسی عمارت میں تھے جو دنیا بھر کے وں کی دلچسپی کا مرکز تھی۔ یہ ٹیتھ ٹمپل تھا۔ اس میں بدھا کا دانت ایک بیش قیمت دوق میں محفوظ کیا گیا تھا۔ ہر سال دنیا بھر سے لاکھوں بدھسٹ اور غیر بدھسٹ مقدس دانت کی زیارت کے لئے کینڈی پہنچتے تھے۔

400 روپے میں دو ٹکٹ لے کر کنول اور یاسر اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ ایک شکوہ سادگی نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ ایک کشادہ جگہ پر گیروے کپڑوں لے چند نوجوان بھکشو آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے گلے میں نقارہ نما ڈھول تھے رہ انہیں بڑے تواتر سے پیٹ رہے تھے۔ یہی آواز تھی جو ٹمپل سے نکلتی تھی، جھیل پر تی تھی اور پورے کینڈی میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔

گیلریوں اور سیڑھیوں پر سیاحوں کا اژدھام تھا۔ پتھریلے فرشوں پر ان گنت ننگے پاؤں سست روی سے حرکت کر رہے تھے۔ بدھا کے مجسموں اور نوادرات کے سامنے کیمروں کی فلش لائٹس چمک رہی تھیں اور ویڈیو کیمرے ہر ہر نقش کو اپنے اندر جذب کر رہے تھے۔

دوسری منزل کی ایک ''طویل مقدس گیلری'' کی طرف جانے کے لئے انگریز سیاحوں کا ایک گروپ پتھریلی سیڑھیوں پر دھیرے دھیرے حرکت کر رہا تھا۔ یاسر اور

کنول اس گروپ کے پیچھے تھے۔ چند انگریز لڑکیاں پشت سے نظر آ رہی تھیں۔ ان کی پتلونیں جسم سے یوں چپکی ہوئی تھیں کہ جسم کا حصہ نظر آ رہی تھیں۔ حسب رواج پتلونوں اور شرٹوں کے درمیان چکا چوند پیدا کرنے والے کچھ علاقے خالی چھوڑ دیئے گئے تھے۔ ایسی ہی ایک انگریز حسینہ نے کچھ زیادہ ہی نظر نوازی کا اہتمام کیا تھا۔ بازو بھی ''نیم عریانی'' سے کچھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ان بازوؤں کے بے ہودہ ٹیٹو دکھائی دے رہے تھے۔ ایک مذہبی مقام پر یہ لباس اور حلیہ کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ یاسر تو یہ بات بس سوچ کر رہ گیا مگر کنول خاموش نہیں رہی۔ اس نے لڑکی کو نرمی سے مخاطب کیا، پھر سرگوشیوں میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ لڑکی اور اس کا ایک ساتھی پہلے تو جز بز نظر آئے مگر پھر دوستانہ انداز میں کنول کی باتیں سننے لگے۔ لڑکی نے ایک اسکارف نما کپڑا اپنے کندھوں پر اوڑھ لیا اور مسلسل اثبات میں سر ہلانے لگی۔

یاسر نے یہ حقیقت پہلے بھی نوٹ کی تھی کہ جو کچھ کنول کے دل میں ہوتا ہے وہی اکثر اس کی زبان پر بھی آ جاتا ہے۔ اس حوالے سے کنول کا یہ دعویٰ شاید درست تھا کہ وہ اندر باہر سے ایک جیسی ہے۔ وہ اس بارے میں سوچتا رہا اور کنول کے ساتھ ٹمپل کی بھول بھلیوں میں گھومتا رہا۔

خوشبوئیں سلگ رہی تھیں، ڈھول اور نفیریوں کی آواز در و دیوار میں گونجتی تھی۔ چھوٹی پتی کے سفید پھول مقدس مورتیوں کے سامنے نچھاور کئے جا رہے تھے۔ ہجوم میں ہولے ہولے قدم بڑھاتے ہوئے بالآخر وہ اس خاص الخاص جگہ پر پہنچے جہاں بدھا کا دانت ایک منقش طلائی بکس میں رکھا گیا تھا۔ عقیدتوں، خوشبوؤں اور نقش و نگار میں چھپا ہوا بکس زائرین سے کافی فاصلے پر تھا۔ مقدس دانت تو کجا، بکس کی جھلک نظر آ جانا ہی کارِ دشوار تھا۔ مقدس بکس پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ تمنائیں، مرادیں، شکرانے، آنسو سب کچھ وہی تھا جو عبادت گاہوں میں نظر آیا کرتا ہے ...... جونیپون ہوٹل کے سامنے گرجا گھر میں نظر آتا تھا اور ...... ایک دم ان لمحات میں تکہ شاپ کا منظر یاسر کی نگاہوں میں گھوما اور پھر اجے کا چہرہ پردۂ تصور پر چمک گیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ایسا اس وجہ سے ہوا تھا کہ وہ نوکری سے نکال دیا گیا تھا اور وہ نوکری سے اس لئے نکالا

گیا تھا کہ یاسر نے اسے سخت ڈانٹ پلائی تھی لیکن اس میں یاسر کا تو کوئی قصور نہیں ... یاسر کا تو وہی کردار تھا جو کہانیوں میں اس شخص کا ہوتا ہے جو عین موقع پر شہر میں ب سے پہلے داخل ہو جاتا ہے۔

دانت کے بکس کے سامنے سے گزرنے کے بعد وہ ایک وسیع چیمبر میں پہنچے۔ اں بدھا کا ایک بہت بڑا مجسمہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت سی فریم شدہ ویریں تھیں۔ ان تصویروں میں تاریخی حوالوں کے ساتھ اس ٹمپل کی کہانی بیان کی ئی تھی۔ اس تصویری کہانی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے وہ باہر نکل آئے اور پاس ہی ماس کے ایک خوبصورت قطعے پر آ بیٹھے۔

گفتگو کا رخ کولمبو میں گزرے ہوئے دس خوبصورت دنوں کی طرف مڑ گیا۔ وہ بوٹی چھوٹی باتوں کو یاد کرنے لگے اور خوش ہونے لگے۔ گال فیس روڈ پر چھتریوں کے جھرمٹ اور ان چھتریوں کے نیچے فطرت کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے جوڑے، کرس لیٹ کی رونقیں، ماؤنٹ لیوینیا کے ساحل پر ان دونوں کے درمیان ہونے والی دھینگا شتیاں، کولمبو کی بسوں میں پیش آنے والے چھوٹے بڑے واقعات۔ وہ پتہ نہیں کیا کیا ذکرتے رہے اور خوش ہوتے رہے۔

پھر یہ گفتگو اس مرحلے میں پہنچ گئی جب کنول ایک اداس صبح کو کولمبو سے رخصت ہوئی تھی اور ہوٹل سے ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے فلائنگ ہارس نے اپنے ٹک ٹک کے وسیلے سے ان دونوں کے چھکے چھڑائے تھے ...... اس کے بعد کیا ہوا تھا، اس کے بعد کنول رخصت ہوئی تھی ...... اور جب وہ رخصت ہوئی تھی اس وقت کیا ہوا تھا؟ اس وقت ...... اس وقت یاسر نے ایک بات کہی تھی، ایک بات جو حجاب کے بات پردے چاک کر کے بے ساختہ اُس کے ہونٹوں سے ادا ہوئی تھی۔ یاسر نے معنی خیز انداز میں کہا تھا ...... وہ لڑکی والی بات مذاق نہیں تھی کنول ...... کنول خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

گاڑی کی وسل سنائی دی تھی۔ سفید فام سیاحوں کی ایک شور مچاتی ہوئی ٹولی کنول اور یاسر کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ کنول کا ردِعمل ایک راز رہ گیا تھا۔ وہ ابھی تک راز تھا۔ یاسر کو اندازہ ہوا کہ دونوں کی گفتگو اس رخ پر چلتی رہی تو بات اس راز تک

پہنچ جائے گی...... وہ اس راز کو جاننے کے لئے ابھی تیار ہی نہیں تھا...... اس نے نرم ملائم گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جھیل کے جھلملاتے پانی کو دیکھا اور ایک دم گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

”تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کنول کہ تصویری نمائش کا کیا بنا؟“

”کون سی نمائش؟“

”آفرین ہے تمہاری یادداشت پر...... بھئی وہی فوٹو گرافی کی نمائش جو یہاں منگل کو ہونا تھی اور جس میں تمہیں خاور صاحب کا ”کلیو“ ملنے کی اُمید تھی۔“

”ہاں...... وہ نمائش تین دن جاری رہی۔ تین دن میں سارا سارا دن یہاں موجود رہی۔ پھر پتہ چلا کہ نوریلیا میں ڈربی ہو رہی ہے...... انڈیا سے بھی گھڑ سوار حصہ لے رہے ہیں، وہاں چلی گئی۔ کافی گھومی پھری ہوں...... کئی لوگوں سے ملی ہوں لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا۔ بس اب تو اسی ”ڈمبولا والی اطلاع“ پر دارومدار ہے...... خدا کرے......“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

”کیا...... خدا کرے؟“

”خدا کرے کہ بھائی کمار کوئی اچھی اطلاع لائیں۔“ اس نے جلدی سے فقرہ مکمل کیا۔

وہ دس بجے کے قریب گھر لوٹے۔ بلندی کی طرف جاتی ہوئی سڑک اب تاریک اور ویران تھی۔ دور نشیب میں جھیل کا پانی چمک رہا تھا اور کنول کے جسم کی طرح ڈول رہا تھا۔ گھر کے مین دروازے پر جسیم سیاہ کتا اور اس کا چھوٹا سفید اسسٹنٹ اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ یاسر کے قدم رکنے لگے۔ وہ بولا۔

”بھئی تمہاری دیدی کا یہ کالا کتا کینڈی میں میرے قیام کو ضرور مختصر کر دے گا۔“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی اور ہنستے ہوئے دوہری ہو گئی۔ یاسر نے اعتراض کیا۔

”یہاں میرا خون خشک ہو رہا ہے اور تمہاری ہنسی چھوٹ رہی ہے۔“

”بات ہی ہنسنے کی ہے۔“ وہ بولی۔

”کیا مطلب؟“

”تمہاری نظر کے ساتھ ساتھ تمہارا مشاہدہ بھی کمزور ہے۔“

”پہیلیاں ہی بوجھواؤ گی یا کچھ بتاؤ گی بھی؟“

کنول نے سیاہ کتے کو پچکار کر راستے سے ہٹایا اور اندر داخل ہو گئی۔ اپنے کمرے طرف مڑنے سے پہلے وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔

”یہ کتا نہیں ہے۔“

یاسر نے پلٹ کر مین دروازے کی طرف دیکھا اور کھوپڑی پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ ی کوتاہ نظری، نالائقی کی حدوں کو چھو گئی تھی، یہ کتیا تھی۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا، کچھ دیر بعد کنول کی والدہ سمیت سارے اہل خانہ ر آ گئے۔ تاہم کنول کے سنجیدہ صورت چاچو نہیں تھے۔ یاسر کے پوچھنے پر کنول نے ا۔

”ابھی آدھ گھنٹہ پہلے وہ ڈمبولا چلے گئے ہیں۔ وہاں سے بھائی جان کا فون آیا ۔ انہوں نے چاچو کو فوراً پہنچنے کے لئے کہا ہے۔“

”کیوں......؟“ یاسر چونکا۔

کنول کی بجائے دیدی آشا بولی۔ ”لگتا ہے کہ خاور کا کوئی اتہ پتہ ملا ہے۔ انہوں نے فون پر بس اتنا کہا ہے کہ پرارتھنا کرو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اچھی خبر لے کر آئیں۔“

کنول کی والدہ نے آنکھوں میں آنسو بھر لئے، جھولی پھیلا کر بولیں۔

”یا اللہ اب ہمارا اور امتحان نہ لے...... ہم بڑے کمزور ہیں مولا...... اور سب سے زور میں ہوں۔ میری مشکل آسان کر دے۔“

دیدی آشا نے کہا۔ ”انہوں نے بتایا ہے کہ اس گاڑی کا پتہ چل گیا ہے جس میں ر بیٹھا تھا۔ صبح تک بھگوان نے چاہا تو ساری بات کھل جائے گی۔ انہوں نے کہا ہے کہ صبح سویرے وہ پھر فون کریں گے۔“

کنول کی والدہ نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں جوڑ دیئے اور ماتھا ہاتھ کی انگلیوں ٹیک دیا۔ ان کی انگلیوں میں تسبیح جھول رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے ٹپکنے والے سو میز کی شفاف سطح پر چمک رہے تھے۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور سنہالی زم اویرال کو آوازیں دینے لگیں۔ ملازم آیا تو کنول کی والدہ نے اپنی اوڑھنی کے پلو پانچ پانچ سو کے دو نوٹ کھولے اور اسے تھماتے ہوئے بولیں۔

”جا لڑکے! سارے پیسوں کا کھانا لے آ اور بس اڈے پر جا کر فقیروں میں بانٹ دے۔ سب سے کہنا کہ دعا کریں۔ ایک دکھیاری ماں کے لئے دعا کریں۔“

ملازم روپے لے کر الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ یاسر ساکت بیٹھا تھا لیکن اس کے اندر تہلکہ مچا ہوا تھا۔ اس کے جذبات اس فیملی سے کتنے مختلف تھے۔ وہ منفی انداز میں سوچنے پر مجبور تھا۔ چاہتے ہوئے بھی مثبت انداز میں نہیں سوچ پا رہا تھا۔ اس نے چور نظروں سے کنول کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیت کو جاننے کی کوشش کی۔ چہرے نے کچھ نہیں بتایا۔ جھکی جھکی پلکوں کے نیچے کیا ہے، وہ کچھ بھی نہ جان سکا۔ بس اس نے والدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اسے ہولے ہولے سہلا رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ تسلی بخش انداز میں والدہ کا کندھا بھی چوم لیتی تھی...... کچھ دیر بعد کھانا آ گیا۔ وہ جب سے سری لنکا آیا تھا، زیادہ تر چاول ہی کھا رہا تھا۔ دوسرے معنوں میں معقول کھانے سے محروم تھا۔ تاہم یہاں ڈنر میں اسے پاکستانی انداز کی چپاتی ملی، اچار گوشت ملا اور فرنی ملی۔ اگر یہ سب کچھ کسی اور وقت ملا ہوتا تو وہ یقیناً لطف اندوز ہوتا۔ مگر فی الوقت تو سینے میں دھواں بھرا تھا اور گلے میں پھندا سا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے چہرے سے خوش نظر آنا پڑ رہا تھا۔

کھانے کے بعد وہ جلد ہی سونے کے لئے چلا گیا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا اور اپنے آپ سے لڑتا رہا۔ وہ خود کو ڈانٹتا رہا، ملامت کرتا رہا، وہ کیوں بدخواہی کر رہا تھا۔ اس کی سوچ خاور کے حوالے سے ویسی کیوں نہیں تھی جیسی اس فیملی کی تھی۔ اطراف میں سناٹا تھا۔ ہلکی سی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ بس کسی وقت مین گیٹ کی طرف سے گرانڈیل کتیا کی آواز بلند ہوتی تھی اور دور تک گونج جاتی تھی۔ یہ آواز جیسے کتیا کے حلق سے نہیں اس کے وسیع و عریض سینے سے برآمد ہوتی تھی۔

یہ کانٹوں کا بستر تھا اور کنول کی سوچیں ہر طرف سے حملہ آور ہو رہی تھیں۔ وہ کتنی بے خبر تھی، کتنی لاپرواہ تھی۔ کیا وہ حقیقت میں ایسی ہی تھی؟ وہ ہولے سے اٹھا اور کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھا ایک قریبی کمرے میں نٹ کھٹ اور اس کی ننھی بہن ہیما سو رہے تھے۔ کنول کی والدہ ان کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ ان کے

یک ہاتھ میں تسبیح تھی۔ انہوں نے سوئے ہوئے بچوں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا، چھ پڑھ کر ان پر پھونکا پھر نیچے جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی لیکن جاتے اتے ایک دم رکیں اور یاسر کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ یاسر جلدی سے بستر پر ٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کنول کی والدہ اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے یہاں ی وہی عمل دہرایا۔ بڑی آہستگی سے یاسر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ غالباً آیت لکرسی پڑھ رہی تھیں۔ یاسر کو پھونک مار کر وہ پیچھے ہٹیں، بستر کی چادر کا ایک کنارہ فرش و چھو رہا تھا۔ انہوں نے یہ کنارہ سمیٹ کر اوپر کیا پھر دروازے کو بے آواز بند کرتی ئی باہر چلی گئیں...... یاسر کو اپنے سر پر دیر تک ایک شفقت بھرے ہاتھ کا لمس محسوس وتا رہا۔ یہ لمس اس نے مدتوں بعد محسوس کیا تھا۔ اسے لگا جیسے یہ لمس اس نے چودہ ندرہ سال بعد محسوس کیا ہے۔ شاید یہ تب کی بات تھی جب اس کی امی ابھی زندہ ھیں۔ جب وہ ان کی گود میں سر رکھتا تھا۔ جب وہ ان کے بدن کی مہک سونگھتا تھا۔ ہ بے حرکت لیٹا رہا اور اس مقدس لمس کی لذت اپنے سارے جسم میں محسوس کرتا رہا۔ س نے کنول کی والدہ کو اس گھر میں دیکھا تھا۔ لیکن اس نے کہیں بھی دیکھا ہوتا، ایک بار انہیں بڑے غور سے ضرور دیکھتا۔ وہ سرتاپا ایک ماں نظر آتی تھیں۔ ایک خوبصورت ماں۔ ان کی آواز ایک ماں کی آواز تھی۔ ان کی ہنسی، ان کے آنسو، ان کی نگاہ، ان کا بولنا اور ان کا چپ ہونا...... سب کچھ ایک ماں کا تھا۔

رات پتہ نہیں کس پہر یاسر کو نیند آ گئی۔

اگلا دن چمکیلا اور روشن تھا...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک مضطرب دن بھی تھا۔ ساری فیملی کے کان فون کی آواز پر لگے تھے۔ کنول کی والدہ تو تسبیح پکڑے مستقل فون کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ ڈمبولا سے کنول کے چاچو نے کال کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک لیکچرار صاحب کے ساتھ ڈمبولا کے ایک قریبی قصبے میں جا رہے ہیں۔ دو تین گھنٹے بعد واپس آئیں گے اور پھر انہیں حتمی نتیجے سے آگاہ کریں گے۔

انہوں نے فون پر کچھ بھی واضح نہیں بتایا تھا پھر بھی اندازہ سا ہو رہا تھا کہ صورت حال مبہم ہے۔ ایک بار پھر فون کا انتظار شروع ہو گیا۔ امید تھی کہ چار پانچ بجے تک

چاچو یا کمار صاحب کی طرف سے رابطہ ہو گا لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ اہل خانہ کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا...... اور اہل خانہ میں کنول بھی شامل تھی۔ گھر میں گھومتے پھرتے اس کی نگاہ بار بار فون سیٹ کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ گاہے گاہے وہ انگلیاں مروڑنے لگتی تھی۔ کسی وقت باہر نکل کر لان میں ٹہلنے لگتی تھی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر یاسر کے سینے میں درد سا ہوتا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور اضطراب بڑھتا رہا۔ اس اضطراب میں یاسر بھی شامل تھا مگر اس کے اضطراب کی نوعیت مختلف تھی۔ رات نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ کنول کی والدہ قریب ہی بیٹھی تھیں لیکن انہوں نے فون ریسیو نہیں کیا۔ غالباً ان میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ ریسیور اٹھا سکتیں۔ آشا نے آگے بڑھ کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف کنول کے چاچو ہی تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ کینڈی واپس آ رہے ہیں۔

آشا نے بے تاب ہو کر پوچھا کہ خاور کا کچھ پتا چلا؟ انہوں نے جواب میں بتایا کہ وہ کینڈی پہنچ کر سب بتاتے ہیں۔ ان کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی فوری خوشخبری موجود نہیں ہے۔ شاید وہ اپنی کوشش میں جزوی طور پر ناکام ہوئے تھے یا پھر مکمل طور پر ہی ناکام ہو گئے تھے۔ بہر حال وہ اہل خانہ کو فوری طور پر مایوس کرنا نہیں چاہتے تھے۔

کنول کے چاچو اور کمار صاحب کی واپسی رات بارہ بجے کے قریب ہوئی۔ تمام اہل خانہ جاگ رہے تھے۔ سب سے زیادہ بے قراری کنول کی والدہ کو تھی۔ چاچو سلیمان اور کمار صاحب کے چہرے دیکھتے ہی سب کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی مثبت اطلاع نہیں ہے۔ کمار صاحب ایک خوش رو اور بلند قامت شخص تھے۔ آشا کے ساتھ ان کی جوڑی بڑی مناسب نظر آتی تھی۔ کنول نے یاسر کے ساتھ ان کا تعارف کرایا۔

”یاسر! یہ ہیں بھائی جان کمار۔ کینڈی کے مشہور ریڈیالوجسٹ۔ اور بھائی جان! یہ ہے یاسر۔ ہم دونوں نے کولمبو اکٹھے دیکھا ہے۔“

کمار صاحب نے یاسر کے ساتھ خوش اخلاقی سے ہاتھ ملایا۔

”بھئی کنول نے تمہاری بہت تعریفیں کی ہیں اور میرے خیال میں ٹھیک ہی کی ہیں۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

عین اسی وقت یاسر کی نگاہ چاچو سلیمان کے چہرے پر پڑی۔ ان کے ماتھے پر ناگواری کی ایک شکن نمودار ہو کر اوجھل ہو گئی۔

چاچو سلیمان اور کمار صاحب نے ڈمبولا کے حالات اور اپنی کوششوں کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یوں تھا۔ کمار صاحب نے اپنے ایک لیکچرار دوست کے ذریعے مطلوبہ گاڑی تک پہنچنے کے لئے کافی کوشش کی اور آخر اس میں کامیاب ہو گئے۔ یہ گاڑی ڈمبولا ہی میں کوکا کولا کے ایک ڈسٹری بیوٹر کی ملکیت تھی لیکن عام طور پر یہ گاڑی ڈسٹری بیوٹر کے چھوٹے بھائی کے استعمال میں رہتی تھی۔ کمار صاحب اپنے لیکچرار دوست کے ساتھ اس ”چھوٹے بھائی“ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ سریش بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اس نے بھی گاڑی پہچانی اور تصدیق کی کہ یہی وہ سرخ جیگوار ہے جس میں اس روز خاور صاحب سوار ہو کر گئے تھے لیکن اس کے بعد جو کچھ معلوم ہوا وہ مایوس کن تھا۔ یہ بات ثابت ہوئی کہ جیگوار والوں سے خاور صاحب کا کوئی براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ اس روز راک ٹمپل کے باہر خاور صاحب نے جیگوار والوں سے صرف لفٹ لی تھی...... بعد ازاں وہ ڈمبولا سے باہر گالورا نامی آبادی کے چوراہے پر گاڑی سے اتر گئے تھے۔ اس بات کا پتہ چلنے کے بعد کل دوپہر کمار صاحب، چاچو سلیمان اور سریش وغیرہ گالورا نامی بستی میں پہنچے تھے۔ کمیونٹی کے لوگوں سے مل کر انہوں نے خاور کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی مگر فوری طور پر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ گالورا نامی اس بستی میں کہیں خاور کا سراغ لگ جاتا۔ اس امکان کا جواز یہی تھا کہ راک ٹمپل سے لفٹ لینے کے بعد خاور بستی کے قریب اترا تھا۔

چاچو سلیمان اور کمار صاحب کی واپسی حوصلہ شکن رہی تھی۔ ایک بار پھر سب کے چہروں پر مایوسی نظر آنے لگی تھی۔ خاص طور سے کنول کی والدہ نے بہت اثر لیا۔ وہ نم ناک آنکھیں لئے خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور دروازہ بند کر لیا۔ کنول بھی گم صم تھی۔ چاچو سلیمان نے اس کے ساتھ ہمدردی کے چند بول بولے اور پھر وہ بھی سونے کے لئے چلے گئے۔ یاسر بھی بالائی منزل پر جانے کے لئے اٹھ گیا۔ جب وہ زینوں کی طرف مڑ رہا تھا اس کی نگاہیں دیدی آشا کی نگاہوں سے ملیں۔ ایک بار

پھر اسے ان نگاہوں میں ایک دبا ہوا سا راز نظر آیا۔ کوئی بات...... کوئی چونکا دینے والی کیفیت۔

وہ زینے طے کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا لیکن کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس کی نگاہ برآمدے کی کھڑکی میں سے گزر کر باہر چلی گئی۔ اب اس کے لیے کمرے کی طرف بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی میں سے نظر آنے والا منظر ہمیشہ سے زیادہ سحر انگیز دکھائی دے رہا تھا...... رات بھیگی ہوئی تھی اور جھیل کا پانی خاموش تھا۔ اس میں خوبصورت روشنیوں کا عکس تیرتا تھا...... اور جھیل کے پار بدھا مندر اور کینڈی کی اونگھتی ہوئی روشنیاں سرسبز وادیوں اور چوٹیوں سے بغل گیر ہو کر آنے والی ہوا میں کسی الھڑ دوشیزہ کا سا بانکپن تھا۔ کھڑکی کے عین سامنے میز تھا اور آرام دہ کرسیاں تھیں۔ یاسر کو یہاں بیٹھنا بستر پر سونے سے ہزار درجے بہتر لگا۔ ایسے منظر پر تو ہزاروں راتوں کا آرام قربان کیا جا سکتا تھا۔

وہ کمرے میں گھسنے کا ارادہ ملتوی کر کے ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ ہوا سے اُس کے بال ہولے ہولے پیشانی پر جھولنے لگے۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیں اور آرام دہ کرسی پر کچھ نیچے کو کھسک گیا۔ دل میں میٹھا میٹھا سا درد تھا۔ اس درد کے علاوہ ایک تڑپ بھی تھی جو اس کے پورے جسم میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس درد اور تڑپ کا کیا نام تھا...... بہت کوشش کے باوجود وہ ان دونوں کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ بس اسے اتنا معلوم تھا کہ ان دونوں کیفیتوں کا تعلق کنول سے ہے۔

وہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ اچانک اس کے نتھنوں میں کافی کی مہک آئی۔ نیچے کچن میں کوئی کافی بنا رہا تھا۔ کیا یہ کافی اس تک بھی پہنچے گی؟ یاسر نے سوچا۔ شاید پہنچ جائے اور شاید اسے پہنچانے والی کنول ہو۔ کئی خوشگوار امکانات اس کے ذہن میں جاگ گئے...... اور پھر تھوڑی دیر بعد اسے زینوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی اوپر چلا آ رہا تھا...... یہ نسوانی قدموں کی چاپ تھی۔ ایڑی کی کھٹ کھٹ...... یاسر کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی ٹانگیں کھڑکی کی چوکھٹ سے اتاریں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ اوپر آ گئی۔ وہ کنول نہیں تھی...... وہ آشا تھی...... دیدی آشا۔ ٹرے میں کافی

کے دو کپ بھاپ دے رہے تھے۔

"میرے خیال میں تمہیں کافی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"آپ کا اندازہ درست ہے۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں جاگ رہا ہوں؟"

"میں نے نیچے لان میں سے تمہارے پاؤں دیکھے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ تم کھڑکی کے پاس بیٹھے ہو۔ یہ کھڑکی ہے ہی ایسی۔ بندے کو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیتی ہے۔" انہوں نے ایک کپ یاسر کے سامنے رکھتے ہوئے کرسی سنبھال لی۔

"باقی سب لوگ سو گئے؟" یاسر نے پوچھا۔

"ہاں...... کمار اور چاچو تو تھکے ہوئے تھے۔ آتے ساتھ ہی بیڈ رومز میں چلے گئے۔ خالہ سعدیہ (کنول کی امی) کو میں نے سکون آور گولی دی ہے۔ وہ نراش تھیں اور بڑی ٹینشن لے رہی تھیں۔ میں نے کہا سو جائیں گی تو صبح تک طبیعت سنبھل جائے گی۔"

"انہوں نے خاور صاحب کا دکھ دل سے لگا رکھا ہے۔" یاسر نے کہا۔

"ہاں...... خالہ جان کی بس ایک ہی بہن تھی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ دونوں بہنوں کا پیار مثالی تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ خالہ جان کی چھوٹی بہن کا نام ثوبیہ تھا۔ ہم انہیں آنٹی ثوب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ سرطان کی مریضہ تھیں۔ مرنے سے پہلے انہوں نے خالہ سعدیہ سے ایک وچن لیا تھا۔ وہ وچن یہ تھا کہ وہ ان کے پندرہ سالہ بیٹے خاور کو اپنے پاس اپنی نگہبانی میں رکھیں گی اور بچپن میں کیے ہوئے رشتے کو نبھائیں گی یعنی خاور کی شادی کنول سے کریں گی۔ خاور کے والد آنٹی ثوب کو کئی سال پہلے طلاق دے کر شادی کر چکے تھے۔ خاور کا اور کوئی بھائی بہن بھی نہیں تھا۔ ماں کی وفات کے بعد خاور خالہ سعدیہ کے پاس ہی آ گیا۔ خالہ نے اسے اپنے بیٹوں کی طرح رکھا اور اس کی ہر ضرورت پوری کی۔ وہ اس سے بے انتہا پیار کرتی ہیں۔ شاید بہن کی محبت بھی اکلوتے بھانجے کی محبت میں جمع ہو گئی ہے۔ شاید یہ ان کے بے پناہ لاڈ پیار کا اثر ہی تھا کہ خاور جوں جوں بڑا ہوتا گیا اس

کے اندر سرکشی آتی گئی اور وہ اپنی من مرضی کرنے لگا۔ خالہ سعدیہ نے چاچو سلیمان
خاور کی جائیداد کا نگران بنا رکھا تھا۔ خاور کے من میں یہ بات سمانے لگی کہ چاچو اور
خالہ سعدیہ اُس پر بے جا پابندیاں لگا رہے ہیں اور اسے اپنے ساتھ باندھ کر رکھنا
چاہتے ہیں۔ وہ کنول کے ساتھ ہی کھیل کود کر جوان ہوا ہے، کنول کو پسند بھی کرتا ہے
لیکن اپنے منفی خیالات کی وجہ سے کنول کے ساتھ بھی اس کا رویہ سخت ہو جاتا تھا۔ وہ
اکثر اس کا دل دکھانے والی باتیں کرتا تھا۔ اب بھی اس نے جو کچھ کیا ہے شاید اپنے
مہربانوں کا دل دکھانے کے لئے ہی کیا ہے۔ بات معمولی سی تھی۔ خاور نے ایک دن
بیٹھے بٹھائے یکدم اعلان کر دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے اور ایک دو ماہ کے اندر کرنا
چاہتا ہے۔ یہ ایک طرح کا نادر شاہی حکم تھا۔ خالہ سعدیہ تو اپنی بے پناہ محبت کی وجہ
سے کچھ نہیں بولیں مگر کنول کو پریشانی ہوئی۔ وہ تن من سے ایم اے جرنلزم کی تیاری
میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ان دنوں خالہ سعدیہ کی آنکھوں کی تکلیف نے بھی
شدت پکڑی ہوئی تھی۔ کنول نے خاور سے تھوڑا سا وقت مانگا بس اسی بات پر وہ بگڑ
ہوا ...... اور ایک بار پھر سیاحتی دورے پر نکل گیا۔ اس مرتبہ تو یہ دورہ بہت ہی طویل
ثابت ہوا ہے۔ کچھ پتہ ہی نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اس کی پراپرٹی کا
کرایہ وغیرہ بھی اب براہِ راست اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا ہے۔ وہ کلی طور پر الگ
تھلگ ہو گیا ہے۔''

''خالہ سعدیہ اب کیا کہتی ہیں؟''

''ان کا حال برا ہے اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ برا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ہر
وقت اپنے آپ کو کوستی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ اپنی بہن کو دیا ہوا وچن پورا نہیں کر
سکیں، ان کی کوتاہیوں کی وجہ سے خاور کے مزاج میں آوارگی آئی اور کنول کی جلد
بازی کی وجہ سے خاور ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا۔ انہوں نے اپنی اس کیفیت کو ذہنی
بیماری بنا لیا ہے۔ عجیب عجیب واہمے انہیں گھیرے رکھتے ہیں۔ لیٹے لیٹے ہڑبڑا کر اٹھ
بیٹھتی ہیں اور اونچی آواز میں رونے لگتی ہیں۔ کبھی کہتی ہیں کہ میرے کانوں میں ڈھول
کی آواز آتی ہے، وہ مجھ سے پوچھتی ہے کہ آپا میرے خاور کو کہاں بھیج دیا ہے، اس
کے سر پر سہرا کب باندھو گی۔ کسی وقت تو بالکل خبطی سی ہو جاتی ہیں۔ ان کی حالت

پھر کنول کے ذہن پر بھی بوجھ پڑتا ہے......''
دیدی آشا نے چند لمحے توقف کیا پھر بولیں۔ ''پتہ نہیں ہم لوگ بچپن میں رشتے
یوں کرتے ہیں؟ ہم سب کچھ جانتے بوجھتے ہیں، پھر بھی ہم سے یہ غلطی سرزد ہوتی
ہے اور میرے خیال میں یہ چھوٹی غلطی نہیں۔''

یاسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کافی ختم ہو چکی تھی۔ چاند کھڑکی میں سے اپنی جھلک
دکھانے لگا تھا۔ بدھا کے مندر کے کلس چمک رہے تھے۔ دور نیچے کوئی ٹک ٹک شور
کرتا جھیل کے کنارے جا رہا تھا۔ جسیم کتیا شاڈی نے چند مرتبہ زوردار آواز نکال کر
اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور پھر خاموش ہو گئی۔

قریبی کمرے میں سوئے ہوئے بچوں میں سے کسی نے نیند کی حالت میں کسمسا
کر ماں کو پکارا۔ آشا جلدی سے اٹھی اور ان کی خواب گاہ کی طرف چلی گئی۔ بچے کی
طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ دو تین منٹ میں واپس آ گئی۔ نیند شاید اس کی
آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی۔ وہ ایک بار پھر بے تکلفی کے ساتھ یاسر کے سامنے
بیٹھ گئی۔ اتنی رات گئے یاسر کے ساتھ مصروف گفتگو ہونے میں اور کافی پینے میں وہ
کوئی مضائقہ نہیں سمجھ رہی تھی۔

''اور کافی بناؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں شکریہ......'' یاسر نے کہا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ یاسر بھی خاموش ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ
کنول کہاں ہے۔ لیکن یہ سوال اس کی زبان پر آتے آتے اٹک جاتا تھا۔

دونوں خاموش رہے۔ اچانک یاسر نے محسوس کیا کہ آشا کی نگاہیں اس کے
چہرے پر ہیں۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں
میں وہی معنی خیز کیفیت تھی۔ وہ گڑبڑا گیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا، جھیل کے اس پار
پگڈنڈی کی اونگھتی روشنیوں کی طرف۔

''تم سے ایک بات پوچھوں؟'' دیدی آشا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''جی پوچھیں۔'' وہ سہمے ہوئے سے انداز میں بولا۔

''برا تو نہیں مانو گے؟''

"ن...... نہیں...... آپ...... پوچھیں۔"

"میں...... تمہاری اور کنول کی دوستی کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"مم...... میں سمجھا نہیں۔"

آشا نے فضا کا تناؤ کم کرنے کے لئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان بکھیری اور ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ پھر وہ یاسر کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولیں۔

"میں کنول کو بہت عرصے سے جانتی ہوں، اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اس میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی آتی تو مجھے پتہ چل جاتا...... یہ تو بہت بڑی تبدیلی ہے۔"

"تب...... دیلی......؟ میں سمجھا نہیں۔" یاسر ہکلایا۔

"وہ بہت بدل گئی ہے۔" دیدی آشا نے گہرے یقین سے کہا۔ "اور میرا خیال ہے کہ اسے تم نے بدلا ہے۔"

"میں...... اب بھی نہیں سمجھا۔" یاسر کے ذہن میں خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بج اٹھیں۔

"میں تمہیں کیا سمجھاؤں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے سمجھاؤ۔ مجھے بتاؤ کہ کولمبو میں اس کے ساتھ کیا ہوا ہے...... وہ بہت بدل گئی ہے اور یہ تبدیلی مہینوں میں نہیں، دنوں میں آئی ہے۔ شاید ان دس دنوں میں جو کنول نے کولمبو میں گزارے ہیں۔"

"آ...... آپ اپنی بات کی وضاحت کریں تو شاید میں کچھ سمجھ پاؤں۔"

دیدی آشا نے تناؤ کم کرنے کے لئے ایک بار پھر ہونٹوں کو مسکرانے والے انداز میں کھینچا اور عمیق سانس لے کر بولیں۔

"تم تسلیم کرو یا نہ کرو لیکن مجھے وشواس ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو چکا ہے۔ کنول کے بارے میں میری نگاہ اور میرا من کبھی غلط اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ جب سے یہاں آئی ہے گم صم اور کھوئی ہوئی ہے۔ اس کی جو ذہنی کیفیت میں آج کل دیکھ رہی ہوں پہلے کبھی نہیں دیکھی...... وہ تو بے حد خوش باش...... واشگاف اور Active لڑکی ہے۔ آج کل میں اسے بالکل برعکس دیکھ رہی ہوں۔ اور شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ کنول

نے یہاں کینیڈی میں آنے کے بعد ایک ایسا کام کیا ہے جو اس نے پہلے کبھی نہیں کیا۔ بلکہ شاید اس کے پورے پریوار (خاندان) میں سے کسی نے نہیں کیا ہوگا۔"

"آپ کس کام کی بات کر رہی ہیں؟"

نیم شب کی ہوا دیدی آشا کے سیاہ بالوں کو اُڑا رہی تھی۔ انہوں نے بالوں کو جوڑے کی شکل میں سمیٹا اور بولیں۔

"جہاں تک میں جانتی ہوں کنول بڑے صاف دل کی لڑکی ہے۔ جو اس کے من میں ہو وہی اس کی زبان پر ہوتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ خوبیاں اسے اپنے والدین سے ورثے میں ملی ہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ یہ پورا گھرانہ ہی سچا کھرا گھرانہ ہے۔ عام لوگوں کی طرح یہ دو روپ نہیں رکھتے۔ جو اندر ہے، وہی باہر ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ کنول کے پتا انکل شریف کی جان ہی حق پرستی اور صاف گوئی کی وجہ سے گئی۔ وہ بنگلور کے معروف بینکار تھے۔ ان کے ایک دوست کا گاڑیوں کا شو روم تھا۔ ایک روز شام کے بعد شو روم پر کھڑے تھے۔ دو افراد لڑتے جھگڑتے اندر آئے۔ ایک نے دوسرے کو گولی مار دی۔ وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ چند منٹ بعد پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ پولیس کو اس قتل کے لئے موقع کے گواہ درکار تھے۔ ایسی گواہی دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ لوگ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ لیکن انکل شریف جیسے شخص کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے پولیس انسپکٹر کو بتایا کہ یہ واقعہ چند منٹ پہلے عین ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ وہ اس قتل کے چشم دید گواہ بن گئے۔ مدعی اور ملزم دونوں پارٹیاں بڑی مضبوط تھیں لیکن ملزم پارٹی کا اثر و رسوخ زیادہ تھا۔ ان لوگوں نے انکل شریف کو پہلے نرمی اور پھر سختی سے سمجھایا کہ وہ اس ہتیا کے چشم دید گواہ نہ بنیں۔ انکل نے کہا انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے...... وہ دیکھا ہے...... وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے، نہ ہی کریں گے۔ پھر ایک روز کسی نامعلوم شخص نے ان کی گاڑی پر فائرنگ کی۔ ایک گولی انکل شریف کے پیٹ میں لگی۔ وہ زخمی ہو کر ہسپتال چلے گئے۔ آپریشن کے بعد وہ ٹھیک ہو گئے مگر زخم اندر سے کچا رہا۔ چند ماہ بعد وہ پھر شدید بیمار ہوئے۔ شوگر کے سبب حالت مزید بگڑ گئی۔ اسی بیماری کے سبب بالآخر ان کا انتقال ہوا۔"

دیدی آشا چند لمحے خاموش رہی...... پھر گفتگو کا گمشدہ سرا پکڑتے ہوئے بولیں۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گھرانے کے دیگر افراد کی طرح کنول بھی ایک نہایت سچی اور کھری لڑکی ہے...... میں کنول کی اس خوبی کی مثالیں دیا کرتی ہوں لیکن......" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

یاسر سوالیہ نظروں سے ان کا چہرہ تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولیں۔

"یاسر! شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ کنول نے جھوٹ بولا ہے...... اور میرا خیال ہے کہ یہ جھوٹ اس نے تمہاری خاطر بولا ہے۔"

"جھوٹ...... میری خاطر؟" یاسر کی الجھن زدہ آواز لرز رہی تھی۔

دیدی آشا اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔ "کنول نے تمہیں خاور کی تلاش کے سلسلے میں کیا بتایا ہے...... میرا مطلب ہے کہ کینڈی میں اپنی مصروفیت کے بارے میں کیا کہا ہے؟"

"یہی کہا ہے کہ وہ خاور کو تلاش کرتی رہی ہے۔"

"کہاں؟"

"وہ بتا رہی تھی کہ پچھلے منگل کو ہونے والی فوٹوگرافی کی نمائش سے اسے بہت توقع تھی۔ دو تین دن نمائش گاہ میں جاتی رہی۔ پھر پتہ چلا کہ نوریلیا میں ڈربی ہو رہی ہے، وہاں انڈین گھڑسوار بھی حصہ لے رہے تھے۔ وہاں بھی وہ کافی گھومی پھری۔ پھر ڈمبولا گئی۔ کئی اہم لوگوں سے ملاقات کی۔"

دیدی آشا نے اپنی کہنیاں میز کی شفاف سطح پر ٹکائیں اور آگے کو جھک آئیں۔ ان کا چہرہ اب یاسر کے چہرے سے محض چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ وہ ڈرامائی انداز میں بولیں۔

"وہ کہیں نہیں گئی...... اگر کہیں گئی تو بس دکھاوے کے لئے۔ اس نے بدھ کے روز نمائش گاہ کا فقط ایک چکر لگایا تھا، مشکل سے پانچ دس منٹ وہاں رکی تھی۔ نوریلیا وہ سرے سے گئی ہی نہیں۔ نوریلیا کے مضافات میں چائے کی ایک فیکٹری ہے، وہ اس مشہور فیکٹری پر فیچر لکھنا چاہ رہی تھی۔ بس فیچر لکھنے کے لئے گئی تھی۔ ڈمبولا جانے والی

بھی مکمل طور پر غلط ہے۔"

اپنی بات ختم کرنے کے بعد بھی دیدی آشا کی نظریں یاسر کے چہرے پر ہی جمی رہیں۔ یاسر کو الجھن ہونے لگی۔ اس نے اپنی نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اس کے لئے مجھے قصوروار ٹھہرا رہی ہیں؟"

"میں کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرا رہی۔ میں تو بس حیران ہو رہی ہوں، ایسی کون سی بات ہے جس نے کنول جیسی لڑکی کو غلط بیانی پر مجبور کر دیا۔ اس نے غلط بیانی کی اور ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ ایسا کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی جو اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ اس کی والدہ، اس کے پیارے چاچو، اس کی بہن دیدی سلطانہ...... یہ سب کیونکر ہوا، کیسے ہوا؟"

یاسر خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان باتوں کا کیا جواب دے۔ دیدی آشا نے کہا۔

"یاسر! میں سوچ رہی ہوں اور اندر سے لرز رہی ہوں۔ جو کچھ ہونے والا ہے وہ میرے خیال میں بے حد تکلیف دہ ہے اور بہت نقصان دہ بھی...... تم سمجھ نہیں سکتے ہو یاسر! چاچو سلیمان ان معاملات میں کتنے سخت ہیں۔ وہ اس پورے پریوار کے سربراہ ہیں۔ ان کے حکم کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ خالہ سعدیہ بھی نہیں۔ انہیں ابھی تک صورت حال کی گمبھیرتا کا احساس نہیں۔ اگر انہیں شک بھی ہو گیا تو قیامت کھڑی ہو جائے گی۔"

"آپ...... کس صورت حال کی بات کر رہی ہیں؟"

"انجان مت بنو یاسر! میں ہوا میں جو کچھ سونگھ رہی ہوں، مجھے وشواس ہے کہ تم بھی سونگھ رہے ہو گے...... کنول خاور کو تلاش کرنے کے لئے بنگلور سے سری لنکا آئی تھی اور وہ تلاش کرتی بھی رہی ہے۔ لیکن اب اس تلاش کے سلسلے میں اس کے سارے جذبے سرد پڑ گئے ہیں۔ کیوں ہوا ہے ایسا...... آخر کیوں؟"

یاسر نے اپنے لہجے کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ کنول نے مجھ سے کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی، نہ ہی کوئی ایسا

اشارہ دیا ہے۔ ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ مجھے یہ لگ رہا ہے کہ......"

یاسر کی بات ادھوری رہ گئی، نیچے لابی سے چاچو سلیمان کی کھانسی کی آواز سنائی دی۔ پھر الماری کے کھٹکے کی آہٹ ابھری۔ آشا کے چہرے پر سایہ سا گزر گیا۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اوہ گاڈ! چاچو جاگ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کھانسی کی دوا ڈھونڈ رہے ہیں۔ اچھا میں چلتی ہوں۔"

انہوں نے ساڑھی کا پلو سر پر درست کیا اور شتابی سے نیچے اتر گئیں۔

یاسر بھی اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ وہ بستر پر چت لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ اس کے سینے میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ میٹھا میٹھا سا درد اب بیکراں ہو گیا تھا۔ اس کے پورے جسم میں پھیل گیا تھا۔ جذبے سلگنے لگے تھے۔ لہو میں سنسنانے لگے تھے اور رگ پٹھوں کے ساتھ اینٹھنے لگے تھے۔ یہ ایک ایسی اذیت تھی جس پر ہزاروں راحتیں قربان کی جا سکتی تھیں۔ لیکن اسے اب بھی یقین نہیں تھا کہ آشا نے جو نتیجے اخذ کئے ہیں وہ درست ہیں۔ ایسا کیونکر ہو سکتا تھا۔ جو کچھ ہوا اس کی وجہ یقیناً کچھ اور رہی ہو گی، کوئی اور جواز ہوگا جس کے سبب یہ صورت حال پیدا ہوئی تھی......کوئی اور جواز ہو گا۔ کھڑکی سے باہر چاند ایک ناریل میں اٹکا نظر آ رہا تھا۔ ہوا سرد ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے دیوار پر لگا ہوا وال کلاک اعلان کرنے لگا تھا کہ رات تقریباً گزرنے ہی والی ہے۔

ساڑھے چار کا وقت تھا۔ گھڑی کی سوئیاں آہستہ آہستہ سرکتی رہیں۔ ٹھیک چار بج کر پینتالیس منٹ پر جھیل کے اس پار ٹمپل کے لاتعداد لاؤڈ اسپیکر جاگ اٹھے۔ ٹمپل کے بھکشوؤں کی بلند آوازیں سنائی دینے لگیں......ان میں سے ایک آواز کسی گرو کی تھی اور وہ قدرے بھاری تھی۔ یہ تین چار آوازیں مل کر اپنے مخصوص انداز میں کوئی سوز (دعا) وغیرہ پڑھ رہی تھیں۔ یہی آوازیں کل رات بھی قریباً اسی وقت یاسر کو سنائی دی تھیں۔ وہ دیر تک سنتا رہا تھا۔ قریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک یہ آوازیں شب کے سناٹے میں گونجتی رہیں۔ اس کے بعد ڈھول بجنے شروع ہو گئے تھے۔ یاسر جانتا تھا کہ آج بھی

یا ہی ہوگا ان آوازوں کے اختتام پر نقاروں کا سلسلہ شروع ہو گا۔ وہ بستر پر لیٹا رہا آخر شب کی اس مناجات میں کھویا رہا۔ عجیب گاتی ہوئی سی آوازیں تھیں۔ دلکش نہ ہونے کے باوجود دلکش لگتی تھیں۔ نیند سے بوجھل، بھرائی ہوئی سی، کبھی ڈوبتی اور کبھی ابھرتی ہوئی صدائیں......نجانے ان آوازوں کو سنتا ہوا وہ کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔



اگلی صبح اس نے کنول کو ناشتے کی میز پر دیکھا۔ وہ بالکل نارمل دکھائی دے رہی تھی۔ اپنے پیارے چاچو سے چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی۔ کبھی ان کی پلیٹ میں زبردستی حلوہ ڈالتی تھی، کبھی ان کے منہ میں نوالہ رکھتی تھی، کبھی ان کے کان میں سرگوشی کرتی تھی اور خود ہی ہنس ہنس کر سرخ ہوتی تھی۔ اور یہ پیار محبت صرف چاچو کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا۔ وہ والدہ پر بھی ہزار جان سے فدا ہونے کے لئے تیار رہتی تھی۔ والدہ کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ اور جب گھر میں موجود ہوتی تھی تو والدہ کے آس پاس ہی منڈلاتی رہتی تھی۔ کل سویرے مین دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس کی نگاہ اتفاقاً کنول کی والدہ کے بیڈ روم کی طرف اٹھ گئی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کنول والدہ کے ساتھ لپٹ کر سوئی ہوئی تھی۔ آتے جاتے ایک دوسرے کا ماتھا چومنا، گلے سے لگانا، دعائیہ کلمات کہنا اہل خانہ کا معمول تھا۔

یہ بے تکلفی یاسر کو عجیب لگتی تھی لیکن اس میں یاسر کا بھی کیا قصور تھا۔ اس کے گھر کا ماحول قطعی مختلف تھا۔ وہاں بھی ایک دوسرے سے پیار کیا جاتا تھا، ایک دوسرے کے لئے دل میں خیر خواہی رکھی جاتی تھی، ایک دوسرے کو Miss کیا جاتا تھا لیکن وہاں ایسے جذبوں کا واشگاف اظہار نہیں تھا۔ یاسر کو یاد نہیں تھا کہ عیدین کے سوا ابو جان نے کبھی اسے گلے سے لگایا ہو یا بھابی نے اُس کا ماتھا چوما ہو یا کسی اور بزرگ نے وارفتگی کا مظاہرہ کیا ہو۔ وہ خود بھی اپنی چھوٹی بہن شمائلہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس پر بے تحاشا پیار بھی آتا تھا لیکن اس پیار کا زیادہ سے زیادہ اظہار یہ تھا کہ اس کی چٹیا کھینچ دی یا شائستگی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ ایک بار اس کے بڑے بھائی اپنے کام کی غرض سے کراچی گئے اور پھر وہاں سے مسقط چلے گئے۔ وہ کافی دنوں بعد لوٹے۔ جب آئے تو بیمار بھی تھے۔ یاسر پہلی دفعہ اپنے بھائی سے اتنا عرصہ

دور رہا تھا۔ ان کی کمزور صورت دیکھ کر اسے ان پر بہت پیار آیا۔ اس کا دل چاہا کہ بھائی سے کہے ...... بھائی جان! میں نے آپ کو بہت Miss کیا۔ میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ آپ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، پھر انہیں گلے سے لگا لے اور دیر تک آنسو بہاتا رہے۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ ان معاملوں میں وہ شاید بقول کنول ...... جھوٹا ہی تھا۔

ناشتے کے بعد کنول کے چاچو سلیمان ڈمبولا چلے گئے۔ انہیں کمار صاحب کے بھائی سریش سے ملنا تھا۔ دونوں کو خاور کے سلسلے میں کچھ مزید کوشش کرنا تھی۔ چاچو کے جانے کے بعد کنول نے یاسر سے کہا۔

''آؤ تمہیں کینڈی دکھاؤں۔''

دونوں حسب سابق منرل واٹر کی بوتلیں اور تھوڑا سا پھل لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ مین گیٹ پر دیو ہیکل شاڈی دھوپ میں سستا رہی تھی، ساتھ میں اُس کا سفید اسسٹنٹ بھی موجود تھا۔ یاسر کو دیکھ کر شاڈی نے کان کھڑے کئے تاہم کنول کے پکارنے پر وہ مطمئن ہوگئی اور شانِ بے نیازی سے آنکھیں موند لیں۔

یہ ایک چمکیلا، خوشگوار دن تھا۔ یاسر کو چمڑے کے جوتے بے آرام کر رہے تھے۔ اس کا ارادہ نئے جوگرز لینے کا تھا۔ دونوں ایک باٹا سٹور پر پہنچے۔ وہاں کوئی جوگر پسند نہیں آیا۔ پھر ایک اور باٹا سٹور پر گئے۔ پھر ایک اور باٹا سٹور پر ...... آخر ایک جوڑا جوگرز کا یاسر نے خرید لیا۔ لیکن جوگرز خریدنے کے ساتھ ہی اس کا ایک نقصان بھی ہوا ...... تاہم اس نقصان کا علم اسے گھر واپس پہنچ کر ہوا۔

جوگرز پہننے کے بعد یاسر ایک دم ایزی ہوگیا۔ اس کا دل چاہا کہ چلنے کی بجائے اُڑنے لگے ...... لاہور میں نم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جس طرح گاڑی کے لئے ٹائر اہم ہوتے ہیں اسی طرح بندے کے لئے جوتے اہم ہوتے ہیں، خاص طور سے سیاح کے لئے۔

دونوں کینڈی کے بازاروں میں گھومتے رہے۔ کہیں کہیں ونڈو شاپنگ بھی کرتے رہے۔ یاسر کو چلنے میں خوب مزا آ رہا تھا۔ شاید جوگرز کے علاوہ بھی اس کی کوئی ''وجہ'' تھی۔ یہ ''وجہ'' شلوار قمیص میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس ''وجہ'' کے بال جوڑے کی

صورت میں بندھے ہوئے تھے اور ان بالوں میں سری لنکا کے نقشے کی شکل کا ایک کلپ بہت جچ رہا تھا۔

"ہم کس لئے گھوم رہے ہیں؟" یاسر نے پوچھا۔

"کینڈی دیکھنے کے لئے۔"

"میرا خیال تھا کہ ہم خاور صاحب کے لئے گھوم رہے ہیں۔"

کنول کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ وہ پیشانی سے بالوں کی لٹ ہٹاتے ہوئے بولی۔ "شاید ہم دونوں کام ایک ساتھ کر رہے ہیں۔ انگریزی میں اسے "ایک پتھر سے دو پرندے مارنا" کہتے ہیں۔"

"مجھے تو بھوک محسوس ہو رہی ہے۔"

"تو چلو ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں...... ہاں...... یہاں قریب ہی کیپٹن زٹیبل ہے۔ بڑا پُرسکون ماحول ہے۔ کھانا بھی اچھا ہے۔ مچھلی کمال کی بناتے ہیں۔ سویٹ اینڈ سارو چکن بھی زبردست ہوتا ہے۔ چلو سویٹ اینڈ سارو چکن کھاتے ہیں۔ ساتھ میں آلو کے چپس اور ایگ فرائڈ رائس۔"

"کھانے کے سلسلے میں تمہارا انتخاب بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ میں اس سلسلے میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تمہیں مشورہ دوں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ "کیپٹن زٹیبل" کے نہایت پُرسکون ماحول میں تھے۔ انہیں ایک گوشے والی میز ملی تھی۔

سُوپ کی ہلکی سی چسکی لیتے ہوئے یاسر نے کہا۔ "تم کسی بھی حالت میں غلط بیانی نہیں کرتی ہو...... مجھے تمہاری یہ عادت پسند ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ میں بھی تمہارے سلسلے میں ایسے جذبات رکھ سکوں۔" وہ شوخی سے مسکرائی۔

یاسر بدستور سنجیدہ رہا۔ اس نے گویا اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کنول! مجھے تمہارے حوالے سے شدید دھچکا لگا ہے۔"

"میں...... سمجھی نہیں؟"

"تم نے غلط بیانی کی ہے...... تم نے اپنے گھر والوں سے ایک اہم بات چھپائی

ہے۔"

"کیا تم ایک اچھے دوست کی طرح مجھے تفصیل بتانا پسند کرو گے؟"

یاسر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پچھلے منگل کو فوٹو گرافی کی جو نمائش یہاں ئی تھی، اس کے بارے میں مجھے بھی تجسس تھا۔ اس نمائش کے حوالے سے خاور احب کے بارے میں کوئی سنسنی خیز خبر مل سکتی تھی۔ لیکن میری اطلاع یہ ہے کہ تم نے ائش کا رخ ہی نہیں کیا، فقط دوسرے دن تم نے وہاں چند منٹ کے لئے حاضری لوائی تھی۔ نوریلیا کے بارے میں بھی تمہارا بیان حقیقت سے دور ہے۔ وہاں کی ربی خاور صاحب کے بارے میں کوئی سراغ دے سکتی تھی مگر تم نوریلیا میں داخل ہی ہیں ہوئیں اور "ٹی فیکٹری" پر فیچر تیار کر کے واپس لوٹ آئیں۔"

کنول کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اس کی پلکوں میں خفیف لرزش نظر آنے لگی۔ تاہم چند یکنڈ میں ہی وہ مکمل طور پر سنبھل گئی۔ اس نے یاسر سے پوچھا۔

"تمہیں اس بارے میں کس نے بتایا؟"

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم میری بات کا جواب دو...... اور مجھے اب ھی یقین ہے کہ "سچ" تمہارا اوڑھنا بچھونا ہے۔"

وہ کچھ دیر تک یاسر کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پس منظر میں سری لنکن موسیقی ابھر ئی تھی اور آرائشی فوارے سے پانی چھوٹ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں جانتی ہوں تمہیں یہ بات دیدی آشا نے بتائی ہوگی۔"

"ممکن ہے کہ انہوں نے بتائی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور نے بتائی ہو۔ مگر میرا سوال اپنی جگہ ہے۔"

اس نے عمیق سانس لے کر اپنا سر چند لمحے کے لئے پیچھے کی طرف پھینکا۔ چند سیکنڈ بعد وہ سیدھی ہوئی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان جھکی ہوئی پلکوں کے ساتھ وہ بولی۔

"میں تمہاری بات کا جواب دوں گی...... لیکن اس سے پہلے تمہیں بھی اپنی ایک بات کی وضاحت کرنا ہوگی۔"

"کون سی بات؟"

''وہی بات جو تم نے کولمبو ریلوے اسٹیشن پر مجھے ''سی آف'' کرتے ہوئے کہی تھی۔''

یاسر کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ آگاہی کا لمحہ تھا۔ جو بات یاسر کے ذہن میں پیوست تھی وہی کنول کے ذہن پر بھی نقش تھی۔

وہ چند سیکنڈ تک خالی خالی نظروں سے کنول کو دیکھنے کے بعد بولا۔ ''تم کس بات کا ذکر کر رہی ہو؟''

''انجان مت بنو یاسر!'' کنول کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی تھی۔

یاسر کے بدن میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ یہ اُس میٹھی میٹھی اذیت کا طوفان تھا جو یاسر کل رات سے محسوس کر رہا تھا لیکن اب اس اذیت میں اذیت کم ہو گئی تھی اور مٹھاس بڑھ گئی تھی۔ یہ ایک ایسی جاں گسل و دلنواز کیفیت تھی جسے وہ لفظوں میں بیان کر ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ کنول نے ہمت کر کے اپنی پلکیں اٹھائیں۔ ان پلکوں پر جیسے منوں وزن تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔

''تم نے کہا تھا ...... تم نے جھوٹ نہیں بولا۔ وہ لڑکی واقعی موجود تھی۔ وہ تم سے ملنے سے پہلے ہی بچھڑ گئی ...... تم نے کہا تھا نا؟''

''ہاں ...... میں نے کہا تھا۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔

''کون تھی وہ لڑکی؟''

یاسر کا حلق خشک تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اگر اس نے بولنے کی کوشش کی تو حلق سے پھٹی ہوئی سی آواز نکلے گی۔ وہ چند لمحے تک شدید تذبذب میں رہا، پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ کوک کے دو گھونٹ پینے کے بعد وہ مسکرایا اور بولا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مشکل آسان کرتے ہیں۔ تم مجھ سے کچھ پوچھو، نہ میں پوچھتا ہوں۔''

کنول کی کٹورا آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ یاسر کی بات سن کر یہ نمی بھی مسکرا اٹھی۔ یہ نمی مسکرائی تو جیسے وسیع و عریض ہال کمرے کے اندر ہر جاندار شے کو دیکھی سی

بصورت مسکراہٹ نے ڈھانپ لیا ...... اور شاید اس ہال کمرے سے باہر بھی کینڈی کے طول و عرض میں جھیل کے پانیوں سے لے کر رنگ برنگی ٹرینوں والے سرسبز راستے تک ہر شے مسکرانے لگی ...... گنگنانے لگی۔ وہ خاموش تھے مگر اس خاموشی پر ہزار تکلم قربان کئے جا سکتے تھے۔ دل کی بات ''دل'' سننے لگا تھا اور دل ہی جواب دینے لگا تھا۔

فرائڈ رائس ڈالنے کے لئے پلیٹ پکڑتے ہوئے یاسر کی انگلیاں کنول کی انگلیوں سے ٹکرائیں۔ کنول کی انگلیاں جیسے ہچکچا کر پیچھے ہٹ گئیں ...... یہ کیسی کایا پلٹ تھی، یہ کیا انقلاب تھا۔ یہی انگلیاں تھیں ...... ہاں یہی ہاتھ تو تھے جن سے وہ یاسر کے ساتھ لپٹا جھپٹی کرتی تھی۔ یہی جسم تھا جو پی سی او کا سبز بورڈ دکھانے کے لئے یاسر کے بالکل قریب آ جاتا تھا۔ یہی چنگاریاں بکھیرتا ہوا سراپا تھا جو لیوینیا کے ساحل پر یاسر سے گتھم گتھا ہو جاتا تھا۔ لیکن آج انگلیوں کی پوروں سے پوروں کا ٹکرانا بھی معنی خیز ہو گیا تھا۔

یہ بڑی ہی لذیذ خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں وہ کھانا کھاتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ''اِدھر اُدھر'' کی باتیں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ ان سے خاموشی مجروح نہیں ہوتی۔

کنول کے ہاتھ سے بنی گرم چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے یاسر نے سامنے دیوار کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک جہازی سائز کی خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔ یہ پینٹنگ بڑی تھی۔ اس میں سری لنکا کے کسی ساحل پر لہریں لیتا اور جھاگ اُڑاتا ہوا سمندر نظر آ رہا تھا۔ تصویر اتنی جاندار تھی کہ یاسر کو محسوس ہوا کہ وہ ذرا کان لگائے تو سمندر کا شور سن سکتا ہے۔ اور پھر اُسے محسوس ہوا کہ شمالاً جنوباً پھیلا ہوا سمندر واقعی اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہا ہے۔

...... میں گواہ ہوں گئے زمانوں کا ...... میں نے اپنے کناروں پر ان گنت کہانیاں پروان چڑھتے دیکھی ہیں ...... بے شمار لوگ میرے سامنے ملے ہیں اور بچھڑے ہیں ...... لاتعداد مسکراہٹیں اور آنسو میری ریت میں جذب ہیں۔ تم بھی میرے ہزاروں لاکھوں مہمانوں میں سے ایک ہو ...... پل بھر کے لئے میرے روبرو ٹھہرے ہو۔ تم

چلے جاؤ گے، اپنی دنیاؤں میں گم ہو جاؤ گے لیکن میری ریت پر تمہارے قدموں کے نشان رہ جائیں گے......

کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھ گئے۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے۔ ہوا میں پانی کا لمس تھا اور رجنی گندھا کے پھولوں کی مہک تھی۔ وہ جھیل کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہوئے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک لذت بھری خاموشی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ یکسر خاموش نہیں تھے۔ ہلکی ہلکی باتیں کر رہے تھے۔ لیکن ان سے ''اصل خاموشی'' مجروح نہیں ہوتی تھی۔ ''اصل خاموشی'' تو کچھ اور طرح کی باتوں سے مجروح ہوتی تھی۔ مثلاً یاسر اُس گفتگو کا ذکر کرتا جو کولمبو کی بس نمبر 100 میں چڑیا گھر کی طرف جاتے ہوئے ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اس گفتگو میں کنول نے کہا تھا۔

''......محبت کے جذبے کو اتنا ایکسپلائٹ کیا گیا ہے کہ اب وہ اپنے اصل معنی کھو چکا ہے۔ جسے دیکھو وہ محبت کر رہا ہے، بلکہ عشق کر رہا ہے۔ اور جو بھی ایسا کر رہا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کی محبت سب سے جدا اور منفرد ہے......''

پھر آگے چل کر اس نے کہا تھا۔

''......میرے نزدیک محبت کو صرف عورت اور مرد کی محبت تک محدود کر دینا سراسر زیادتی ہے۔ میں بھی ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں اپنی امی جان سے...... اپنے چاچو سلیمان سے...... اپنی دادی ماں سے......''

اور پھر بطخوں والے تالاب کے کنارے کیفے میں بیٹھے ہوئے کنول نے کہا تھا۔

''......کسی ایک شخص کے لئے ہر شے کی نفی کر دینا، سارے رشتے، ناطوں، جذبوں کو دفن کر دینا، زندگی سے منہ پھیر لینا، یہ محبت نہیں وحشت ہو گی، یا جنون ہو گا......''
اس کے لہجے میں واضح تلخی تھی۔

آج وہ ساری باتیں یاسر کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ محبت بھرے لہجے میں کنول سے پوچھے...... وہ سارے آدرش کیا ہوئے اختلاف کے وہ پتھر دیکھتے ہی دیکھتے کس ریلے میں بہہ گئے؟ اور وہ سچی ڈائری؟ کیا اب بھی سو فیصد سچی ہے؟

لیکن ایسی باتوں سے خاموشی مجروح ہوتی تھی...... وہ لذیذ و معنی خیز خاموشی جو

جھیل کے کنارے ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی وہ اس خاموشی کو مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی کنول کی جھکی جھکی پلکوں کے سامنے اپنی فتح کا جھنڈا گاڑنا چاہتا تھا۔ وہ خود کو فاتح سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔ اگر وہ فاتح تھا تو پھر اس کے ساتھ ساتھ مفتوح بھی تھا۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے جب ان دونوں نے ڈھلوان سڑک پر چڑھنا شروع کیا تو کنول نے بڑی آہستگی سے یاسر کے بازو کا سہارا لے لیا۔ اس کے ہاتھ کی دلنواز گرفت یاسر کے بالائی بازو پر قائم ہو گئی۔ یہ عجیب لمس تھا۔ اس سے پہلے بھی یاسر اور کنول نے ایک دوسرے کو متعدد بار چھوا تھا...... مگر تب کے چھونے اور اب کے چھونے میں فرق تھا۔ تب صرف یاسر کے بدن میں ہی برقی لہریں دوڑتی تھیں مگر آج شاید کنول کے اندر بھی ایسی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر سرخی تھی اور اس کی پلکوں کے نیچے ایک نشہ تھا۔

دل دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ہُو

گھر واپس پہنچ کر یاسر سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اپنے اندر کی ہلچل اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ اسے گانا نہیں آتا تھا ورنہ شاید وہ ساری رات گاتا رہتا۔ اسے ناچنا نہیں آتا تھا ورنہ وہ رات بھر ناچتا رہتا۔ وہ شاعر بھی نہیں تھا ورنہ آج وہ ایسے شعر لکھتا جو امر ہو جاتے۔ کسی کے خاموش اقرار نے اس کی دنیا بدل دی تھی۔

کپڑے بدلتے ہوئے بھی وہ گنگنا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ذرا بلند آواز میں گنگنائے لیکن نٹ کھٹ اور ہیما کا کمرا قریب ہی تھا۔ آواز ان تک پہنچ سکتی تھی...... وہ نہیں جانتا تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے لیکن جو کچھ آج تھا وہ اسے مسحور کرنے کے لئے کافی تھا۔ اور وہ ''آج'' کے اس سحر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ محبوب کی محبت کی لذت اور اس کی دوری کی اذیت یوں یک جا ہو گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ نرم بستر پر لیٹ گیا۔ ایک ابر آلود شام دھیرے دھیرے کھڑکیوں پر اتر رہی تھی۔ کپڑے تبدیل کرتے وقت یاسر نے اپنی جیبیں خالی کر کے

مختلف اشیاء سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھیں۔ اچانک یاسر کو انکشاف ہوا کہ ان اشیاء میں وہ فلم رول نہیں ہے جس کا کچھ حصہ اس نے کولمبو میں اور باقی بدھا کے مندر میں ایکسپوز کیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے کپڑوں اور کمرے کی تلاشی بھی لی لیکن فلم رول کہیں نہیں ملا۔ یقیناً وہ آج ہی کہیں گم ہوا تھا۔ شاید صبح کی شاپنگ کے دوران...... اُسے یاد آیا کہ جب وہ گھر سے چلا تو فلم رول اس نے پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ ارادہ تھا کہ وہ یہ تصویریں یہیں سے دھلوا لے گا۔ اسے اپنی لا پرواہی اور رول کی گمشدگی پر افسوس ہونے لگا۔ درحقیقت یہی وہ نقصان تھا جو صبح شاپنگ کے وقت ہوا تھا۔

رات کسی پہر اس کی آنکھ کھلی۔ اندھیرے میں وہ وال کلاک نہیں دیکھ سکتا تھا تاہم کلاک دیکھے بغیر ہی وہ بتا سکتا تھا کہ یہ پونے پانچ کے بعد کا وقت ہے۔ جھیل کے پار ''ٹتھ ٹمپل'' میں سوتر پڑھے جا رہے تھے۔ ہوا کے دوش پر ڈوبتی ابھرتی آوازیں تاریکی کا سینہ چیر کر اطراف میں پھیل رہی تھیں۔ اچانک یاسر کو احساس ہوا کہ آج ان آوازوں میں ایک اور آواز بھی شامل ہے۔ ایک روتی بلکتی ہوئی آواز ...... ایک لرزاں و ترساں صدا۔ وہ جلد ہی جان گیا کہ یہ آواز ٹمپل کی آوازوں سے جدا ہے اور کہیں پاس ہی سے آ رہی ہے۔ وہ ننگے پاؤں کمرے سے نکل آیا۔

کھڑکیوں سے باہر ابھی گہری تاریکی تھی۔ گھر کے مکین گہری نیند سو رہے تھے لیکن بچوں کے کمرے کے ساتھ ایک کمرے میں کوئی گریہ زاری کر رہا تھا۔ یاسر دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اس نے کمرے میں جھانکا، مدھم روشنی میں اسے کنول کی والدہ خالہ سعدیہ نظر آئیں۔ ایک مجسم ماں، ایک پُرنور چہرہ، ایک مہربان ہستی۔ وہ نڈھال سی تھیں اور جائے نماز کے پاس قالین پر کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ دلدوز ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھیں۔ یاسر کی آہٹ پا کر یا شاید ویسے ہی انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ یاسر کو دیکھ کر وہ ذرا سا چونکیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ تھا، غالباً کوئی تصویر تھی۔ انہوں نے تصویر جلدی سے دوپٹے کے نیچے کر لی۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''بیٹا! تم یہاں؟''

''ہاں خالہ جان...... مم...... میں پانی پینے کے لئے اٹھا تھا۔ آواز سن کر اس طرف

گیا۔''

انہوں نے یاسر سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اور شاید وہ چھپ بھی ہیں سکتے تھے۔ مسلسل ان کی بیمار آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ قریباً ایک منٹ اسی رح خاموشی میں بیت گیا۔ پھر یاسر بولا۔

''خالہ جان! میں آپ کے درد کو سمجھ رہا ہوں۔ کیا...... میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟''

''تم مدد کر تو رہے ہو بیٹا! کنول کے ساتھ مل کر خاور کو ڈھونڈ رہے ہو۔''

یاسر کا سر جھکنے لگا۔ وہ کہاں ڈھونڈ رہا تھا خاور کو۔ اور کنول بھی کہاں ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ دونوں تو خود میں گم ہو رہے تھے۔ لاپتہ ہو رہے تھے۔

خالہ سعدیہ نے یاسر کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ اس کا سر چومتے ہوئے بولیں۔

''پتہ نہیں کیوں تُو مجھے اپنے بیٹے کی طرح لگتا ہے۔ اگر میرا بیٹا ہوتا تو شاید تیرے ہی جیسا ہوتا۔'' انہوں نے ایک بار پھر یاسر کا ماتھا چوما۔

وہ ان سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا، ان کا دکھ بانٹتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں یاسر کو ایسا لگنے لگا کہ وہ اس ''مجسم ماں'' کو مدتوں سے جانتا ہے۔ یہ وہی لمس ہے، یہ وہی آواز اور ہنسی ہے جو دست اجل نے برسوں پہلے اس سے چھین لی تھی۔

خالہ سعدیہ نے کہا۔ ''یاسر! پتہ نہیں کبھی کبھی کیوں مجھے لگتا ہے کہ سب مجھے جھوٹی تسلیاں دیتے ہیں۔ خبر نہیں کہ وہ اسے ٹھیک سے تلاش بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ کاش میں عورت نہ ہوتی۔ بوڑھی اور بیمار نہ ہوتی۔ میں خود اُس (خاور) کی تلاش میں نکلتی۔ دنیا کا چپہ چپہ دیکھ لیتی۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ انہوں نے چند لمحے توقف کیا پھر رتے ہوئے بولیں۔

''میں اپنی ثوبی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ تو مجھے یہاں بھی چین نہیں لینے دیتی۔ جب مر کر اس کے پاس پہنچ جاؤں گی تو وہ میرا کیا حشر کرے گی۔ وہ میرا گریبان پکڑ لے گی۔ مجھ سے کہے گی ...... آپا سارے جیون میں تجھ سے اور کیا مانگا تھا۔ بس اپنے

اکیلے بیٹے کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیا تھا اور کہا تھا، آپا میرے بعد اسے سنبھال کر رکھنا۔ آپا! تُو اتنا بھی نہ کر سکی۔ تُو میری کیسی آپا ہے......؟''

وہ ہچکیوں سے رونے لگیں۔ ان کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ یاسر نے بڑی اپنائیت سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''خالہ! آپ بالکل وہم نہ کریں...... کنول، چاچو سلیمان، بھائی جان کمار، ہم سب خاور صاحب کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آپ دعا کریں، انشاء اللہ جلد یا دیر سے اچھی خبر ضرور آئے گی۔''

مجسم ماں نے اپنی تر بتر سرخ آنکھیں اٹھا کر یاسر کی طرف دیکھا۔ ایک عجیب سی آس اُبھر آئی ان آنکھوں میں...... وہ پیاری سی معصومیت کے ساتھ بولیں۔

''اچھی خبر آئے گی نا؟''

''ہاں خالہ جان...... ضرور آئے گی۔''



اگلی صبح بہت نکھری ہوئی اور چمک دار تھی۔ بادل بن برسے ہی کھل گئے تھے۔

کنول آج پھر اُسے کینڈی میں گھمانا پھرانا چاہتی تھی مگر یاسر ''سر درد'' کا بہانہ کر کے کمرے میں پڑا رہا۔ رات پچھلے پہر خالہ سعدیہ سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ مسلسل اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ بے چاری سمجھتی تھیں کہ یاسر یہاں خاور کی تلاش میں بڑا اہلِ خانہ کی مدد کر رہا ہے مگر یاسر کی کیفیت یہ تھی کہ وہ یہاں کینڈی میں گھومتے پھرتے ہر وقت ڈرا ہوا سا رہتا تھا...... ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں اس کی نظر خاور پر نہ پڑ جائے۔ کتنی منافقت تھی، کتنا جھوٹ تھا...... وہ اپنے آپ میں شرمندہ ہونے لگا۔

بہرحال یہ کیفیت تا دیر برقرار نہیں رہی۔ دو چار گھنٹے بعد وہ ایک دوسرے رخ سے سوچنے لگا...... آخر خالہ سعدیہ نے خاور ہی کو ڈھونڈنے کی ضد کیوں پکڑی ہوئی تھی۔ وہ جانتی بھی تھیں کہ ان کا بھانجا ایک سیلانی ہے...... اس کی بادہ پیمائی آوارہ گردی کے زمرے میں آتی ہے۔ وہ اپنی پیاری بہن سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لئے کنول کی زندگی کو خطرات میں کیوں دھکیل رہی تھیں؟

شام تک یاسر پژمردگی کی کیفیت سے کافی حد تک باہر نکل آیا۔ پھر بھی مجسم ماں کا ایک سوال اُس کے کانوں میں مسلسل گونجتا رہا۔

''......اچھی خبر آئے گی نا......؟''

شام تک کنول نے یاسر کے کمرے کے متعدد چکر لگائے۔ اس نے یاسر کو صاف صاف بتا دیا کہ وہ اسے یہاں یوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھنے نہیں دے گی۔ اس نے کہا کہ یہ کینڈی شہر کی توہین ہے۔ اس کا لب و لہجہ وہی تھا جو کیپٹن زٹیبل ریسٹورنٹ میں ہونے والی گفتگو سے پہلے تھا۔ لیکن ایک فرق آیا تھا۔ جب کبھی دونوں کی نگاہ ملتی تھی، کنول کی آنکھوں میں حجاب کی لہر سی دوڑ جاتی تھی۔

رات گئے تک کنول نے یاسر کو آمادہ کر لیا کہ وہ کل صبح سگیریا جائیں گے۔ یہاں ایک عجیب وضع کی چٹان نما پہاڑی تھی۔ اس سرسبز پہاڑی پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ پہاڑی کے اوپر ریستوران، سوئمنگ پول اور تفریح کے دیگر لوازمات تھے۔ کنول نے یاسر پر انکشاف کیا کہ سری لنکن گورنمنٹ اس حیران کن چٹان نما پہاڑی کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ کلیم کر رہی ہے۔

صبح سویرے کنول پہلے تو آوازیں دے کر یاسر کو جگاتی رہی پھر اس نے شوخی کا مظاہرہ کیا۔ یاسر کے بائیں کان میں ''ٹررررر'' کی تیز آواز گونجی۔ یہ آواز یقیناً کنول کے خوبصورت ہونٹوں سے ہی نکلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ذہن ابھی تک ماؤف تھا۔ کنول ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی۔ یاسر کو یاد آیا کہ کنول پہلے بھی اس کی سماعت کے ساتھ اس نوعیت کی چھیڑ خانی کرتی رہی ہے۔ اس کے دل میں آئی کہ اس ہنستی سرخ ہوتی لڑکی کو بازوؤں میں دبوچ کر بستر پر گر جائے، اسے خوب بھینچے، چومے اور درہم برہم کر دے۔ لیکن ایسی خواہشیں اور ایسی بے باک آوازیں اس کے سینے میں ہی گھٹ جایا کرتی تھیں۔

''پندرہ منٹ میں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ جاؤ'' کنول نے نادر شاہی حکم جاری کیا۔ ''ورنہ نان اسٹاپ بس ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

قریباً پچیس منٹ بعد یاسر ناشتے کی میز پر تھا۔ کیمرا اور چھتری وغیرہ اس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔ کیمرے کو دیکھتے ہی اسے پھر اپنا گم شدہ فلم رول یاد آ گیا۔ ناشتے کے دوران میں ہی کنول نے یاسر کو بتا دیا تھا کہ ایک ٹک ٹک (رکشا) گیٹ سے باہر ان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ ٹک ٹک پر بس اسٹینڈ تک جائیں گے۔

ناشتے کے دوران میں ہی بنگلور سے کنول کی دادی ماں کا فون آ گیا۔ وہ چائے کے ساتھ ڈبل روٹی نگلتی ہوئی فون سننے چلی گئی۔ یاسر نے کارکردگی شو کرنے کے لئے سفر کا مختصر سامان اٹھایا اور رکشے کی طرف بڑھا۔ کوریڈور سے نکل کر وہ مین دروازے پر آیا۔ شومئی قسمت لحیم شحیم شاڈی عین دروازے کے بیچ میں سو رہی تھی۔ اس کا سفید اسسٹنٹ بھی پاس ہی تھا اور آنکھیں بند کئے دھوپ کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دروازے کے ساتھ چند انچ جگہ خالی تھی۔ یاسر نے خیال کیا کہ وہ شاڈی اور اس کے اسسٹنٹ کو

کئے بغیر آہستہ سے باہر نکل جائے گا۔ جب وہ بلی کی چال چلتا شاڈی کے
ے گزرنے لگا، اچانک پاؤں دروازے سے ٹکرایا۔ دروازہ ٹھک سے ہلا۔ بلند
ن کر شاڈی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنے سینے کی گہرائی سے ایک دہلا
والی ناراض آواز بلند کی۔ اسسٹنٹ حق نمک ادا کرتے ہوئے اچھل کر کھڑا ہو
ر چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ چھتری، کیمرا، ٹفن، ٹوکری سبھی کچھ یاسر کے
ے چھوٹ گیا۔ وہ شاڈی کی پیش قدمی کے سامنے الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا
شاڈی اسے سونگھتی آگے بڑھتی چلی گئی۔ چند لمحے بعد تو یاسر کو یوں محسوس ہوا
ہ اسے واپس پاکستان پہنچا کر چھوڑے گی۔ تاہم اس دوران میں نٹ کھٹ اور
بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ انہوں نے افسر اور اسسٹنٹ دونوں کو سنبھالا۔ دیدی،
ر ہیما نے گری ہوئی اشیاء جمع کیں اور یوں یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ دروازے پر
ے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر نے پُرسکون خوابیدہ ماحول کو چند لمحوں کے لئے تہلکہ خیز
تھا۔

ر شاڈی کو قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہوا ٹک ٹک میں آ بیٹھا۔ کنول بھی مسکراہٹ
وئی اندر آ گئی۔

لگتا ہے کہ یہ تم سے ناراض ہے۔ تم نے اسے مؤنث سے مذکر بنا دیا تھا نا؟''

مذکر مؤنث کی وجہ سے اتنے زیادہ نمبر نہیں کٹتے۔ یقیناً یہ کوئی پرانا بدلہ لے رہی
یاسر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

ٹک ٹک اسٹارٹ ہوا۔ یاسر نے بے ساختہ ڈرائیور کی شکل دیکھی۔ جب سے کولمبو
نک ہارس سے واسطہ پڑا تھا وہ سوار ہوتے وقت ٹک ٹک کے ڈرائیور کی صورت
لاحظہ کر لیتا تھا۔ ڈرائیور کی صورت دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ گھر کی بالائی منزل
ک چلی گئی۔ ایک ادھ کھلی کھڑکی میں سے کنول کے چاچو سلیمان ان دونوں کو
ہے تھے ...... فاصلہ زیادہ تھا۔ پھر بھی یاسر کو اندازہ ہوا کہ ان کے چہرے پر
دگی کے تاثرات ہیں۔ گہری ناپسندیدگی جو ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی ایک
ے دوسرے شخص تک پہنچتی ہے۔ چاچو سلیمان کا رویہ سمجھ میں آنے والی بات
یہ پڑھا کو لوگوں کا قدرے خشک مزاج خاندان تھا۔ یہاں محبت کی شادی نہیں کی

جاتی تھی صرف ''شادی'' کی جاتی تھی اور وہ بھی شاید نظریۂ ضرورت کے تحت۔ اگر خاندان کی ایک لڑکی اچانک ہی اپنی ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ بزرگوں کا ماتھا ٹھنکنا لازمی تھا۔

ٹک ٹک ڈھلوان پر سفر کرتا ہوا ''سٹی سینٹر'' کی طرف بڑھنے لگا۔ کنول کے بال آج پھر دیوانہ وار رقص کر رہے تھے اور یاسر کے چہرے سے چھیڑ خانی کرنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن اب اس سلسلے میں کنول محتاط تھی جیسے شریر بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر رکھا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے بالوں کو لپیٹ سمیٹ کر رکھ رہی تھی۔ ٹک ٹک میں سفر کرتے کرتے اچانک یاسر کے ذہن میں ایک بات آئی۔ عین ممکن تھا کہ اس کا فلم رول کسی ٹک ٹک میں ہی گر گیا ہو۔ کل بھی کینڈی میں گھومنے پھرنے کے دوران میں انہوں نے دو تین بار ٹک ٹک میں سفر کیا تھا۔ ایک بار وہ سٹی سینٹر سے کنگ ڈم گیٹ ہوٹل بھی گئے تھے۔ یہ چڑھائی کا سفر تھا۔ چڑھائی کے سفر میں اس بات کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ پتلون کی جیب میں سے کوئی چیز پھسل جائے۔ خاص طور سے ٹک ٹک یعنی رکشا میں بیٹھنے والے کی ٹانگوں کا زاویہ اس طرح کا ہوتا ہے کہ پتلون کی جیب میں سے کوئی چیز گر سکتی ہے۔

سٹی سینٹر میں اترنے کے بعد یاسر نے ٹک ٹک والے کو بتایا کہ کل ٹک ٹک میں سفر کرتے ہوئے اس کا ایک فلم رول گر گیا ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ سٹی سینٹر سے ''کنگ ڈم گیٹ'' ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے گرا ہے۔ وہ کسی کے کام کا تو ہے نہیں۔ اگر مل جائے تو ہمارے لئے بڑی خوشی کی بات ہے۔

ٹک ٹک والے نے یاسر کے مسئلے میں پوری دلچسپی لی۔ کہنے لگا۔

''سر! صبح کے وقت اس روٹ پر چلنے والے تمام ٹک ٹک یہاں جمع ہوتے ہیں۔ میں آپ کے فلم رول کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''بہت شکریہ......'' یاسر نے کہا۔ ''رول مل گیا تو ہم ٹک ٹک والے کی تھوڑی بہت ''خدمت'' بھی کریں گے۔''

وہ خوش دلی سے اثبات میں سر ہلاتا رہا اور ان دونوں کو اپنے تعاون کا یقین دلاتا رہا۔

وہ بس اسٹینڈ پر پہنچے۔ تھوڑی سی تاخیر ہوگئی تھی اس لئے وہ کافی عجلت میں تھے۔ رہ اسٹینڈ پر پہنچتے پہنچتے انہیں دو تین منٹ گزر گئے۔ معلوم ہوا کہ SIGIRIA نے والی ایکسپریس بس ابھی دو منٹ پہلے نکل گئی ہے۔ اب انہیں عام پسنجر بس میں رکرنا تھا۔

کنول بولی۔ ''سارا کام اس وجہ سے خراب ہوا کہ تم نے ٹک ٹک والے کو اپنے فلم ل کا قصہ سنانا شروع کر دیا۔''

''میرا خیال تم سے مختلف ہے۔ اگر بنگلور سے تمہاری دادی صاحبہ کی محبت جوش نہ تی اور وہ تمہیں فون نہ کرتیں تو ہم ٹائم پر پہنچ گئے ہوتے۔''

''خبردار اگر میری کیوٹ سی دادی ماں کے بارے میں کچھ کہا تو۔''

''وہ جلد سے جلد تمہاری شادی کرا دینا چاہتی ہیں۔ شاید اسی لئے تمہیں ''کیوٹ'' تی ہیں۔''

''اگر تمہارا خیال ہے کہ میں کسی ایسی بات پر شرماؤں گی تو یہ خیال غلط ہے...... غلط ہی رہے گا۔''

''مستقبل کے بارے میں تم اتنے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ کچھ باتیں ایسی تی ہیں جن پر شرمانا ہی پڑتا ہے۔''

''اوہو...... گویا آپ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔''

''کچھ دن سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔'' یاسر نے کہا۔

ایک دم جیسے کنول کو کچھ یاد آیا۔ اس نے باسکٹ ٹٹولی۔ یہاں فروٹ اور لنچ کا ان رکھا گیا تھا۔

''اوہو...... ٹماٹو کیچپ تو ہے ہی نہیں۔ ٹھہرو میں ابھی لے کر آتی ہوں۔'' اس نے کہا یاسر کے روکتے روکتے بسوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ بس اسٹینڈ واحد جگہ تھی جہاں کر یاسر کو کچھ راحت محسوس ہوئی تھی۔ سب کچھ اپنا اپنا لگا تھا۔ پردیس میں دیس کی آ گئی تھی۔ وہی عمر رسیدہ بسیں، دھواں دیتے سائلنسر، شور مچاتے کنڈیکٹر، ایک یانی عمر کا سنہالی یاسر کے قریب آیا۔ وہ مقامی لباس یعنی پتلون قمیص میں تھا۔ بال ما میں چپڑ رکھے تھے۔

''سر ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس جائیے۔ بہت اچھا گیسٹ ہاؤس ہے۔ گھر کا سا ماحول ہے۔''

''نہیں شکریہ...... میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''سر مساج کروائیے گا؟ ایک دم فریش ہو جائیں گے۔ ادھر بازار میں اوپر کی منزل پر ہمارا مساج ہاؤس ہے۔ صاف ستھری مساج لڑکیاں ہیں، مقامی بھی اور غیر ملکی بھی۔''

''غیر ملکی کون سی؟'' یاسر نے معلومات کی غرض سے کہا۔

''روسی، فلپائنی، کورین جو آپ پسند کریں۔ پورے دو گھنٹے تک مزے کیجئے۔ لطف اٹھائیے۔''

سنہالی کا لہجہ معنی خیز تھا اور یاسر کو سمجھ رہا تھا کہ وہ صرف مساج کی بات نہیں کر رہا ہے۔

اس نے ''لطف اٹھانے'' کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ ان الفاظ نے یاسر کو ایک دم راکیل کی یاد دلا دی۔ اس نے ہوٹل نیپون کے کمرے میں یاسر کو ایک ایسا گانا سنایا تھا جس میں لطف اٹھالو کے الفاظ قوالی کی صورت میں بار بار استعمال کئے گئے تھے۔

وقت گزر ہی جانا ہے ایسے بھی اور ایسے بھی...... لطف اٹھالو...... لطف اٹھالو۔

سنہالی یاسر کو قائل کرنے کے لئے شاید کوئی اور خوبصورت دلیل سوچ رہا تھا جب کنول ٹماٹو لے کر وہاں آ پہنچی۔ کنول کو دیکھ کر سنہالی کے سانولے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے ''کنویسنگ'' کے لئے ایک غلط شخص کا انتخاب کیا ہے اور اس کے پچھلے تین چار منٹ بالکل ضائع ہو گئے ہیں۔ وہ منہ پھیر کر دوسری طرف چلا گیا۔

''کیا باتیں ہو رہی تھیں؟'' کنول نے شک آمیز لہجے میں پوچھا۔

''بس کچھ مردانہ قسم کی باتیں تھیں۔ میں اس سے مساج ہومز وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ بڑا تجسس سا ہے اس کے بارے میں۔''

''تجسس مساج کے بارے میں ہے یا مساج کرنے والیوں کے بارے میں؟'' وہ شرارت سے بولی۔ ''اگر صرف مساج کے بارے میں ہے تو میں ابھی تمہیں لے جاتی

...وہاں بر مردوں کا مساج صرف مرد کرتے ہیں۔''

''یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ایک نہایت مزیدار کھانا بغیر نمک کے کھا لیا جائے...... خیر ...دان بیکار باتوں کو کہیں یہ پسنجر بھی نہ نکل جائے۔''

کچھ ہی دیر بعد وہ بس میں تھے۔ سگیریا (Sigiria) کینڈی کے مضافات میں ...کافی فاصلہ ہے لیکن کرایہ فقط 35 سری لنکن روپے تھا۔ بس کینڈی سے روانہ ہوئی ...چاروں طرف ہریالی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ اس ہریالی میں آبی گزرگاہیں تھیں۔ ...ں کی چمک تھی اور پھولوں کے تختے تھے۔ قدرت اپنے حسین ترین سبز لباس میں ...کے سامنے تھی۔

یاسر اکیلا ہوتا تو شاید اس کی آنکھیں بس کی کھڑکی سے چپک کر رہ جاتیں۔ مگر ...حسن بس کے اندر بھی تھا اور یہ اس کے ساتھ ہی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ...مہک تھی، ایک گداز تھا جو گاہے گاہے یاسر کے بدن سے چھو جاتا تھا۔ کبھی گھٹنے ...گھٹنا، کبھی کندھے سے کندھا اور کبھی دھکم پیل کے سبب یوں لگتا تھا کہ پوری کی ...کنول اس کے پہلو سے پیوست ہو گئی ہے۔ یہ پسنجر بس بار بار اپنے اسٹاپس پر ...رہی تھی۔ رش بھی کافی تھا۔ مگر وہ دونوں اس سے بھی لطف اٹھا رہے تھے۔ انہیں ...کلچر اور مضافاتی لوگوں کو مزید قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

کل رات کنول کی والدہ سے یاسر کی جو گفتگو ہوئی تھی وہ ابھی تک یاسر کے ذہن ...موجود تھی۔ کسی وقت یہ گفتگو کسی نوکیلی شے کی طرح یاسر کے ذہن میں چبھتی تھی۔ ...م وہ اس چبھن کو پس منظر میں دھکیلنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اس گفتگو کے بارے ...یاسر نے کنول کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خوامخواہ کنول کا ذہن منتشر ...

وہ جب بھی کنول کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا ایک انجانا خوف اس کے ساتھ سفر کرتا ...وہ کہیں بھی گیا یہ خوف اس کے ساتھ رہا۔ گال فیس روڈ، کرس کیٹ، لیوینیا کا ...ل، بدھا کا مندر غرض ہر جگہ یہ خوف موجود رہا...... یہ خوف...... خاور کے ملنے ...نے کا خوف تھا۔ اس نے متعدد بار سوچا تھا اگر کہیں راہ چلتے چلتے اچانک خاور مل گیا ...یا ہوگا۔ وہ اپنے خاص اسٹائل کے لمبے گھونگھریالے بالوں کی وجہ سے با آسانی

پہچانا جا سکتا تھا۔ اگر یاسر اسے پہچانتا تو کیا کرتا۔ کیا وہ حیرت سے چیخ کر کنول کو بتاتا؟ کیا وہ خاموش رہتا؟ کیا وہ کنول کو کسی اور طرف متوجہ کر دیتا؟ ایسے ان گنت سوال یاسر کے ذہن میں موجود رہے تھے اور اب بھی تھے۔ وہ جانتا تھا کہ خاور کے حوالے سے چاچو سلیمان سمیت پورے خاندان کی رائے ایک ہے۔ وہ خاور کو ڈھونڈنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کنول سے اس کی شادی ہو جائے۔ اگر کنول اور خاور کی شادی کے درمیان کوئی رکاوٹ حائل تھی تو وہ خاور کا نہ ملنا تھا۔ کہا جا سکتا تھا کہ اب ایک اور رکاوٹ بھی ان دونوں کی شادی کے درمیان حائل ہو گئی ہے اور وہ کنول کے سینے میں پھوٹنے والا جذبہ ہے۔ مگر جذبے کی یہ کونپل سخت حالات کا مقابلہ کس حد تک کر سکتی ہے اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

خاور کا ملنا یا نہ ملنا ایک ''سوال'' تھا اور یہ ''سوال'' ہمہ وقت یاسر کے ساتھ رہتا تھا۔

''ذرا اپنا واک مین تو دینا۔'' کنول کی آواز نے یاسر کو چونکایا۔

''واک مین؟...... تمہیں تو یہ پسند ہی نہیں ہے۔''

''موڈ موڈ کی بات ہوتی ہے......'' وہ بولی۔

یاسر نے واک مین اسے تھما دیا۔ اس نے ہیڈ فون چڑھا لیا۔

''کیا سنو گی؟ غزلیں یا پھر فلمی گیت؟''

''کچھ بھی لگا دو...... بلکہ گیت ہی لگا دو۔ تم ہی تو کہتے ہو کہ فلمی شاعری میں بھی کبھی کبھی شاعری ہوتی ہے۔''

یاسر نے ایک کیسٹ لگا دی۔ وہ سننے لگی۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب اس نے کہا تھا...... میں میوزک سنتی ہی کم ہوں، دراصل ہر گانے میں وہی گھسے پٹے بول ہوتے ہیں اور وہی پرانا موضوع ہوتا ہے...... یعنی محبت۔'' آج وہ گھسے پٹے بول سن رہی تھی اور شاید وہ اسے اتنے برے بھی نہیں لگ رہے تھے۔ یاسر نے ضروری نہیں سمجھا کہ اسے یہ بات یاد دلائی جائے۔ وہ اندر کی خوبصورتی کو اس کے حال پر چھوڑ کر باہر کی خوبصورتی اور ہریالی پر نظر دوڑانے لگا۔

ابھی راستے میں بس اسٹینڈ کی طرف آتے ہوئے بھی وہ دونوں خاور ہی کی باتیں

کر رہے تھے۔ یاسر نے کنول کو کریدنا چاہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ خاور کے لئے کنول کی پسندیدگی کس حد تک جاتی ہے اور ماضی میں ان کے باہمی تعلقات کس نوعیت کے رہے ہیں۔ کنول نے کھلے دل سے خاور کی باتیں کی تھیں۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں بس دو کزنوں کی طرح ہی تھے۔ ایسے کزن جن کے بارے میں خاندان کے بزرگ مسلسل یہ کہہ رہے تھے کہ ان کی شادی ہونی ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر تھوڑا سا جھجک جانا، گفتگو میں ذرا محتاط ہو جانا، تنہائی میں ملنے سے کترانا...... اور بس۔ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید یاسر کے ذہن میں شک کی گنجائش رہتی لیکن کنول کا تو مزاج ہی اور طرح کا تھا۔ وہ جیسے شیشے کی بنی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔ کچھ بھی چھپاتی نہیں تھی وہ۔

واک مین سنتے سنتے اس نے یاسر کو متوجہ کیا اور بولی۔ ''یہ گیت سنو۔''

اس نے ٹیپ کو ریوائینڈ کر کے ہیڈ فون یاسر کے کانوں سے لگا دیا۔ یہ ایک گیت کا انترا تھا۔

کہیں تو یہ دل کبھی مل نہیں پاتے
کہیں سے نکل آئیں جنموں کے ناطے

یاسر کی یادداشت کے مطابق اس کلاسیکل گیت کا مکھڑا کچھ اس طرح تھا...... میں نے تیرے لئے ہی سات رنگ کے سپنے چنے...... سپنے رنگیلے سپنے...... بہر حال کنول کے لئے گیت کے اندرونی بول یعنی اس کا انترا ہی اہم تھا...... کہیں تو یہ دل کبھی مل نہیں پاتے...... کہیں سے نکل آئیں جنموں کے ناطے......

''کیسا ہے؟'' اس نے ستائش طلب نظروں سے پوچھا۔

''یادگار فلمی گیتوں میں سے ہے...... ایسے بہت سے گیت ہیں جنہیں ہمارے ہاں کے باذوق لوگ صرف اس لئے قابل اعتنا نہیں جانتے کہ وہ فلم میں استعمال ہوئے ہیں۔''

کنول نے یاسر کے آخری الفاظ سنے ہی نہیں۔ اس نے ہیڈ فون پھر کانوں پر چڑھا لیا تھا...... وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھی۔ کیسٹ کو بار بار ری وائنڈ کرنے لگی اور وہی بول سننے لگی...... کہیں تو یہ دل کبھی مل نہیں پاتے...... بول سنتے ہوئے وہ کسی

وقت کن اکھیوں سے یاسر کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ اس کے انداز میں محبوبیت تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے بس اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے وہ خاور کی باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت بھی کنول نے اس سے ملتی جلتی ایک بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا......

بے شک وہ بچپن سے خاور کے ساتھ رہی ہے مگر ساتھ ساتھ رہنا اور بات ہوتا ہے

......مزاجوں کا ملنا اور بات ہوتا ہے......

اور اب وہ بڑی محویت سے سن رہی تھی...... کہیں تو یہ دل کبھی مل نہیں پاتے ......

کہیں سے نکل آئیں جنموں کے ناطے......

یاسر کو محسوس ہوا جیسے وہ ان بولوں کے ذریعے خاور کے حوالے سے اس کے سوالوں کا جواب دے رہی ہے۔

سفر اچھا کٹ رہا تھا مگر پھر یاسر کی طبیعت میں بھاری پن آ گیا۔ شاید یہ سواریوں کے اژدھام اور بس کے دھوئیں وغیرہ کا اثر تھا۔ اس کا جی متلانے لگا۔ کنول بہت زود فہم تھی۔ اس نے سیون اپ کا ایک ٹن کھول کر یاسر کو دیا اور شاپر میں موجود سارا فروٹ ٹوکری میں الٹ دیا۔

''یہ فروٹ کیوں الٹا ہے؟'' یاسر نے پوچھا۔

''تمہیں شاپر کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تمہارا جی متلا رہا ہے۔'' وہ سمجھداری سے بولی۔ یاسر قائل ہو گیا۔

بہرحال خالی شاپر کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک گھنٹے کی کوفت کے بعد طبیعت دھیرے دھیرے سنبھلنا شروع ہوئی اور پھر بالکل سنبھل گئی۔ قریباً ساڑھے تین گھنٹے کا سفر اختتام کے قریب تھا۔ وہ کینڈی کے لش گرین مضافات سے گزر کر سگیریا کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ جب وہ کھٹارہ بس سے اتر کر تفریح گاہ کی طرف روانہ ہوئے تو یاسر کی طبیعت بالکل ہشاش بشاش تھی۔ انہیں کئی ٹورسٹ بسیں نظر آئیں۔ بہت سے ملکی اور غیر ملکی سیاح ٹولیوں کی صورت میں پیدل بھی رواں دواں تھے۔ اسکول کالج کے طلباء کثرت سے نظر آ رہے تھے۔ جلد ہی انہیں عجیب وضع کی وہ عظیم الشان چٹان نظر آ گئی جس کی دید کے لئے لوگ پروانہ وار یہاں کھنچے چلے آ رہے تھے۔ اس سرسبز چٹان کی ساخت مکعب کی سی تھی اور یہ سینکڑوں فٹ بلند تھی۔ اس پر چڑھنے کے لئے

ینے بنائے گئے تھے۔ زینوں کے ساتھ حفاظتی جنگلے بھی تھے۔ چٹان کے دامن تک پہنچنے کے لئے ایک پُل پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ پُل ایک شاندار آبی گزرگاہ کے اوپر ائم کیا گیا تھا۔ آبی گزرگاہ کے ساتھ اردگرد کے درختوں میں جنگلی حیات کے آثار ام دکھائی دیتے تھے۔ درختوں پر بندر اچھل کود کر رہے تھے۔ یاسر اور کنول نے بندروں کے ساتھ چند تصویریں بنوائیں۔ سری لنکا کی دیگر تفریح گاہوں کی طرح یگیریا کی شرح ٹکٹ میں بھی زبردست ناانصافی روا رکھی گئی تھی۔ مقامی سیاحوں کے لئے ٹکٹ کی قیمت 24 روپے جبکہ ''قسمت کے مارے'' غیر ملکیوں کے لئے 1440 روپے تھی۔

اس ناانصافی کا کنول نے بھی شدید نوٹس لیا۔ کہنے لگی۔

''میں واپس جا کر اپنے میگزین میں اس حوالے سے ضرور لکھوں گی۔ یہ گھوڑے گدھے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے ہیں۔ ٹھیک ہے جو ڈالر اور پونڈ لے کر یہاں آتے ہیں وہ 1440 کی بجائے 14040 بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم اس خطے کے لوگ تو ''روپیہ'' لے کر ہی یہاں آتے ہیں اور اس خیال میں ہوتے ہیں کہ ہم سارک کے ممبر ہیں اور ہمارے ساتھ اپنوں والا سلوک کیا جائے گا۔''

وہ دیر تک صحافیانہ انداز میں بڑبڑاتی رہی اور اس کے گال سنہری دھوپ میں تمتماتے رہے۔ زینوں کے ذریعے طویل فاصلہ طے کر کے وہ اس عظیم الشان پہاڑی نما چٹان کے اوپر پہنچ گئی اردگرد کے مناظر واقعی قابل دید تھے۔ اُفق تا اُفق ہریالی کا ایک سمندر نظر آتا تھا۔ اس سمندر میں آبی گزرگاہیں پہاڑی دوشیزاؤں کی مسکراہٹ کی طرح چمکتی تھیں اور راستے نازک کمر کی طرح بل کھاتے تھے۔ کہیں کہیں بستیوں کے آثار تھے۔ جھیلوں سے نکلتا ہوا دھواں زندگی کا پتہ دیتا تھا۔ یہ ایک مسحور کن نظارہ تھا۔ ایک مقامی شخص نے بتایا کہ یہاں ہر وقت تیز ہوا چلتی رہتی ہے اور بارش بھی بہت ہوتی ہے۔

چوٹی پر سفید فام سیاحوں کا ہجوم تھا۔ چڑھائی کی مشقت کے سبب حسیناؤں کے گال تمتما رہے تھے۔ انہوں نے سارے فالتو کپڑے اتار پھینکے تھے۔ حالانکہ وہ اتنے ''فالتو'' بھی نہیں تھے۔ سوئمنگ پول میں بھی جل پریاں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ پریاں

اور پرے رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے برائے نام لباس میں پڑے اینٹھ رہے تھے۔

کچھ دیر تک سستانے کے بعد انہوں نے کولڈ ڈرنک پیا پھر آہستہ آہستہ ایک خوبصورت روش پر ٹہلنے لگے۔ اچانک کنول کو کچھ یاد آیا۔ اس نے تھوڑی دیر تک اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ گھمایا پھر ایک کاغذ نکال کر یاسر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کے چہرے پر ایک شفق رنگ مسکراہٹ تھی۔ یہ ایک پھٹا ہوا کاغذ تھا۔ یاسر چونک گیا......

یہ وہی کاغذ تھا جو نیپون ہوٹل کے کمرے میں یاسر اور کنول کی چھینا جھپٹی کے دوران میں پھٹ گیا تھا۔ ایک ٹکڑا کنول کے پاس چلا گیا تھا، ایک یاسر کے پاس رہ گیا تھا۔ کنول نے وہ ٹکڑا ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

کنول والے ٹکڑے پر لکھا تھا...... نیپون ہوٹل کے کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوں...... آنکھوں کی طرح پانی سے لدی ہوئی ہے۔

کنول کے ہاتھ میں دراصل یہ دو سطور ہی آئی تھیں اور دونوں ادھوری تھیں...... وہ لجاجت سے بولی۔

''یہ سطریں مکمل کر دو نا۔''

یاسر نے ایک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سگیریا کی تیز ہوا اس کے اجلے چہرے کو اس کے بالوں میں ہی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جیسے دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ روشنی بادلوں میں چھپ کر کیسی لگتی ہے۔ ان لمحوں میں یاسر کو اس پر بے تحاشا پیار آیا۔ وہ کہنے لگی۔

''وہ دوسرا کاغذ کیا واقعی بارش میں بھیگ گیا تھا؟''

''نہیں......'' یاسر انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

کنول کی آنکھیں خوشی آمیز حیرت سے وا ہو گئیں۔

یاسر نے پتلون کی عقبی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پرس نکالا اور پھر ایک خانے میں سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال لیا۔ یہ کنول کے پاس رہ جانے والے کاغذ کا دوسرا بڑا ٹکڑا تھا۔ یاسر نے دونوں ٹکڑے جوڑ دیئے۔ وہ وہیں آلتی پالتی مار کر گھاس پر بیٹھ گئی کاغذ کو اپنے دائیں زانو پر رکھا اور بڑے اشتیاق سے پڑھنے لگی۔ پہلے تو تین چار شعر لکھے تھے جن میں سے ایک یہ تھا۔

ہم جس کو ترا پیار سمجھ بیٹھے اے شوخ
وہ ناز و انداز تری عادت ہی نہ ہو

اس کے بعد یاسر نے لکھا تھا...... بچھڑنے سے ایک رات پہلے...... نیپون ہوٹل کے کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہوں...... گہرے سیاہ بادلوں میں بجلی چمک رہی ہے۔ ساحل کی ہوا میری آنکھوں کی طرح پانی سے لدی ہوئی ہے......

پڑھ کر کنول کے چہرے کا رنگ سرخ تر ہو گیا...... وہ بولی۔

''اس لڑکی کے لئے لکھا ہے نا جو ملنے سے پہلے ہی بچھڑ گئی تھی......؟''

''ہوں......'' یاسر نے جذباتی انداز میں کہا۔

''اس کے بچھڑتے وقت اُداس ہو گئے تھے؟'' کنول کی آواز جذبات کے بوجھ سے بھاری تھی۔

''ہوں......'' یاسر نے پھر اسی انداز میں جواب دیا۔

''کیوں اُداس ہو گئے تھے؟'' وہ ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''وہ لڑکی اداس نہیں ہوئی تھی؟'' یاسر نے الٹا سوال کیا۔

کنول کے چہرے پر شفق کے رنگ تھے۔ اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''مجھے کیا پتہ......؟''

''پہیلیاں مت بوجھواؤ۔ مجھے بتاؤ پلیز...... کیا وہ لڑکی اُداس نہیں ہوئی تھی؟''

کنول کے چہرے پر کچھ دیر تک شفق کے رنگ لہراتے رہے...... پھر اس نے لے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بھئی سر ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔ میرے بڑے انکل کہا کرتے تھے، نادان لوگ جو ایک چھٹانک کی زبان نہیں ہلاتے، دس کلو کا سر ہلاتے ہیں۔''

''مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ بات سمجھ میں آ جائے۔''

''بات ہی تو سمجھ میں نہیں آئی نا۔'' وہ اسے ستانے پر تلا ہوا تھا۔

''کیا سمجھ میں نہیں آئی؟''

''یہی کہ لڑکی اُداس ہوئی تھی یا نہیں؟''

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہی پھر یاسر کے کان سے منہ لگا کر پورے زور سے

بولی۔

''ہوئی تھی...... ہوئی تھی......''

اس کی بلند آواز سن کر لوگ ان کی طرف دیکھنے لگے...... یاسر ایک لمحے کے لئے بوکھلایا تو چھتری کے ہینڈل پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ ہوا کا ایک نہایت تیز جھو چھتری کو اُڑا کر دور لے گیا۔ چھتری اُڑتی ہوئی گہری کھائی کی طرف جا رہی تھی۔

''دھت تیرے کی......'' یاسر بڑبڑایا اور اٹھ کر چھتری کے پیچھے بھاگا۔ کھائی سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر اس نے چھتری کو بمشکل پکڑا۔ کنول ہنس ہنس کر دُہری ہو رہی تھی۔

یاسر اس کی طرف بھاگا تو وہ بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔ یاسر سے بچنے کے لئے سفید فام سیاحوں کے درمیان گھس گئی۔ یاسر کچھ دیر تک پیچ و تاب کھاتا رہا پھر ٹھنڈا ہو کر ایک پتھریلے بینچ پر بیٹھ گیا۔ کنول کی باریک تیز آواز کے سبب اس کے کان میں کھجلی ہونا شروع ہو گئی تھی۔

کنول نے دور ہی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر یاسر کو یقین دلایا کہ اب وہ اس طرح کی شرارت نہیں کرے گی۔ یاسر نے بھی مسکرا کر سیز فائر کا اعلان کیا۔ وہ دو آئس کریم کپ لے کر اس کے قریب آن بیٹھی۔ نرم لہجے میں بولی۔

''تم نے غور کیا، میں نے کاغذ کا یہ ٹکڑا اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔''

''کیوں رکھا ہوا تھا؟''

''یہ تو مجھے خود بھی پتہ نہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''کنول...... یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے...... کیوں دو اجنبی لوگ ایک دم ہی ایک راستے پر چلنے لگ پڑتے ہیں۔ ساری دنیا سے الگ ہو جاتے ہیں۔''

''جو میں تم سے پوچھنا چاہ رہی ہوں وہی تم مجھ سے پوچھ رہے ہو۔''

دونوں خاموش ہو گئے۔ خاموشی بولنے لگی۔ نرم دھوپ میں سرسراتی ہوئی ہوا جسموں کو گدگدانے لگی۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تنہائی چاہتے تھے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سناٹا چاہتے تھے۔

''آؤ نیچے چلیں......'' یاسر نے کہا۔

کنول نے کاغذ کے دونوں ٹکڑے اپنے بیگ میں سنبھالے اور یاسر کے ساتھ چل طویل ڈھلوان طے کر کے وہ عجوبہ چٹان سے نیچے پہنچے۔ اب دن ڈھلنا شروع یا تھا۔ انہیں بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے قیام کے لئے کوئی اچھی تلاش کرنے لگے۔ سیاحوں کی ٹولیاں سبزہ زاروں میں اور ڈھلوانوں پر چکرا رہی یں۔ وہ بھی چکراتے رہے۔ پھر انہیں ایک نہایت حسین و جمیل مقام نظر آیا۔ یہ بہ چٹان کی پرلی جانب ایک بے حد خوبصورت اور الگ تھلگ ڈھلوان تھی۔ یہاں پ نرم اور ہوا خوشگوار تھی۔ سفید فام جوڑے یہاں وہاں بیٹھے اور لیٹے دھوپ سے ف اٹھا رہے تھے۔ کنول نے ایک کھوہ نما جگہ دیکھی۔ یہ خوب روشن اور ہوادار تھی۔ پر ایک پتھریلی سل نے سائبان کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔

انہوں نے وہاں میٹرس بچھایا اور کھانے پینے کا سامان رکھ دیا۔ عجوبہ چٹان اب کی دائیں جانب تھی...... اور چوٹی پر موجود لوگ رنگ برنگ متحرک نقطوں کی طرح ر آتے تھے۔ کچھ متحرک نقطے اب بھی زینوں پر اوپر کی طرف جا رہے تھے۔ یاسر ک مین پر میوزک سننے لگا۔ کنول کھانے کے پیکٹ کھولنے لگی۔ پتہ نہیں کہ وہ کیا کچھ یٹ لائی تھی۔ سویٹ اینڈ سارو چکن، گرل کی ہوئی مچھلی، سری لنکا کے سب سے شبودار چاول، گھر کی بنی ہوئی ڈرم اسٹکس اور مقامی سویٹ ڈش۔ فروٹ اور کھانے نے کی دیگر اشیاء کے سلسلے میں کنول کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کرتی تھی۔ ہر چیز نمبر ون تی تھی۔

ایک خوشگوار ماحول میں انہوں نے نہایت مزیدار کھانا کھایا۔ زینوں کی طویل قت سے یاسر کی ٹانگیں دُکھنے لگی تھیں۔ وہ بازو کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ وہ کچھ دور ریلی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بس میں اس کی طبیعت بری طرح خراب ہو گئی ی۔ اب وہ سنبھل گیا تھا لیکن سر اور گردن میں کھچاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ شاید یہ بھی کن کی وجہ سے تھا۔

''پتہ نہیں اسے کیسے خبر ہو گئی۔ تمہارا سر تو نہیں دُکھ رہا؟'' اس نے پوچھا۔

''نن...... نہیں تو......''

''میرا خیال ہے کہ دُکھ رہا ہے۔ چلو میں تمہارے سر پر مالش کر دوں۔ تھوڑا سا

ہربل آئل ہے میرے پاس۔"

"ہربل آئل؟" یاسر نے پوچھا۔

"ہربل مساج کینڈی کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ کئی سیاح تو یہاں آتے ہی سب سے پہلے ہربل مساج کا ٹھکانہ پوچھتے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے میں تین چار ہزار روپیہ اینٹھ لیتے ہیں ہربل مساج کرنے والے۔"

وہ دایاں ہاتھ مسلسل اپنے شولڈر بیگ میں گھما رہی تھی۔ اس کا بیگ عمرو عیار کی زنبیل تھا۔ اس میں سے اکثر مطلوبہ اشیاء نکل آتی تھیں۔ ہربل آئل کی چھوٹی سی شیشی بھی نکل آئی ...... وہ زانو تہہ کر کے یاسر کے سرہانے بیٹھ گئی۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"تو اب تم میرے سر کی مالش کرو گی؟"

"ضرور کروں گی ...... اس میں حرج کی کیا بات ہے؟"

"لل...... لیکن...... میرا...... مطلب ہے......"

"کوئی مطلب نہیں۔ چپ چاپ لیٹے رہو...... مفت کی خدمت گار مل رہی ہے، اوپر سے نخرے دکھا رہے ہو؟"

اس نے یاسر کو زبردستی پھر سے لٹا دیا۔ تھوڑا سا آئل اپنی دودھیا ہتھیلی پر نکالا۔ اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کی پوریں اس آئل میں ڈبوئیں اور پھر یہ پوریں نرمی سے یاسر کے بالوں میں گھسا دیں۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس یاسر کے رگ و پے میں پھیل گیا۔ کنول نے اپنا عمل دُہرایا۔ انگلیوں کی پوریں ہربل آئل میں ڈبونے کے لئے اس نے ہتھیلی پر رکھیں تو یاسر پر ایک انکشاف ہوا...... ایک اہم انکشاف......

گولڈن رِنگ کنول کی انگلی میں نہیں تھی۔ وہی رِنگ جس کی نسبت خاور سے تھی۔ یاسر کے سراپے میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں...... لیکن کوئی سوال اس کی زبان پر آیا اور نہ اس نے چہرے پر کوئی تاثر نمودار ہونے دیا۔ رِنگ کنول کی انگلی میں نہیں تھا مگر اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ فوری طور پر کوئی نتیجہ نکال لینا مناسب نہیں تھا۔

وہ شاید اس رِنگ (Ring) کے حوالے سے کچھ اور بھی سوچتا، کچھ مزید اندازے لگاتا لیکن اس کے ذہن میں ایک خوشبودار دھند سی بھرنا شروع ہو گئی تھی۔ بالوں میں

کنول کی اُنگلیوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ یہ دھند گہری ہو رہی تھی۔

اس نے بے خیالی میں گردن پر ہاتھ لگایا تو وہ جلدی سے بولی۔

"گردن پر بھی مل دوں؟"

"نن...... نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"دیکھو، تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ اسے پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ "چلو یہ قمیص اتار دو اور الٹے لیٹ جاؤ۔ یہ آئل تمہیں پل بھر میں بھلا چنگا کر دے گا۔"

یاسر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "نہیں کنول...... مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا۔ چلو...... تھوڑی دیر چہل قدمی کر لیتے ہیں۔"

"خبردار...... اٹھنا نہیں...... چلو لیٹ جاؤ......" وہ اس کے سینے پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولی۔

"تم...... تم زبردستی کر رہی ہو۔"

"چلو...... زبردستی ہی سہی...... لیکن مجھے یہ کرنے دو۔" اس کا لہجہ عجیب تھا۔ اس میں اصرار کے ساتھ ساتھ التجا بھی تھی۔

یاسر نے بہت انکار کیا لیکن اس نے ایک نہیں چلنے دی۔ تکرار کے دوران میں اس کا ایک ہاتھ یاسر کی شرٹ کے بٹن کھولتا چلا گیا...... کچھ ہی دیر بعد یاسر میٹرس پر اوندھا لیٹا تھا اور وہ دونوں زانو تہہ کر کے اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ حیران کن نرمی اور ملائمت کے ساتھ یاسر کی گردن کے پچھلے حصے اور کندھوں پر گردش کر رہے تھے۔ یہ ایک عجیب "اسٹیج" تھی۔ یاسر محسوس کر رہا تھا کہ اگر وہ مزید انکار کرے گا تو وہ بری طرح ناراض ہو جائے گی۔

"آرام آ رہا ہے؟" اس نے خواب ناک آواز میں پوچھا۔

"ہوں......"

"کمر پر بھی مل دوں؟"

"ہوں۔"

تازہ پھولوں جیسے گداز ہاتھ اس کی کمر پر گردش کرنے لگے۔ بلند پام پیڑوں اور لہلہاتی ہریالی کو چھو کر آنے والی ہوا اس کے حواس کو معطر کر رہی تھی۔ دور کسی ٹورسٹ

بس میں بیٹھے ہوئے مقامی اسٹوڈنٹ بینڈ باجے بجا رہے تھے اور ان کی مدھم آواز ہوا کے دوش پر تیر کر یاسر کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ یاسر کے ذہن میں غنودگی بھرتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ کنول کے ہاتھ اس کی پتلون کے پائنچوں پر گردش کر رہے ہیں، وہ پائنچے اُڑس کر اس کی پنڈلیاں ننگی کر رہی تھی۔ یاسر کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب انکار بھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ انکار کرتا بھی تو یہ بیکار تھا۔ اس نے پنڈلیاں گھٹنوں تک عریاں کر دیں اور پھر ان پر آئل کے قطرے گرانے لگی۔ چند لمحے بعد اس کے ہاتھ یاسر کی پنڈلیوں پر گردش کر رہے تھے۔ یہ کومل ہاتھ ایک جاں فزاء راحت کے ساتھ یاسر کی پنڈلیوں کا درد چننے لگے۔

یہ کیسی لڑکی ہے...... کتنی مختلف...... اور اس پر ایک لمبا لیکچر دیا تھا۔ آج وہ خود سراپا محبت نظر آ رہی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ بس اس کی سانسوں کی صدا یاسر کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

"تھک گئے ہو تو سیدھے ہو جاؤ۔" اس کی خواب ناک آواز پھر یاسر کے کانوں سے ٹکرائی۔

وہ سیدھا ہو گیا۔ اس نے دیکھا مشقت سے کنول کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ حسین پیشانی پر ہلکے سے پسینے کی چمک تھی اور اس کی آنکھیں...... وہ دو آنکھیں نہیں تھیں...... شاید دو مے خانے تھے۔

یاسر نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ اس نے ایک بار پھر ہاتھ کا فیصلہ کن دباؤ اس کے سینے پر ڈالا اور اسے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے بڑی محبت سے یاسر کا ایک پاؤں اپنی گود میں رکھا اور مساج کرنے لگی۔ اس کی انگلیاں مہارت سے اس کے پاؤں کے پیچ و خم کو آرام پہنچانے لگیں۔

"پلیز کنول...... پلیز ایسا مت کرو۔"

"شٹ اپ......" اس نے پھر پیار سے ڈانٹا۔

یاسر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خوشبو دار دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ یاسر نے اسے بازو سے پکڑا، اپنے پاؤں کی طرف سے ہٹایا...... اپنے منہ کی طرف کھینچ لیا۔ ایک معطر گداز نے ان دونوں کو ڈھانپ لیا۔ چھتری ان کے پاؤں کی طرف تھی۔

لانکہ اسے چہرے کی طرف ہونا چاہئے تھا۔ یہ امبریلا لو تو تھا...... اور نہیں بھی تھا۔

"تمہاری اُنگلی کا رِنگ کہاں ہے؟" یاسر نے الجھی ہوئی سانسوں کے درمیان رُشی کی۔

"میں نے اتار دیا۔" وہ جیسے کہیں دور سے بولی۔

"کیوں؟"

"مجھے نہیں معلوم......" اس کے لہجے میں بے پناہ معصومیت تھی۔

......ایک دو منٹ بعد وہ کھوہ سے باہر تھے...... اور اب ان کا رخ ڈمبولا کی طرف ڈمبولا، وہ شاندار جگہ جہاں گولڈن ٹمپل تھا اور راک ٹمپل تھا۔

بس اسٹاپ پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک مقامی کار سوار نے انہیں لفٹ آفر کر دی۔ ایک برق رفتار ڈرائیور تھا۔ اس نے انہیں آناً فاناً ڈمبولا شہر پہنچا دیا۔ اس نے مزید بات یہ کی کہ انہیں گولڈن ٹمپل کے عین سامنے اتارا۔ گولڈن ٹمپل اور راک ٹمپل شہر تھوڑا ہٹ کر تھے۔ انہوں نے فی کس 500 روپے کا ٹکٹ خریدا اور سیر شروع کر ا۔ گولڈن ٹمپل دیدہ زیب تھا۔ یہاں بدھا کا ایک فلک بوس مجسمہ تھا۔ اس مجسمے پر نے کا استر تھا۔ مجسمے کی جسامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ مجسمے کے وں تک پہنچنے کے لئے بھی طویل سیڑھیاں درکار تھیں۔

یہاں ایک شاندار میوزیم تھا جہاں بدھا اور بدھ مت سے وابستہ اشیاء رکھی گئی یں۔ میوزیم کو دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ اب ان کے سامنے کشادہ پتھریلی ڑھیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ یہ سیڑھیاں اوپر راک ٹمپل یعنی "چٹانی مندر" کی ت جاتی تھیں۔ سیڑھیوں پر بے شمار ملکی اور غیر ملکی زائرین نظر آ رہے تھے۔ خوانچہ وش، گداگر، قسمت کا حال بتانے والے، نوادرات بیچنے والے، تصویریں کھینچنے لے، انواع و اقسام کے لوگ ان سیڑھیوں پر موجود تھے۔ جگہ جگہ زائرین کے لئے ات لکھی گئی تھیں اور کتبوں کے ذریعے ان کی رہنمائی بھی کی گئی تھی۔ سفر طویل تھا۔ ہانپتے تھے، ستاتے تھے، پھر چل پڑتے تھے۔ کنول کے گال بھی شہابی ہو رہے ۔ یاسر یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایسا مشقت اور تمازت کی وجہ سے ہے یا ان ت کے سبب جو انہوں نے ایک گھنٹہ پہلے "عجوبہ چٹان" کے پہلو میں گزارے

ہیں۔ اس وقت سے کنول اور یاسر کے درمیان بہت کم بات ہوئی تھی۔ وہ خاموش تھے ...... اور یہی اصل گفتگو تھی۔ یہ گفتگو سینے میں اور سارے جسم میں ایک پُرلطف اذیت جگاتی تھی، جذبوں کو دہکاتی تھی اور ...... اور گالوں کو شہابی کرتی تھی۔

منرل واٹر بہت کام دے رہا تھا۔ وہ پیتے رہے، ہلکے پھلکے تبصرے کرتے رہے، تصویریں کھینچتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ آدھ پون گھنٹے بعد وہ راک ٹمپل کے روبرو تھے۔ ایک کتبہ انہیں بتا رہا تھا ...... یہاں سے آگے ننگے پاؤں آئیں ...... تصویریں مت کھینچیں ...... آپ کے جسم پر مناسب لباس ہونا چاہئے ...... خاموشی اختیار کریں وغیرہ وغیرہ۔ ہدایات کا لہجہ اٹل تھا۔

پتھر کی کھردری سیڑھیاں ختم ہوئیں۔ اب آگے دھوپ سے تپا ہوا کھردرا فرش تھا ...... وہ ننگے پاؤں آگے بڑھے۔ محبتیں اور عقیدتیں تپی ہوئی زمین پر اس طرح ننگے پاؤں جلاتی ہیں ...... کئی مرد و زن کے ہاتھوں میں نیلے رنگ کے بڑے بڑے پھول نظر آئے۔ یہ پھول مندر کے زینوں سے خریدے گئے تھے اور بدھا کے قدموں پر نچھاور کرنے کے لئے لے جائے جا رہے تھے۔

راک ٹمپل پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے اور بہت بڑا نہیں ہے۔ تاہم یہاں جو کچھ بھی ہے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پہاڑ کے اندر بہت سے غار تراشے گئے ہیں۔ ان غاروں کے اندر بدھا اور اس کے ساتھیوں کی لاتعداد مورتیاں ہیں۔ دو تین غاروں میں مقدس بدھا لیٹی ہوئی حالت میں نظر آیا۔ یہ قریباً چالیس فٹ لمبا دیوہیکل مجسمہ تھا۔ کروٹ کے بل استراحت کرتا ہوا۔ چہرے پر لافانی اطمینان۔ کنول نے ایک ادھیڑ عمر یورپین جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں صورتوں سے ہی ریسرچ اسکالر لگتے تھے۔ لیٹے ہوئے بدھا کے پاؤں پر کوئی تحریر کندہ تھی۔ وہ کمال اشتیاق سے اسے پڑھنے اور ڈائری پر اتارنے میں مصروف تھے۔ نیم تاریک غار میں دیئے روشن تھے۔ ان دیوں کی لرزتی روشنی میں وہ دونوں پراسرار نظر آتے تھے۔

وہ قریباً آدھ گھنٹہ ان غاروں میں گھومتے رہے۔ یہاں پھیلے ہوئے نہایت سادہ اور قدیم تقدس کو اپنے تمام حواس کے ساتھ محسوس کرتے رہے۔ پھر وہ ان غاروں سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ راک ٹمپل سے کچھ ہٹ کر ایک سرسبز ڈھلوان پر بیٹھ

ڈمبولا اور اس کے مضافات بہت دور تک نظر آ رہے تھے اور پیش منظر میں ن ٹمپل کا دیوہیکل طلائی بدھا تھا۔ وہ نجانے کتنے زمانوں سے اس آسن میں بیٹھا ر اپنے سامنے پھیلے نشیب و فراز کو دیکھ رہا تھا۔

ہوا بہت تیز تھی ...... کنول کے بال سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔ یاسر کا ہاتھ اس م ہاتھ میں تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ نیم باز آنکھوں سے بولی۔

سر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم نے وعدے کے مطابق مجھے فون کیوں نہیں کیا تھا؟"

"وہ بات تمہارے ذہن سے ابھی تک نکلی نہیں؟"

"نہیں نکلی ...... اسی لئے تو پوچھ رہی ہوں۔"

"تمہیں بتایا ہے نا کہ کام میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں "

و چند لمحے تک یاسر کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر اس ھے سے ٹیک لگا لی اور ڈھیلے لہجے میں بولی۔

"تم سچ کو چھپاتے ہو اور اب یہ تمہاری عادت بن چکی ہے۔"

"تم بھی تو سچ کو چھپاتی ہو ...... اور مستقبل میں شاید یہ تمہاری بھی عادت بن "

"یں سمجھی نہیں؟"

ر مسکرایا ...... "تم نے کینڈی آ کر خاور کو تلاش نہیں کیا۔ اور سب سمجھتے ہیں کہ تم یا ہے۔"

کنول کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ اس نے سر جھکایا تو ریشمی بالوں کی چند لٹیں پر جھولنے لگیں۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ان لٹوں کو اپنے شفاف گلابی کانوں پیچھے اُڑسا۔ اس کا بایاں ہاتھ یاسر کے ہاتھ میں تھا۔ ایک بار پھر اس نے گہری انس لی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یاسر! مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے اور میں اس پر بہت شرمندہ بھی

ہوں۔ تمہیں کیا پتہ میرے دل و دماغ پر کتنا بوجھ ہے اس بات کا ...... بہرحال اب میں نے کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور میں ضرور کروں گی۔''

''کیا مطلب؟''

''یاسر! میں نے زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں چھپایا...... میری ہمیشہ آرزو رہی ہے کہ مجھے کبھی بھی کسی وجہ سے جھوٹ نہ بولنا پڑے ...... میں اپنی زندگی درپن کی طرح صاف و شفاف چاہتی ہوں ...... میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ جو کچھ میں محسوس کر رہی ہوں وہ سب کچھ گھر والوں سے شیئر کروں گی۔''

''کیا بتاؤ گی انہیں؟''

''تمہارے بارے میں بتاؤں گی۔''

''میرے بارے میں ...... کیا؟''

اس کی آنکھوں میں چنچل مسکراہٹ ابھری۔

''انہیں بتاؤں گی کہ ...... یہ کمپیوٹر انجینئر جو شکل سے بڑا بھلا مانس نظر آتا ہے، اندر سے بہت پہنچی ہوئی شے ہے۔ یہ ہاتھ دھو کر ایک لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا ہے ...... اب وہ لڑکی بے چاری بھی اس چکر میں پھنس گئی ہے۔ لڑکی کی جان مصیبت میں ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کرے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر پرانی شے سے اس کا ناتا بڑی تیزی سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔ کوئی اسے اپنی طرف کھینچتا چلا جا رہا ہے۔''

''تم اس لڑکی کے غم میں کیوں ہلکان ہو رہی ہو؟''

''بھئی وہ میری سہیلی ہے...... میں ہلکان نہیں ہوں گی تو کون ہوگا؟''

یاسر نے پتھر سے ٹیک لگائی اور سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا تمہارے بزرگ تمہاری بات مان جائیں گے...... خاص طور سے تمہاری والدہ۔''

''میرا کام سچ بولنا ہے یاسر! اور وہ میں پوری دیانت داری سے بولوں گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا یہ وقت کے ساتھ پتہ چل جائے گا۔''

''تم کس سے بات کرو گی؟''

''سب سے پہلے اپنے چاچو سے ...... پھر باجی سلطانہ سے ...... پھر اپنی چچی

سے......''

''اور والدہ سے......؟''

''امی سے چاچو بات کریں گے...... یا باجی سلطانہ بات کریں گی یا پھر جیسے وہ ہنوں مناسب سمجھیں گے۔''

''کیا امی مان جائیں گی؟''

وہ بے پناہ سنجیدگی سے بولی۔ ''یاسر! سچ مشروط نہیں ہوتا اور محبت کا سچ تو مشروط رنا ہی نہیں چاہئے۔ جہاں تک امی کی بات ہے وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ مجھے تواس ہے کہ ان کا پیار جوش مارے گا۔ وہ اس سارے معاملے کو ایک مختلف نظر سے یکھنے لگ جائیں گی۔''

''تم میں بہت حوصلہ ہے کنول...... لیکن مجھ میں اتنا نہیں۔''

''یعنی تم اپنے گھر والوں سے بات نہیں کر پاؤ گے؟''

''نہیں...... میرے گھر والوں کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ ابو اور بھائی جان میری ت پر آنکھیں بند کر کے صاد کرتے ہیں ...... میں دوسری بات کر رہا ہوں۔ تم اپنے لھر والوں سے جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو ابھی مت کہو۔''

''تو کب کہوں؟''

''میرے جانے کے بعد...... میں زیادہ سے زیادہ تین چار دن یہاں اور رہوں گا ر پاکستان واپس چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد تم ایک دو بار پھر ٹھنڈے دل سے سوچ نا۔ تم میرے اور میرے حالات کے بارے میں سب کچھ اچھی طرح جان چکی ہو۔ ر پہلو پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد تم جو قدم چاہو اٹھا لینا ...... لیکن ابھی نہیں ...... لیز ابھی نہیں۔''

''ایک نمبر کے ڈرپوک ہو تم۔''

''تم جو چاہو کہہ سکتی ہو۔ لیکن میری یہ بات تمہیں ہر صورت ماننا ہوگی۔'' وہ ایک نجیدہ ہوگئی۔ ''میرے دماغ پر بڑا بوجھ ہے یاسر! میں اسے جلد از جلد اتارنا چاہتی ہاں۔''

''تو پھر میں جلد از جلد یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ گھر پہنچتے ہی کولمبو کے لئے کوئی

انٹرسٹی بس پکڑ لیتا ہوں۔"

کنول کے سینے پر جیسے گھونسا سا لگا...... وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ "نہیں ...... ایسے نہیں۔"

"تو پھر وعدہ کرو، ابھی گھر میں اس حوالے سے کوئی بات نہیں کرو گی۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر تمہارے چاچو سے لگ رہا ہے۔"

"تم دیکھنا ہمارے لئے سب سے زیادہ مددگار بھی وہی ثابت ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ ماں بیٹی کا پردہ ایک ہوتا ہے۔ لیکن میں امی سے بھی بڑھ کر چاچو سے قریب ہوں۔ میں ان سے کچھ بھی نہیں چھپاتی۔ دیکھنا اپنے اور تمہارے بارے میں بھی کچھ نہیں چھپاؤں گی ...... کچھ بھی نہیں۔"

"لنچ کے بعد جو کچھ ہوا، وہ بھی نہیں؟" یاسر نے شوخی سے کہا۔

کنول کے چہرے پر حیا کا رنگ لہرایا پھر سنبھل کر بولی۔ "ہاں، وہ بھی نہیں۔"

یاسر نے گھبراہٹ کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کنول کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ "خدا کے لئے ...... ابھی اپنے سچ کو دو تین دن تک بریکیں لگا کر رکھنا۔"

وہ مسکراتی چلی گئی۔ سورج ان کے سامنے تھا اور اس کی غروب ہوتی ہوئی کرنیں کنول کی آنکھوں میں شفق کے رنگ بکھیر رہی تھیں۔

یاسر نے کہا۔ "تمہاری دادی ماں کا ردِعمل کیا ہوگا؟"

وہ ہنسی۔ "دادی ماں کا کوئی ردِعمل نہیں۔ ان کی تو بس ایک ہی خواہش ہے، میری شادی ہو جائے، چاہے کالے چور سے ہو۔ بلکہ امی جان سے دادی کی تسل بھی یہی ہے۔ دادی کا وچار ہے کہ امی مجھے اپنے بھانجے سے بیاہنے کے چکر میں بوڑھا کر دیں گی۔ رات دن چاچو کو بھی کونیس کرتی ہیں کہ خاور کا معاملہ اب بہت لٹک گیا ہے، تم بس کنول کے ہاتھ پیلے کرو۔"

"تمہارا کیا خیال ہے ...... وہ ٹھیک کہتی ہیں؟"

کنول مسکرائی۔ "یوں تو دادی ماں کی ضد ہمارے حق میں جاتی ہے، لیکن بے لاگ بات تو یہی ہے کہ دادی ماں نے امی کی بات کو ہمیشہ رد کیا ہے۔ امی نے ہمیشہ کوشش کی لیکن دادی ماں کے ساتھ ان کا رشتہ ساس بہو والا رشتہ ہی رہا۔ بہرحال اس کا یہ

مطلب نہیں کہ میں دادی ماں کی برائی کر رہی ہوں۔ وہ ایک ڈیسنٹ بزرگ ہیں۔"

"ہاں بھئی ...... تمہارے بزرگ جو ٹھہرے۔"

"کیا مطلب؟ میرے بزرگوں میں کوئی خامی دیکھ رہے ہو؟"

"بالکل ...... سب سے زیادہ خامیاں تو مجھے تمہاری امی جان میں نظر آ رہی ہیں۔"

"کیا؟" وہ کڑک کر بولی۔

وہ مسکرانے لگا، پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "کنول! میں تمہیں بتا نہیں سکتا، مجھے بعد یہ کتنی اچھی لگتی ہیں۔ لگتا ہے کہ محبت کو آنسوؤں اور مہربان مسکراہٹوں میں گوندھ کر ماں کی شکل بنا دی گئی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میری امی حیات ہوتیں تو بالکل ایسی ہی ہوتیں۔ ان کی پریشانی دیکھتا ہوں تو دل ہولنے لگتا ہے۔ اور پھر یہ سوچ کر مزید پریشان ہو جاتا ہوں کہ کہیں میری اور تمہاری وجہ سے انہیں مزید دکھ نہ اٹھانا پڑے۔"

"تم بے فکر رہو یاسر ...... ایسا نہیں ہوگا۔" کنول نے یقین سے کہا۔

وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سورج ان کے سامنے تھا اور اس کی غروب ہوتی کرنیں، کنول کی آنکھوں میں شفق کے رنگ بکھیر رہی تھیں۔ کچھ دنوں سے ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنا خیال رکھنے لگی تھی۔ اس نے اپنے لباس اور حلیے پر تھوڑی سی توجہ دی تھی اور وہ دلکش نظر آنے لگی تھی ...... اس وقت بھی ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ دلکش نظر آ رہی تھی۔ یاسر نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر بے ساختہ اس کی طرف جھک گیا۔

ڈمبولا شہر کے اندر سے گزرتے ہوئے یاسر کو اچانک کچھ یاد آیا۔ نیپون ہوٹل کے سامنے تکہ شاپ والا لڑکا اجے یہاں ڈمبولا میں ہی تو زخمی ہوا تھا۔ وہ اسی شہر کے کسی اسپتال میں پڑا تھا اور نجانے کس حال میں تھا۔ اجے کی صورت ذہن میں آتے ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس کی بڑی بہن تھیلیسمیا کی مریض تھی۔ وہ برسرروزگار ہوتا تب بھی اس کے لئے حالات مشکل تھے۔ اب تو وہ بے روزگار تھا اور جان بلب بھی تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی ...... اور وہ غربت اور شباب کے دو پاٹوں میں تھی، جو کبھی بھی وقت پس سکتی تھی۔

اجے کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ حالات کی ستم ظریفی تھا۔ مگر اس ستم ظریفی میں اتفاقاً

علامتی طور پر یاسر کا نام بھی آ گیا تھا۔ یاسر کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بعد اجے نوکری سے نکالا گیا۔ اجے کے دوست سویاز کے بہت اصرار کے باوجود یاسر نے اجے کی بحالی کی سفارش نہیں کی۔ بعد ازاں اجے نشے کی حالت میں حادثے کا شکار ہوا اور ٹانگیں تڑوا کر ڈمبولا کے ہسپتال میں پہنچ گیا۔ یاسر نے برا نہیں سوچا تھا مگر جو کچھ ہوا وہ برا تھا۔

یاسر نے کنول کو اجے کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے متعلق تفصیل سے بتایا تھا۔ لہٰذا ڈمبولا شہر سے گزرتے ہوئے جب یاسر نے خواہش کی کہ وہ اجے نامی اس لڑکے سے ملنا چاہتا ہے تو کنول فوراً آمادہ ہوگئی۔ وہ انٹرسٹی بس پر سوار ہونے کے لئے بذریعہ ٹک ٹک بس جنکشن کی طرف جا رہے تھے۔ کنول نے ٹک ٹک کا رخ ڈیوڈ چیریٹی ہسپتال کی طرف کروا دیا۔ یاسر کی معلومات کے مطابق اجے اسی ہسپتال میں زیر علاج تھا۔ قریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے جب وہ ڈیوڈ ہسپتال پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔

پانچ دس منٹ کی معلومات کے بعد انہیں پتہ چلا کہ اجے نامی زخمی لڑکا ہسپتال سے شفٹ ہو چکا ہے۔ انہیں پاس ہی واقع ایک اور ہسپتال کا نام بتایا گیا۔ کنول اور یاسر پیدل ہی چل کر اس ہسپتال تک پہنچ گئے۔ ان کی توقع کے برخلاف یہ ایک شاندار پرائیویٹ کلینک تھا۔ پارکنگ لاٹ میں کاروں کی لمبی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ شیشے کے خودکار دروازوں سے گزر کر وہ کلینک کی خوشگوار ٹھنڈک میں پہنچے۔ انکوائری کاؤنٹر سے پتہ چلا کہ مسٹر اجے چوہان اسپیشل روم نمبر 14 میں ہیں۔

کنول اور یاسر کو شک گزر رہا تھا کہ وہ غلط شخص کا تعاقب تو نہیں کر رہے؟ بہرحال چند منٹ بعد ان کا یہ شک بالکل غلط ثابت ہوا۔ طبی سہولتوں سے آراستہ ایک شاندار کمرے میں اجے اُن کے سامنے تھا۔ وہی اجے جو میلی نیکر اور کرتہ پہن کر تنگہ شاپ پر پلیٹیں صاف کرتا تھا اور سیاحوں کو شریر نظروں سے دیکھتا تھا۔

ایک ''فی میل اٹینڈنٹ'' اجے کے سرہانے موجود تھی۔ اجے کی دونوں ٹانگیں پلاسٹر میں جکڑی ہوئی تھیں اور وہ تکیے سے ٹیک لگا کر اورنج جوس پی رہا تھا۔ یاسر کو دیکھتے ہی اجے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ان آنکھوں میں خوف، حیرت اور

ایک ساتھ نظر آئے۔ یاسر نے آگے بڑھ کر نرمی اور محبت سے اس کے شانے پر رکھا تو وہ قدرے پُرسکون نظر آنے لگا۔

اگلے بیس پچیس منٹ میں اجے سے ان دونوں کی جو بات چیت ہوئی وہ انکشاف تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں چوڑی پیشانی والا ایک جواں سال سری لنکن بھی کے پاس آ بیٹھا تھا۔ اس کا نام جیسو تھا۔ جیسو اس مشروب ساز کمپنی کا مینجر تھا جس ڈائریکٹر کی کار سے ٹکرا کر اجے کی ٹانگیں ٹوٹی تھیں۔ اس گفتگو میں جیسو بھی گاہے بہ حصہ لیتا رہا...... اس گفتگو سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

''ایکسیڈنٹ کے بعد ڈائریکٹر صاحب کی کار موقع سے اوجھل ہوگئی تھی مگر بعد ں ڈائریکٹر صاحب کا ضمیر جاگا اور وہ تین چار دن کے وقفے کے بعد اس چیریٹی ال میں جا پہنچے جہاں اجے زیر علاج تھا۔ انہوں نے نہ صرف اپنا قصور تسلیم کیا علاج معالجے کے تمام اخراجات اپنے ذمے لے لئے۔ وہ اجے کو اس پرائیویٹ ک میں لے آئے۔ یہاں پہنچ کر وہ اجے کے مزید قریب آ گئے۔ اجے کے ت جاننے کے بعد اور اس کے مصائب سے آگاہ ہونے کے بعد انہوں نے ایک فیصلہ کیا۔ انہوں نے اجے کے سر پر اپنا دستِ شفقت مستقل طور پر رکھ دیا۔ وہ ڑ پتی تھے۔ ایک چھوٹے سے گھرانے کو باعزت اور خوشحال زندگی دینا ان کے چنداں مشکل نہیں تھا......''

جیسو صاحب نے بتایا کہ ڈائریکٹر صاحب نے اجے کی دونوں بہنوں کو بھی یہاں لا میں بلا لیا ہے۔ اجے کی بڑی بہن کا ایک بہترین ہسپتال میں علاج ہو رہا ہے لمبو میں اس کی بون میرو کی تبدیلی کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے۔ اجے کی چھوٹی یعنی ال بہن کو ڈمبولا کے بہترین اسکول میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ انہیں پوش علاقے ایک اچھی رہائش گاہ دی گئی ہے اور ہر قسم کی دیگر سہولتیں بھی مہیا کی گئی ہیں۔

یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے اجے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ٹوٹی ی انگلش میں کہا۔

''اگلے ہفتے میری ٹانگوں کا ایک آپریشن اور ہوگا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کے بعد چل سکوں گا۔''

یاسر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تم ایک حوصلہ مند لڑکے ہو۔ تم ضرور چلو گے اور زندگی میں کامیابی بھی حاصل کرو گے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوگا۔''

کنول نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا پتہ کسی دن نیپون ہوٹل کے سامنے ایک اور بڑا ہوٹل وجود میں آ جائے، بالکل اسی جگہ جہاں تم تکہ شاپ پر کام کرتے تھے۔''

''اور وہ تمہارا ہوٹل ہو۔'' یاسر نے وضاحت کی۔

اجے کی نم ناک آنکھوں میں آس امید کے دیپ روشن ہو گئے۔ یاسر نے اس کے دونوں ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

''مجھے معاف کر دینا ...... اس شام میں نے تمہیں بہت برا بھلا کہا۔ تمہارا دل دکھایا۔''

''نہیں سر...... معافی تو مجھے مانگنی چاہئے۔ میں بہت برا تھا ...... بہت ہی برا تھا۔''

کھڑکی سے باہر پام جھوم رہے تھے اور دودھیا روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ یاسر سوچ رہا تھا تقدیر انسان کو طے شدہ مقدر تک پہنچانے کے لئے کیسے کیسے انوکھے راستوں پر چلاتی ہے۔



وہ رات گئے واپس کینڈی پہنچ سکے تھے۔ اہل خانہ پریشان تھے۔ خاص طور سے چاچو سلیمان۔ یاسر کے سامنے تو انہوں نے کنول سے کچھ نہیں کہا مگر یاسر کا خیال تھا کہ انہوں نے کنول سے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے۔

وہ ساری رات یاسر نے عجیب سے نشے میں گزاری۔ سگیریا کے پتھریلے سائبان تلے گزرا ہوا وقت ایک سنہری خواب کی مانند تھا۔ وہ جادوئی لمحے تھے اور گزرنے والے ہر پل کے ساتھ ان کی پُر لطف یاد یاسر کے رگ و پے میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔ فکر فردا کے اندیشے اس پُر لطف یاد کے سبب یاسر سے بہت فاصلے پر چلے گئے تھے۔ یہ بڑی میٹھی، لذت بھری یاد تھی کہ یاسر ایک پل کے لئے بھی اسے خود سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلے روز وہ صبح سویرے اکیلا ہی کینڈی میں گھومنے کے لئے چلا گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تنہا رہے اور اس میٹھی یاد کو اپنے اندر راسخ کرتا رہے۔ ہوٹل سے نکلنے کے فوراً بعد اس نے چوکنی نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ حکیم شمیم شاذی اور اس کا لمبے کانوں والا اسسٹنٹ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ یاسر نے شکر کا سانس لیا اور ڈھلوان پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا جھیل کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک ٹک ٹک والا ملا، کچھ دیر دھیان سے یاسر کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

''جناب! وہ آپ ہی ہیں جن کا فلم رول پرسوں کہیں گم ہو گیا تھا؟''

یاسر نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں...... ہاں، میں ہی ہوں۔''

''آپ گھبرائیں مت ...... بدھا نے چاہا تو رول ضرور مل جائے گا۔'' ٹک ٹک والا نیک تمنا کا اظہار کر کے آگے بڑھ گیا۔

جھیل کے کنارے سے یاسر ٹک ٹک میں بیٹھا اور ٹک ٹک والے سے کہا کہ وہ

اسے کینڈی کا ایک چکر لگوائے۔ ابھی ٹک ٹک میں سوار ہوئے یاسر کو دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس نے ایک بات نوٹ کی، ٹک ٹک والا عقب نما آئینے میں سے بار بار اسے گھور رہا تھا...... ''یا اللہ خیر، کہیں یہ کولمبو والے فلائنگ ہارس کا کوئی رشتے دار تو نہیں؟'' یاسر نے ڈر کر سوچا۔ بہرحال بات کچھ اور تھی۔ ٹک ٹک والا لجاجت سے بولا۔

''سر! کہیں آپ وہ تو نہیں جن کا فلم رول پرسوں کہیں کھو گیا ہے؟''

''ہاں...... میں ہی ہوں۔'' یاسر نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں...... اگر رول کسی ٹک ٹک میں گرا ہے تو ضرور مل جائے گا۔''

یاسر اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ شہر کا ایک راؤنڈ لگانے کے بعد جامع مسجد کے قریب اترا۔ اترنے کے بعد یاسر کو جو پہلا شخص ملا وہ بھی ایک ٹک ٹک والا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''آپ وہ ہیں نا جو ''وائٹ ہوم گیسٹ ہاؤس'' کے سامنے رہتے ہیں؟''

یاسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اور میرا ہی فلم رول پرسوں ٹک ٹک میں سفر کرتے کہیں گرا ہے۔''

''ہم آپ کا رول تلاش کر رہے ہیں جناب! ضرور مل جائے گا۔'' ٹک ٹک والے نے بتیسی نکالی۔

یاسر چکرا کر رہ گیا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ کینڈی کے تمام ٹک ٹک والے، باقی سب کام چھوڑ کر اس کے گم شدہ فلم رول کی تلاش میں لگ گئے ہیں۔ یہ سب کیا دھرا یقیناً اسی ٹک ٹک والے کا تھا جس سے کل یاسر نے اپنے فلم رول کا ذکر کیا تھا۔ یاسر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ٹک ٹک والے حضرات اس کی درخواست کو اتنی گہری سنجیدگی سے لیں گے۔ یہ ان کی مہمان نوازی تھی یا پھر شاید اس میں انعام پانے کی خواہش بھی شامل ہو۔

یاسر نے چاروں طرف دیکھا، اسے لگا کہ ٹک ٹک والے ہی نہیں کینڈی کے عام باشندے بھی اس کے فلم رول کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ اسی اثناء میں دو تین مزید رکشا ڈرائیور یعنی ٹک ٹک والے یاسر کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ سب یاسر کو بڑی

ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں گمشدہ فلم رول کی تلاش کا عزم تھا۔

ان سب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یاسر فروٹ مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔ اس نے کینڈی اور ڈمبولا وغیرہ میں یہ چلن دیکھا تھا کہ دکانیں سرِ شام ہی بند ہونے لگتی تھیں بلکہ کینڈی میں دو دن پہلے اس نے کچھ فروٹ شاپس سہ پہر کو ہی بند ہوتے دیکھی تھیں۔ سری لنکا کے ننھے منے مٹھاس اور خوشبو بھرے کینو اُسے بہت پسند آئے تھے اور یہ کنول کو بھی پسند تھے۔ اس نے کچھ کیلے، سیب اور کینو خریدے۔ یہ پھل تمام اہل خانہ کے لئے دو دن کے لئے کافی تھا...... اور یاسر کو غالباً دو دن ہی مزید یہاں رہنا تھا۔ اسے کنول کی لا اُبالی طبع کی طرف سے خطرہ تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس وقت سچ کا کلہاڑا چلا دیتی۔ وہ اب جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ کنول نے ذمے داری لی تھی کہ وہ اس کے جانے کے بعد سب حالات درست کر لے گی...... اور وہ اس ذمے داری میں حصے دار بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے حصے کی ذمے داری نبھانا چاہتا تھا اور اس کے حصے کی ذمے داری بڑی آسان تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شادی کے سلسلے میں اس کے گھر والے عرصے سے اس کے ہونٹوں کی جنبش کے منتظر ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ بس کسی لڑکی کا نام لے۔ اس کے بعد وہ جانیں اور ان کا کام۔ اور وہ اب جلد از جلد پاکستان واپس پہنچ کر اس لڑکی کا نام لینا چاہتا تھا۔

اب کینڈی میں اس کے پاس دو یا تین روز تھے۔ وہ ان دنوں کو کنول کی معیت میں اچھی طرح گزارنے کے بارے میں سوچ بچار کرتا پیدل ہی گھر کی طرف چل دیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پھلوں والی ٹوکری تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ کنول کو ٹک ٹک والوں کی مستعدی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔

وہ گھر کے سامنے پہنچا تو اسے کنول نظر آئی، اس نے ایک ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا۔ بال شانوں پر آوارہ ہو رہے تھے۔ وہ ایک پتھر پر بالکل اُداس اور خاموش بیٹھی تھی۔

سب سے پہلا خیال یاسر کے ذہن میں یہی آیا کہ شاید چاچو سلیمان نے اس سے کوئی سخت بات کہہ دی ہے۔ وہ اس کے پاس چلا گیا۔ وہ تب بھی خاموش بیٹھی رہی۔ ایک تصویر کی طرح ساکت و جامد۔

"کیا ہوا تمہیں؟" یاسر نے پوچھا۔

"کولمبو آفس سے تمہارا فون آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر فون کریں گے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"ابھی وہ بات ہی کر رہے تھے کہ اندر سے نٹ کھٹ دوڑتا ہوا آیا۔

"انکل آپ کا فون...... دوڑ کر آئیں۔"

اس نے اندر پہنچ کر کال ریسیو کی تھی۔ دوسری طرف ہمانتھا فرنینڈو تھے۔ انہوں نے مختصر الفاظ میں یاسر کا حال احوال پوچھنے کے بعد کہا۔

"یاسر! تمہیں پانچ چھ گھنٹے کے اندر اندر کولمبو پہنچنا ہوگا...... سسٹم میں پھر فالٹ آ گیا ہے اور اس مرتبہ کافی پیچیدہ محسوس ہوتا ہے۔ میں لاہور آفس سے مسٹر شہریار اور مسٹر نعیم کو بھی بلا رہا ہوں۔"

یاسر کے سینے میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ وہ کینڈی کو چھوڑنا تو چاہتا تھا لیکن اتنی جلدی نہیں۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے کھینچ کر کینڈی اور کنول سے جدا کر رہا ہے۔ لیکن ہر کام میں خدا کی طرف سے کوئی بھلائی ہوتی ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا اور دھیان سے ہیمانتھا صاحب کی ہدایات سننے لگا۔



صرف دو گھنٹے بعد وہ کینڈی سے روانہ ہو رہا تھا۔ اگلے دو تین روز کا سارا پروگرام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ ڈیڈی آشا نے یاسر کو مقامی بریانی اور آم سے بنی ہوئی سویٹ ڈش کھلانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یہ اہتمام بھی دھرے کا دھرا رہ گیا۔ وہ چار بجے کے قریب روانہ ہونے کے لئے تیار تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ جانے سے پہلے تنہائی میں کنول سے تھوڑی سی بات کرنے کا موقع مل جائے مگر یہ خواہش...... بس خواہش ہی رہی۔ اس کے اردگرد سب موجود تھے۔ غالباً چاچو سلیمان کے سوا سبھی اس کے اچانک جانے پر اداس تھے۔ خالہ سعدیہ کی آنکھوں میں تو باقاعدہ آنسو نظر آئے۔ سب کا اصرار تھا کہ پاکستان واپس جانے سے پہلے وہ ایک چکر کینڈی کا ضرور لگائے۔

"میں تمہیں فون کروں گا۔" یاسر نے کنول کو مخاطب کر کے ہولے سے کہا۔

"پہلی مرتبہ بھی تو یہی کہا تھا۔" کنول نے شکوہ دہرایا۔

وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔" یاسر نے کہا اور اپنا اٹیچی سنبھالتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر شاذی موجود تھی۔ آج وہ اطمینان سے بیٹھی رہی۔ اس کا ہوا تھا۔ شاید اسے بھی یاسر سے تھوڑا بہت اُنس پیدا ہو گیا تھا۔

ار صاحب کی ایئر کنڈیشنڈ وین پر یاسر بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے ے انٹرسٹی یعنی ایکسپریس بس کے ذریعے کینڈی پہنچنا تھا۔ خوبصورت ڈھلوان پر جھیل کی طرف اترتے ہوئے ایک سہانی شام ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یکن اُداس......

یل کے پار بدھا کے مندر میں سوتروں کا الاپ شروع ہو گیا تھا۔ ہوا کی لہروں پر بھرتا ہوا الاپ...... پچھلے چند دنوں میں کینڈی کی طرح یہ الاپ بھی یاسر کے اندر ں گیا تھا۔ جھیل پر پرندے محو پرواز تھے اور جھیل کی کنگرے دار باؤنڈری کے ساتھ ٹورسٹ" رواں دواں تھے...... کیا میں پھر یہاں آ سکوں گا؟...... یاسر نے گہری ا سے سوچا اس جھیل کے پاس...... اور کنول کے پاس؟

ا جامع مسجد کے قریب سے ہوتے ہوئے نکلے۔ نمازیوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ نکا میں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا تین فیصد سمجھی جاتی ہے اس کے باوجود ں میں رش نظر آتا ہے۔

ٹی سینٹر سے گزرے۔ لوگوں کی چہل پہل تھی۔ دفعتاً یاسر کے ذہن میں ایک غیر بات آئی...... اس کا دھیان اپنے گمشدہ فلم رول کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے یاد آیا ں روز فلم رول گم ہوا تھا وہ باٹا اسٹور پر بھی تو گیا تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر جوتا ٹرائی تے ہوئے بھی ٹانگوں کا اینگل وہی ہو جاتا ہے جو رکشا میں بیٹھنے سے ہوتا ہے...... ں کوئی بھی شے پتلون کی سائیڈ پاکٹ سے پھسل سکتی ہے۔ تو کہیں وہ رول باٹا ر ہی نہ گرا ہو...... کمار صاحب کی اسٹیشن وین کو شاپ کے پاس سے ہو کر گزرنا اسر کے دل میں آئی کہ ایک دفعہ شاپ سے پوچھ لینا چاہئے۔ اس نے چوراہے پر ر کمار صاحب سے درخواست کی کہ وہ دو منٹ کے لئے اسے اترنے کی اجازت

ین سے اتر کر وہ تیز قدموں سے باٹا شاپ تک پہنچا۔ سیل گرل نے اسے دیکھا

اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر اس کے سانولے چہرے پر شناسائی ابھری۔

''اچھا...... آپ ہی نے چند دن پہلے ہلکے براؤن جوگرز خریدے تھے؟''

یاسر نے امید بھرے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

''کہیں آپ کا فلم رول تو گم نہیں ہوا؟'' لڑکی نے چہک کر پوچھا۔

یاسر کے دل میں آیا کہ لڑکی کے منہ میں گھی شکر ڈال دے۔ لیکن یہ سری لنکا تھا یہاں گھی تھا اور نہ شکر ...... ناریل کا تیل ایسے پُر مسرت موقع کے لئے زیادہ مناسب نہیں تھا۔

یاسر کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''ہاں محترمہ! وہ میرا ہی فلم رول ہے۔''

لڑکی کولہے مٹکاتی ہوئی گئی اور ایک دراز میں سے دو تین فلم رول نکال لائی۔ کوڈک کا ایک رول یاسر کو دکھاتے ہوئے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ یہ ہے آپ کا۔''

یاسر نے بھی رول پہچان لیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ (رول کو)

میز کی دراز میں فلم رولز کی موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ یہاں اکثر ٹورسٹ خواتین حضرات سے اس قسم کی لاپرواہی سرزد ہوتی رہتی ہے۔

سیلز گرل کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے یاسر قریباً بھاگتا ہوا واپس اسٹیشن وین میں پہنچ گیا۔ کمار صاحب بھی یاسر کی اس کامیابی پر خوش ہوئے۔ سڑکوں پر ٹک ٹک والے اب بھی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ممکن ہے کہ انہیں اپنے ذاتی کام بھی ہوں...... مگر یاسر کو تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ سادہ دل لوگ باقی سب کچھ تیاگ کر پچھلے چند روز سے بس یاسر کے کام میں ہی جتے ہوئے ہیں۔ یاسر کا دل چاہا کہ کسی ایک ٹک ٹک والے کو روک کر یہ ''بریکنگ نیوز'' اس تک پہنچا دے کہ ایک خوش خصائل سیلز گرل نے فلم رول اسے لوٹا دیا ہے۔ مگر اس ارادے پر عمل کرنا ذرا مشکل تھا۔ ایک تو ان کے پاس ٹائم بہت کم تھا دوسرے یہ بھی اندیشہ تھا کہ یاسر بات کرنے کے لئے کسی بے خبر، جاہل اور نکمے ٹک ٹک والے کا انتخاب کر لیتا۔ یاسر کی بات سن کر وہ یاسر کا منہ تکنے لگتا اور کہتا کہ

''تم کس فلم رول کی بات کر رہے ہو بھائی صاحب؟''

بس میں بیٹھ کر بھی یاسر ٹک ٹک والوں کو دیکھتا رہا اور اسے یہی محسوس ہوتا رہا کہ

ی تلاش'' نامی فلم چل رہی ہے۔ بچپن میں سنی ہوئی جگنو اور پتنگوں والی کہانی اسے ئی۔ کنول کی شہزادی نے پتنگوں سے کہا جو میرے لئے روشنی لائے گا اس سے کرلوں گی۔ چند روز بعد اس نے ایک جگنو سے عقد کر لیا۔ پتنگے بے چارے ی کے مارے اب بھی روشنی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ خود کو ب کر رہے ہیں۔



ر کولمبو واپس پہنچ گیا۔ وہی ہنستا مسکراتا اور شور مچاتا کولمبو۔

فس میں ہیمانتھا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ فالٹ کے سبب خاصے پیشان

گلے روز لاہور سے سینئر پروگرامر مسٹر شہریار بھی کولمبو پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ نعیم بھی

...... وہ قریباً پانچ روز دن رات کام میں جتے رہے۔ بالآخر سسٹم بحال ہو گیا۔ اسی ن میں لاہور سے کمپنی کے چند مزید افسران بھی کولمبو پہنچ گئے تھے۔ ایک لمبی چوڑی ۔ ہوئی۔ اس میں فیصلہ ہوا کہ شارٹ ٹرم انتظام کی بجائے سسٹم میں بنیادی یاں کی جائیں اور ان تبدیلیوں کے مکمل ہونے تک سسٹم کو مسلسل زیر نگرانی رکھا ۔ اس نگرانی کے لئے جن پروگرامرز کا انتخاب ہوا ان میں سے ایک یاسر بھی تھا۔

ر کو مختصر سی چھٹی ملی تھی۔ وہ صرف چار پانچ روز کے لئے پاکستان گیا، ابو اور شمائلہ لا، دیگر عزیزوں سے ملاقاتیں کیں، ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں لیں اور پھر واپس ۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ واپس گیا ہی نہیں۔

کولمبو آفس میں کام بہت زیادہ تھا۔ اگلے دو ہفتے تک اُسے سر کھجانے کی فرصت لی۔ اس دوران میں کنول کی یاد یوں آتی رہی جیسے گھٹا ٹوپ بادلوں میں اچانک چمکے، اردگرد کے ہر منظر کو تبدیل کرے اور پھر اوجھل ہو جائے۔ ان تین ہفتوں میں نا بار فون پر کنول سے بات ہوئی تھی مگر بہت مختصر اور عمومی قسم کی۔ اطمینان سے کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔

تیسرے ہفتے کے بعد اس پر کام کا بوجھ کم ہونا شروع ہوا۔

اتوار کا دن تھا۔ وہ دفتر والوں کی طرف سے دی گئی رہائش گاہ میں مقیم تھا۔ یہ ایک وسیع وعریض ریسٹ ہاؤس نما جگہ تھی۔ در و دیوار سے سبزہ لپٹا ہوا تھا۔ عمارت کی بناوٹ میں جدت اور قدامت کا خوبصورت امتزاج تھا۔ کشادہ بیڈ روم کی کھڑکیوں سے باہر ناریل جھومتے تھے اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ یاسر نے ایک طویل انگڑائی لی اور چمچم کے سرخ فرش پر چلتا فون کے سامنے آ بیٹھا۔ اس کے جسم میں ایک میٹھا میٹھا سا درد تھا۔ یہ درد اس کے دل سے اشارہ وصول کرتا تھا، اس کی کمر سے اٹھتا تھا اور جیسے پورے جسم میں پھیل جاتا تھا۔

یاسر کنول کو کال کرنے جا رہا تھا۔ دل میں ایک موہوم سا اندیشہ بھی تھا کہ کہیں یہ کال چاچو سلیمان ریسیو نہ کریں۔ بہرحال خیریت گزری۔ دوسری طرف سے جو آواز آئی وہ دیدی آشا کی تھی۔ دیدی آشا سے معلوم ہوا کہ چاچو سلیمان اوپر کے کمرے میں سو رہے ہیں اور کنول اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔

نجانے کیوں یاسر کو دیدی آشا کی آواز میں بھاری پن محسوس ہوا۔ وہ اس گھر میں کنول اور یاسر کی واحد رازداں تھیں اور یاسر سے بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں عجیب سی شوخی در آتی تھی۔ وہ دیدی آشا سے ان کے بجھے ہوئے لہجے کی بابت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اس دوران میں نسوانی قدموں کی چاپ سنائی دی اور دیدی آشا نے کہا۔

”لو...... آ گئی تمہاری مریضہ۔“

چند سیکنڈ بعد ریسیور سے کنول کی مری مری سی ہیلو سنائی دی۔

”ہیلو...... کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہیں نا؟“ یاسر نے فکرمندی سے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں...... بس میں ہی نہیں ہوں۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”اگر تم ٹھیک نہیں ہو تو پھر کچھ بھی نہیں۔“ یاسر نے کہا۔

”نہیں یاسر، میں سنجیدہ ہوں......“ کنول کی آواز کی شگفتگی برقرار رہی۔ چند لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ ”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے یاسر! اور مجھے آشا ہے کہ اس فیصلے میں تم میرا بھرپور ساتھ دو گے۔“

”کیسا فیصلہ؟“ یاسر کا دل دھڑک اٹھا۔

”یاسر! کچھ عرصے کے لئے ہم بالکل نہیں ملیں گے۔ براہِ راست، نہ فون پر، نہ کسی اور وسیلے سے۔ تمہیں یہ برا تو نہیں لگے گا نا؟“

”یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کسی سے پوچھا جائے کہ اسے اپنی گردن کٹوانا برا تو نہیں لگے گا...... لیکن اگر یہ سب کچھ کسی اچھے مقصد کے لئے ہے...... اور تم چاہتی ہو کہ میں ایسا کروں تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

”یہ اچھے مقصد کے لئے ہی ہے یاسر!“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”میں یہاں جو کچھ کر رہی ہوں، اچھے مقصد کے لئے کر رہی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور میں نے یہ بات اپنے گھر والوں سے منوانی ہے۔ یہ میری جنگ ہے یاسر! اور میں اسے اپنے انداز سے لڑنا چاہتی ہوں اور اس میں یقینی طور پر جیت بھی میری ہی ہونی ہے۔ شرط صرف یہ ہے، مجھے تمہاری محبت کا سہارا رہے۔ یاسر! تمہاری محبت کا سہارا رہے گا نا مجھے؟“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے کنول......“ یاسر نے کہا۔ ”لیکن کچھ مجھے بھی بتاؤ نا، کیا حالات ہیں تمہاری طرف؟“

”پلیز یاسر! یہ سب میرے سوچنے کی باتیں ہیں۔ تم اس بارے میں فکر نہ کرو۔“

”میرا اندازہ ہے کہ چاچو سلیمان رکاوٹ بن رہے ہیں۔“

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ”ہاں...... تھوڑا بہت ان کا مسئلہ بھی ہے۔“

”لیکن تم تو کہتی تھیں کہ وقت آنے پر چاچو سلیمان ہی تمہارے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوں گے۔“

”وقت آ رہا ہے نا یاسر......“ وہ بولی۔ ”پلیز میری خاطر...... ہاں میری خاطر تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔“

یاسر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے کنول...... یہ تمہارے گھریلو معاملات ہیں...... مگر ان معاملات کو سلجھاتے ہوئے ایک بات کا خیال رکھنا، مجھے یا تمہیں اپنے بڑوں کی نظروں سے گرنا نہیں چاہئے۔ مجھے خاص طور سے خالہ سعدیہ کی فکر ہے۔ اگر ہم دونوں کی طرف سے انہیں کوئی صدمہ پہنچا تو یہ بڑی پشیمانی اور تکلیف کی بات ہوگی۔ میں اسے سہہ نہیں سکوں گا۔“

"مجھ پر بھروسہ رکھو یاسر! میں ان معاملات میں تم سے کم حساس نہیں ہوں۔"

کچھ دیر تک لائن پر گمبھیر خاموشی طاری رہی، پھر یاسر نے بوجھل آواز میں پوچھا۔

"اب کب ملنا ہے؟"

"ہمیں کم از کم پانچ چھ ہفتے خاموشی سے گزارنے ہوں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں خود فون کروں گی۔ اگر اس دوران میں کوئی اشد ضروری بات ہوئی تو تم مجھے دیدی آشا کے موبائل پر رِنگ کر لینا۔ اگر کسی وجہ سے تمہیں پاکستان جانا پڑا تو مجھے اطلاع کر کے جانا۔"

دونوں کے درمیان پانچ دس منٹ تک بات ہوئی، پھر بوجھل دلوں کے ساتھ دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

کولمبو میں یاسر کا زیادہ تر وقت آفس میں ہی گزر رہا تھا۔ کسی وقت تو یاسر اور نعیم کو رات گئے تک آفس میں رکنا پڑتا تھا۔ لنچ، چائے، ڈنر سبھی کچھ آفس میں ہی ہوتا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو ایسا ہوا کہ انہیں دفتر میں ہی سونا پڑا۔ جب فرصت کے لمحات ملتے تھے، کنول کی یاد ایک سرکش ریلے کی طرح یاسر کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی تھی۔ ایسے میں نعیم اسے شرارتی نظروں سے دیکھتا تھا، چھوٹے موٹے فقرے کستا تھا...... اس کی یہ دخل اندازی یاسر کو اچھی نہیں لگتی تھی...... وہ کوئی تلخ ترش بات کہہ دیتا تھا۔ ایسی بات کو نعیم اکثر خوش دلی سے برداشت کر لیتا تھا مگر کبھی ناراض ہو جاتا تھا۔ اس کی ناراضگی ختم کرنے کے لئے یاسر کو اکثر قریبی "کے ایف سی" ریسٹورنٹ تک جانا پڑتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہ وہی ریسٹورنٹ تھا جہاں اکثر یاسر اور کنول بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی یاسر ایک بار پھر منہ زور خیالوں کے ریلے میں بہنا شروع ہو جاتا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا۔ نعیم بولتا رہتا، وہ ہوں ہاں کرتا رہتا۔ آخر نعیم سٹپٹا جاتا۔

"یار مجھے لگتا ہے کہ میں دیوار سے باتیں کر رہا ہوں...... لوگ مجھے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارنا شروع کر دیں گے۔"

نعیم کو پھر سے ناراض ہوتا دیکھ کر یاسر خود کو بمشکل اپنے حواس میں لاتا۔ اپنی پوری توجہ نعیم کی باتوں پر مرکوز کرتا...... اپنی توجہ کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے مختلف سوالات کرتا...... نعیم کے سوالوں کے جوابات دیتا مگر دھیرے دھیرے غیر محسوس طور پر اس کی

توجہ پھر منتشر ہونے لگتی۔ وہ کھڑکیوں کے شفاف شیشوں سے باہر جھومتے درختوں کو دیکھتا، فٹ پاتھ پر رواں دواں لوگوں کو دیکھتا...... اسے لگتا کہ ابھی کسی رنگین چھتری کی اوٹ سے کنول کا چہرہ نمودار ہو جائے گا۔ وہ مسکراتی ہوئی ریسٹورنٹ کے اندر چلی آئے گی۔ اپنی چھتری بند کر کے ایک طرف رکھے گی، اور اس کے عین سامنے کرسی پر بیٹھ جائے گی۔ وہ اسے محویت سے دیکھتا چلا جائے گا، وہ ان کے کان سے ہونٹ لگا کر زور سے "ٹررررر" کی آواز پیدا کرے گی۔

"کہاں کھو گئے ہو؟" وہ ہنستے ہوئے بولے گی۔ "سارے کولمبو میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں تمہیں...... میں نے کہا تھا کہ چھ ہفتے تک نہیں ملیں گے، لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا یاسر، میرا دم گھٹنے لگا تھا...... مجھے لگا تھا کہ میں مر جاؤں گی۔ میں اپنی قسم توڑ کر تمہارے پاس آ گئی۔"

وہ سوچتا رہتا۔ اس کے تخیل میں اتنی قوت ہوتی تھی کہ کسی وقت اسے باقاعدہ کنول کے جسم کی خوشبو محسوس ہوتی۔ اس کا چہرہ اتنی جزئیات کے ساتھ یاسر کے سامنے آتا کہ وہ اس کی آنکھوں میں تیرتے ڈوروں کو گن لیتا۔

یہ کیسا جنون تھا...... یہ کیسی دیوانگی تھی...... اسے اپنے جسم سے کنول کی خوشبو آتی تھی...... اسے اپنے کانوں میں اس کی سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں...... اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے اردگرد ہے...... اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

وہ عشق کرنے لگا تھا۔ ہاں یہ عشق ہی تو تھا...... اسے اپنے اردگرد کنول کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ کیفیت شدید ہو رہی تھی۔ وہ اب کولمبو میں گھومنے پھرنے سے بھی کترانے لگا تھا۔ جب وہ کولمبو میں گھومتا تھا تو اسے جانے پہچانے مناظر نظر آتے تھے۔ وہی جگہیں جہاں سے دونوں ساتھ ساتھ گزرے تھے۔ گال فیس روڈ، ماؤنٹ لیوینیا کا ساحل، میوزیم کو جانے والی سڑک اور اس کے کنارے ناریل بیچنے والے سنہالی لڑکے...... یاسر کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ ساری خوبصورت جگہیں ایک دم کھنڈر ہو گئی ہیں۔ وہاں ایک سوگوار اُداسی پر کھولے سو رہی ہے اور اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔

ہاں...... اُسے عشق ہو گیا تھا۔ اور عشق خطرناک ہوتا ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ

اپنے جیسے کسی بھی انسان سے بہت زیادہ محبت ٹھیک نہیں ہوتی۔ ایسی محبت کو نظر لگ جاتی ہے۔ ایسی محبت کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ کہیں ان دونوں کے ساتھ بھی تو کچھ ہو نہیں جائے گا؟'' یہ سوال ایک ٹیس بن کر یاسر کے سینے میں اٹھتا اور درد بن کر پورے جسم میں پھیل جاتا۔

اسے اندیشہ تھا کہ کنول نے اپنے اہل خانہ سے کچھ بھی چھپایا نہیں ہے۔ اسے نوے فیصد یقین تھا کہ کنول نے اپنے مخصوص انداز میں چاچو سلیمان وغیرہ کو سب کچھ بتا دیا ہے اور اس سب کچھ میں ''بہت کچھ'' تھا۔ سکیریا کے نواح میں پتھریلے سائبان کے نیچے گزارے ہوئے لمحات بھی تھے اور وہ محبت بھری سرگوشیاں بھی تھیں جو وہ ایک دوسرے کے کانوں میں کرتے رہے تھے......

اور اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو پھر صورت حال کی نزاکت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ سچ کبھی کبھی ننگی تلوار بن جاتا ہے اور بہت کچھ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ چاچو سلیمان بے شک کنول سے بہت پیار کرتے تھے، اس پر جان چھڑکتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اصولوں کے آدمی بھی تھے اور ان کے اصول یاسر سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ وہ ایک ایسی فیملی کے سربراہ تھے جہاں محبت کی شادی کو ایک قابل مذمت فعل تصور کیا جاتا تھا اور اگر ایسی شادی خاندان سے باہر ہو تو پھر اور بھی ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔ یاسر کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کنول کے سچ نے اس کے لئے زبردست قسم کی مشکلات پیدا کر دی ہیں اور اب وہ ان میں گھری ہوئی ہے۔

کسی وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ کنول کو فون کرے، اس سے گھر کے حالات پوچھے اور پھر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اسے مشورہ دے۔ لیکن وہ اسے سختی سے منع کر چکی تھی۔ وہ اپنے حالات سے اپنے طور پر نمٹنا چاہتی تھی۔ سوچتے سوچتے یاسر کے پردۂ تصور پر کنول کی والدہ کی شبیہہ اُبھرتی۔ ایک مجسم ماں...... مہربان مسکراہٹ اور نمناک آنکھوں والی وہ عورت جو ہمہ وقت محبت کی پھوار میں بھیگی نظر آتی تھی۔ یاسر سوچتا کیا وہ ماں اپنی بیٹی کے درد کو سمجھ سکے گی؟

وہ یقیناً اس درد کو سمجھتیں لیکن وہ ایک دوسرے درد کے گھیرے میں تھیں۔ خالہ اور بھانجے کے رشتے نے انہیں اپنے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ انہوں

نے خاور کو ہمیشہ بیٹے کی طرح دیکھا تھا اور بیٹے ہی کی طرح دیوانہ وار چاہا تھا۔ وہ ان سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ رات دن اس کے غم میں ہلکان ہوتی تھیں۔ رو رو کر انہوں نے اپنی آنکھیں تباہ کر لی تھیں۔ انہیں اب بھی آس تھی کہ وہ لوٹ آئے گا اور وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما سکیں گی۔

وہ یہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ کنول خاور کی بجائے کسی اور کی ہو جائے۔ ان کے لئے کنول کے خیالات سے اتفاق کرنا ممکن نہیں تھا۔ کنول کے اصرار سے انہیں جو صدمہ پہنچنا تھا اس کا تصور ہی یاسر کے لئے سوہانِ روح تھا۔ وہ بڑے دُکھ سے سوچتا، کاش وہ خالہ سعدیہ، خاور اور کنول کے درمیان نہ آیا ہوتا۔

وہ ایک چمکیلا دن تھا، شام کو کام سے فارغ ہو کر وہ لمبی واک پر نکل گیا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی کہ چلنے سے اسے سکون ملتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔

وہ نیپون ہوٹل کی طرف جانے والی سڑک پر چلتا رہا۔ ساتھ ساتھ وہ دنوں کا حساب جوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کنول سے آخری گفتگو ہوئے اب 19 دن ہو چکے تھے یعنی آدھے سے زیادہ سفر ابھی باقی تھا۔ اس نے چھ ہفتے کا کہا تھا اور چھ ہفتوں کے قریباً 42 دن بنتے تھے۔ مگر 42 دن کے بعد کیا ہوگا؟ اس بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیا 42 دن پورے ہونے کے فوراً بعد کنول اسے فون کرے گی؟ کیا اس کے بعد بھی وہ فون نہیں کرے گی؟ کیا اس کے بعد وہ مزید انتظار کے لئے کہے گی؟ ایسے بے شمار سوال ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

یہ ایک خوش رنگ شام تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں پانی کا لمس تھا اور جھومتے پاموں کے نیچے خوش لباس جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلتے تھے۔ کبھی اس فٹ پاتھ پر...... بلند عمارتوں کے سائے میں...... کنول اور یاسر بھی اسی طرح چلے تھے۔

اچانک وہ رک گیا۔ بے خیالی میں وہ کافی آگے نکل آیا تھا۔ وہ تھوڑا سا مزید چلتا تو نیپون ہوٹل کی عمارت اسے نظر آنے لگتی۔ ہوٹل کی عمارت نظر آتی تو پھر گرجا گھر بھی نظر آتا، تکہ شاپ بھی نظر آتی، سبز بورڈ والا وہ پی سی او بھی نظر آتا جسے دیکھنے کی کوشش میں اس کی پشت پر چنگاریاں بکھر گئی تھیں۔ وہ سارا ماحول دکھائی دیتا جو یاسر دیکھنا نہیں چاہتا تھا، جسے کنول کے بغیر دیکھنا یاسر کے لئے بے حد تکلیف کا باعث تھا۔

وہ واپس مڑ گیا اور اپنی رہائش گاہ کی طرف چل دیا۔ اس کا آفس کولمبو۔3 (آر روڈ) پر تھا۔ آفس سے صرف ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر وہ عالیشان عمارت تھی جسے ملازمین کی رہائش کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

یاسر اپنے کمرے میں واپس پہنچا تو نم (نعیم) پہلے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نم کے چہرے پر نظر پڑتے ہی یاسر چونک گیا۔ اس کی چھٹی حس نے کہا کہ نم کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔

"کیا بات ہے؟" یاسر نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بات تو بڑی خاص ہے۔" نم کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"کیا کسی لڑکی نے تیرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کیا ہے؟"

"نہیں...... اس بات کا تعلق تجھ سے ہے۔" نم کا لہجہ بدستور سنجیدہ تھا۔

"یار کیوں سسپنس پیدا کر رہے ہو؟"

نم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "خبر شاید تمہارے لئے زیادہ اچھی نہ ہو...... کینڈی میں کنول کے منگیتر صاحب کا سراغ مل گیا ہے۔"

یکلخت ایک سرد لہر سی یاسر کے سراپے میں دوڑ گئی۔ اس نے نم کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں سنجیدگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" یاسر نے بے ساختہ کہا۔

نم کمپیوٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری میل آئی ہے...... پڑھ لو۔"

نم کو بے یقینی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے یاسر کمپیوٹر کی طرف بڑھا۔ اس نے لرزتی انگلیوں سے میل باکس کے لئے "Log in" کیا۔ وہاں کنول کی طرف سے بھیجی گئی ای میل موجود تھی۔ یاسر پتھرائی نظروں سے پڑھتا چلا گیا۔

کنول نے رسمی کلمات کے بعد لکھا تھا۔

"میں نے کل کئی بار تمہیں فون کیا مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ آج صبح بھی کوشش کرتی رہی ہوں۔ یاسر! یہاں کینڈی میں صورت حال تبدیل ہوئی ہے۔ پرسوں رات خاور کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ ڈمبولا کے ایک تھیٹر میں موجود تھا۔ اس کا پتہ چلنے کے بعد چاچو اور کمار بھائی فوراً ڈمبولا گئے اور اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ پتہ نہیں کہ تم اس خبر کو کس انداز میں

لو گے۔ خود میں بھی ابھی تک بہت کنفیوژڈ ہوں۔ کل یا پرسوں تم سے پھر رابطہ کروں گی۔"

الفاظ یاسر کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ اردگرد کی ہر شے نگاہوں میں گھومتی محسوس ہوتی تھی۔ "کیا واقعی ایسا ہو گیا ہے؟" اس کے سینے سے کراہ نکلی۔

اس کے ساتھ ہی کنول کا چہرہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اس کے تصور میں آ گیا۔ آج پہلی بار یہ چہرہ ایک چلمن کی اوٹ میں تھا۔ یہ چلمن دوریوں کی علامت تھی ...... یہ چلمن بتا رہی تھی کہ کنول کا اصل حقدار آ گیا ہے۔ اس کے آتے ہی سب کچھ بدل گیا ہے۔ موسموں کے سارے تیور اور ہواؤں کے سارے رخ تبدیل ہو گئے ہیں۔

یاسر کی معلومات کے مطابق کنول کی شادی کا مسئلہ کچھ عرصہ پہلے ان کے گھرانے میں بہت ڈسکس ہوا تھا۔ کنول کی دادی ماں کی پُرزور خواہش تھی کہ ان کی پوتی ان کی آنکھوں کے سامنے دلہن بنے۔ دوسری طرف واقعہ یہ ہوا تھا کہ خاور منظر سے اوجھل ہو گیا تھا اور شادی غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی ہو گئی تھی۔ دور دور تک اس بات کے آثار نظر نہیں آتے تھے کہ دادی ماں کی زندگی میں کنول کی شادی ہو سکے گی۔ بحث مباحثے کے بعد کنول، کنول کی والدہ، باجی سلطانہ اور چاچو سلیمان کے درمیان جو بات طے ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ کنول کی والدہ کی خاطر ایک مقررہ مدت تک خاور کو تلاش کیا جائے گا۔ اس مدت میں اگر خاور مل گیا تو کنول اس سے شادی کرے گی۔ دوسری صورت میں کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں گے تاکہ دادی ماں کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے ان کی آرزو پوری ہو جائے۔

اب خاور آ گیا تھا...... طے شدہ فیصلے کے مطابق اب خاور کو دُلہا بنایا جانا تھا۔ خاور کو منانے، ریجھانے اور اس کی ناراضگیاں دور کرنے کی ذمے داری بھی کنول پر ہی تھی اور یہ ناراضگیاں یقیناً دور ہو جانا تھیں کیونکہ پوری فیملی اور خاندان کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ کنول اور خاور کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا ہے۔

"اب کیا ہو گا یاسر؟" نم کی دور افتادہ آواز یاسر کے کانوں میں پڑی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" وہ بے خیالی میں بولا۔ اس کا ذہن پتھرایا ہوا تھا۔

"کنول سے ملنے کی کوشش کرو...... تاکہ صحیح صورتحال کا پتہ چلے۔"

"صحیح صورتحال؟"

"ہاں بھئی ...... ہوسکتا ہے کہ ای میل بوگس ہو۔ فرضی ایڈریس سے کسی کو بھی میل بھیجی جاسکتی ہے۔ میں نے خود دو تین بار ایسا کیا ہے۔ بلکہ ایک ایسی میل تو میں نے آج صبح بھی بھیجی ہے۔"

"کسے؟"

"ایک دوست کو...... وہ بڑا اُلو کا پٹھا ہے...... پاکستان سے آیا ہے، کولمبو جیسے رنگین شہر میں انجوائے کرنے کی بجائے عشق کر بیٹھا ہے۔ یعنی کھوتا ہی کھوہ میں ڈال بیٹھا ہے ...... اب حسینوں کے میلے میں بھی سوامی بنا بیٹھا ہے اور دن رات آہیں بھرتا ہے...... ہائے کنول، وائے کنول۔"

یاسر نے چونک کر نم کی طرف دیکھا۔ نم کے سرخ چہرے پر شرارت ناچ رہی تھی۔ ایک دم یاسر کی بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی کا سیلاب اُمڈ آیا۔ اس کا ٹھٹھرا ہوا دل پھر زندگی کی حرارت سے دھڑ دھڑ دھڑکنے لگا تھا۔ وہ چیل کی طرح نم پر جھپٹا۔

"اوئے خبیث ...... فراڈیئے...... میرا آدھا خون خشک کر دیا تو نے ...... ایک نمبر کا نوسر باز ہے تُو...... میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ کنول نے فون پر بات کیوں نہ کی۔"

قریباً ایک منٹ تک دونوں بیڈ پر کشتی لڑتے رہے، پھر ہانپ کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ نم نے کہا۔

"دیکھو میں نے شرارت ضرور کی ہے لیکن اس میں بھی تمہاری بہتری کا پہلو ہے۔ یہ ای میل پڑھنے کے بعد تمہارے دل میں ایک دم تڑپ پیدا ہوئی ہے۔ تمہارے اندر محبت نے زلزلہ جگایا ہے، تمہارے دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں اور سستی کے کیڑے جھڑ گئے ہیں..... جھڑ گئے ہیں یا نہیں؟"

یاسر ایک بار پھر اس پر جھپٹا لیکن وہ جست لگا کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

لاہور میں وہ دونوں بہت زیادہ بے تکلف نہیں تھے مگر پردیس نے انہیں تیزی سے قریب کیا تھا۔ دونوں یہاں روم میٹ بھی تھے ...... اب نم نہ صرف یاسر کا رازداں تھا بلکہ اکلوتا اور اہم ترین مشیر بھی تھا۔

☐●☐

یہ اگلے روز کی بات ہے ...... یاسر تھوڑی سی شاپنگ کرنے کے لئے "کرس کیٹ" میں گیا۔ یہ شاپنگ مال بھی ان جگہوں میں سے تھا جہاں جاتے ہوئے اس کا دم گھٹتا تھا۔ کرس کیٹ کے فوڈ سٹی میں بیٹھ کر کنول اور یاسر نے درجنوں مرتبہ ایگ فرائڈ رائس اور چلی چکن کھایا تھا، میوزک سنا تھا اور سرگوشیاں کی تھیں۔ بہرحال کرس کیٹ میں آنے کے باوجود وہ یہاں کے ریسٹورنٹ یعنی "فوڈ سٹی" کا رخ نہیں کرتا تھا۔

وہ گراؤنڈ فلور پر ریڈی میڈ گارمنٹس کے ایک شوکیس میں جھانک رہا تھا جب اچانک کسی نے عقب سے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خوشبو کا ایک دلفریب جھونکا یاسر کے نتھنوں میں داخل ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ راکیل تھی۔ پولینڈ کی وہی تتلی جو اپنے خوبصورت رنگوں کے ساتھ نیپون ہوٹل میں منڈلاتی اُڑتی تھی۔ اس کا بھرا بھرا جسم پینٹ اور شرٹ میں کسا ہوا تھا۔ رنگ دار گلاسز اس کے ریشمی بالوں میں اٹکے تھے ...... وہ سرتاپا مسکرا رہی تھی۔

"ہیلو یاسر......" وہ جوش و خروش سے بولی۔ "مجھے پوری امید تھی کہ تم سے ملاقات ضرور ہوگی۔"

یاسر کا بلڈ پریشر شاید لو ہوگیا تھا۔ اس نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہیلو، کیسی ہو راکیل ...... تت...... تمہیں دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی ہے۔"

"تم ایک نمبر کے بے وفا ہو یاسر! مجھے بتائے بغیر ایک دم ہی غائب ہو گئے۔" وہ خوشی کے عالم میں یاسر کے اوپر چڑھتی آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بغلگیر ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔

یاسر نے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "میں جاتے وقت تم کو بتانا چاہتا تھا لیکن صورتحال ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی......"

راکیل کے ساتھ باتیں کرتے کرتے وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ راکیل کے ساتھ آخری ملاقات میں ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی اور اسے شاد آ گیا تھا۔ کینڈی روانہ ہونے سے ایک رات پہلے وہ شاپنگ کر کے ہوٹل لوٹا تھا۔ ہوٹل کی سیڑھیوں پر راکیل توپ کے گولے کی طرح اس سے آ ٹکرائی تھی۔ بعد ازاں اس نے یاسر سے آٹھ سو سری لنکن روپے ادھار مانگ لئے تھے اور یاسر کو بتایا تھا کہ وار سارے اس کی رقم آنے ہی والی ہے، وہ سارے روپے لوٹا دے گی۔ یاسر نے اسے یہ قرض دے دیا تھا...... اور پھر اس خوف سے کہ راکیل یہ قرض کسی ''اور صورت'' میں چکانے کی کوشش نہ کرے، رات گئے تک بے چین رہا تھا۔ صبح سویرے وہ راکیل کے ''متھے لگے'' بغیر کینڈی چلا گیا تھا اور آج قریباً دو مہینے بعد وہ کرس کیٹ میں پھر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''تم کینڈی ہی گئے تھے یا کہیں اور چلے گئے تھے؟'' وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''چند دنوں کے لئے پاکستان بھی گیا تھا۔'' یاسر نے سچ بولا۔

''چلو آؤ، آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ میرا ہوٹل یہاں پاس ہی ہے۔ وہ سامنے نیلی بلڈنگ کے ساتھ۔''

''لل...... لیکن...... اس وقت تو میں بہت جلدی میں ہوں۔ تم مجھے ایڈریس دے دو۔'' وہ یوں گھبرایا ہوا تھا جیسے قرض خواہ کی بجائے قرض دار ہو اور راکیل نے سرِ راہ اُسے کلائی سے پکڑ لیا ہو۔

ایک دم جیسے راکیل کو کچھ یاد آیا۔ اس نے جلدی سے یاسر کی کلائی چھوڑی اور اپنا لال گلابی ہاتھ اپنے براؤن شولڈر بیگ میں گھسیڑ دیا۔ کچھ دیر بعد اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں پورے گیارہ سو سری لنکن روپے تھے۔

''یہ کیا ہے؟'' یاسر نے پوچھا۔

''یہ وہ روپے ہیں جو میں نے قرض لئے تھے۔ 300 روپے گفٹ سینٹر پر لئے تھے اور 800 نیپون ہوٹل کی سیڑھیوں میں۔ تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ۔''

یاسر نے رسمی انکار کے بعد روپے رکھ لئے۔ وہ گفٹ سینٹر والے 300 روپے تو

تقریباً بھول ہی چکا تھا۔ راکیل کے برتاؤ نے اسے متاثر کیا تھا بلکہ کسی حد تک حیران بھی کر دیا تھا۔ اسے دس فیصد بھی امید نہیں تھی کہ راکیل اسے کچھ واپس لوٹائے گی۔ اس کا مطلب تھا کہ پچھلے دنوں وہ واقعی تنگ دست تھی۔

اس نے یاسر کو بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''چلو آؤ نیچے فوڈ سٹی میں بیٹھتے ہیں۔ کچھ کھاتے پیتے ہیں۔''

وہ اسے کیسے بتاتا کہ یہاں کے فوڈ سٹی سے وہ الرجک ہو چکا ہے۔ وہ اپنے بہانے پر قائم رہا۔ اس نے کہا کہ فی الوقت وہ بہت جلدی میں ہے۔ کل یا پرسوں کسی وقت وہ اس سے ملنے آئے گا۔

''تم فقط جان چھڑا رہے ہو۔'' وہ اسے ناراض نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں راکیل! وعدہ رہا کہ میں آؤں گا۔''

''تو پھر ہاتھ ملاؤ۔'' اس نے اپنا لال گلابی ہاتھ آگے بڑھایا۔ یاسر نے ذرا جھجک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کب آؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''اچھا کل شام۔''

اس نے شوخی آمیز پھرتی سے یاسر کی چیسٹ پاکٹ میں اپنا دوسرا ہاتھ ڈالا اور بڑی صفائی سے اس کے آفس کا شناختی کارڈ نکال لیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ آفس کا فون نمبر، ایڈریس وغیرہ نوٹ کر چکی تھی۔

''تمہارا کوئی نہ کوئی سراغ تو ہاتھ میں ہونا چاہئے۔'' وہ دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''کارڈ مجھے واپس مل جائے گا یا یہ ضمانت کے طور پر تمہارے پاس رہے گا؟'' یاسر نے پوچھا۔

''اوہ سوری......'' وہ اسے کارڈ لوٹاتے ہوئے بولی۔ پھر ذرا سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ''اگر تم آؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اگر نہ آ سکو تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔''

''بھئی کہا تو ہے کہ آؤں گا۔''

□●□

اگلے روز شام کو یاسر فارغ تھا۔ اس نے سوچا کہ راکیل کا شکوہ دور کر دینا چاہئے۔ وہ ٹک ٹک پر بیٹھا اور وعدے کے مطابق اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں راکیل قیام پذیر تھی۔ کریسنٹ نامی یہ ہوٹل فائیو اسٹار تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نیپون ہوٹل کی تنگ دست لڑکی اب واقعی ایک خوشحال ''میڈم'' ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے یاسر نے اسے فون کر دیا تھا۔ وہ بالکونی میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

پہلے انہوں نے لابی میں گپ شپ کی پھر کمرے میں آ بیٹھے۔ کھانے پینے پر جو خرچ ہو رہا تھا وہ ظاہر ہے کہ راکیل ہی کر رہی تھی اور کھلے دل سے کر رہی تھی۔ یاسر کو شرمندگی محسوس ہونے لگی کہ وہ نیپون ہوٹل میں راکیل کے حوالے سے کس طرح کے خیالات رکھتا رہا ہے۔ اس کا گمان تھا کہ راکیل مفلوک الحال طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا کام سادہ لوح لوگوں کو ٹھگنا ہے یا پھر روزی روٹی کے لئے اپنا جسم فروخت کرنا ہے۔ لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ راکیل نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ زیادہ تر سچ تھا۔ یاسر نے راکیل سے کہا۔

''تمہارا ارادہ انڈیا جانے کا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ سات آٹھ ہفتے وہاں رہو گی۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں انڈیا سے ہی آ رہی ہوں مسٹر یاسر! تین چار روز پہلے ہی یہاں پہنچی ہوں۔ انڈیا اور پاکستان بہت اچھے ملک ہیں اور دیکھنے کے قابل ہیں۔ انڈیا رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا ملک ہے...... اور میرا خیال ہے کہ اسے دیکھنے کے لئے چھ سات ہفتے تو بالکل ناکافی ہیں۔ میں بس تاج محل، لال قلعہ، فتح پور سیکری اور مغل بادشاہوں کے چند مزار ہی دیکھ پائی ہوں۔''

''اچھا...... تمہارے دوست راجر کا کیا بنا؟ اس سے صلح ہوئی یا نہیں؟'' یاسر نے پوچھا۔

''پچاس فیصد ہو گئی ہے۔ باقی پچاس فیصد تب ہو جائے گی جب وہ یہاں آئے گا اور ہم ایک کمرے میں رہیں گے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

''راجر کہاں ہے آج کل؟'' یاسر نے پوچھا۔

''وہ ملائشیا سے سنگاپور آ چکا ہے۔ اپنے رویے پر وہ کافی نادم ہے اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے بھی اپنی غلطیاں محسوس ہو رہی ہیں۔ کچھ دیر کے لئے دور دور رہنے کا یہی تو

فائدہ ہوتا ہے۔ بندے کو ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔''

''کب آ رہا ہے وہ؟''

''میرا خیال ہے کہ ابھی دس پندرہ روز لگ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے وہاں عارضی طور پر کوئی گرل فرینڈ پال لی ہو۔ ایسی لڑکیوں سے پیچھا چھڑانے میں تھوڑا سا ٹائم تو لگتا ہی ہے۔'' وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

رات نو بجے کے قریب یاسر نے راکیل سے رخصت چاہی۔ راکیل نے شرط رکھی کہ وہ پرسوں ضرور اس سے ملنے آئے گا۔ یاسر نے بہت پوچھا کہ ''پرسوں'' میں کیا خاص بات ہے لیکن راکیل نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ بس بضد رہی کہ وہ پرسوں ضرور آئے۔

اگلے روز شام کے فوراً بعد کنول کا فون آ گیا۔ کنول نے یاسر کی قیام گاہ پر کال کی تھی۔ یاسر نے کنول کی آواز ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ سنی۔

''بھئی ابھی تو جدائی کا چلّہ پورا ہونے میں کافی دن باقی ہیں۔'' یاسر نے اسے یاد دہانی کروائی۔

''زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں...... میں نے صرف امی کے کہنے پر تمہیں فون کیا ہے۔ وہ تمہیں آج کل بہت یاد کرتی ہیں۔ پتہ نہیں تم نے کیا جادو کیا ہے ان پر؟''

''خدا کی قسم میں جادوگر نہیں ہوں۔''

''تم کسر نفسی سے کام لے رہے ہو۔ تھوڑے بہت جادوگر تو تم ہو۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

''خیر چھوڑو...... کیا کہہ رہی تھیں خالہ جان؟''

''بس یہی کہ یاسر بیٹے کو فون کرو۔ کئی دنوں سے اس کا پتہ نہیں۔ اس کی خیر خبر لو۔''

''تو پھر لو نا آ کر خیر خبر۔'' یاسر نے شوخی دکھائی۔

''خبر تو تمہاری چاچو لیں گے۔ ان کی اچھی بھلی بھتیجی کا ستیاناس کر دیا ہے تم نے...... کسی کام کی نہیں رہی ہے۔ وہ ایک دم آگ بگولا ہیں تم پر۔''

"سچ......؟" یاسر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

وہ ہنسی تو جیسے جلترنگ بج اٹھے۔ کھڑکیوں سے باہر پورا کولمبو مسکراتا ہوا محسوس ہوا۔ چند لمحے بعد وہ اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

"نہیں...... اب ایسی بھی بات نہیں۔ حالات کافی بہتر ہیں اور آئندہ آٹھ دس دن میں مزید بہتر ہو جائیں گے۔ میں اگلے ہفتے تمہیں پھر فون کروں گی۔"

"دیکھو کنول! تم مسلسل پہیلیاں بوجھوا رہی ہو۔"

"ساری پہیلیوں کا حل ایک ہی مرتبہ بتاؤں گی۔"

"ان میں تمہارے والی پہیلی بھی شامل ہے؟"

"دیکھو شرارت نہیں۔ میرے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ بس تمہاری خیریت دریافت کرنا چاہتی تھی...... تمہاری طرف سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" اس نے معصوم سادگی سے پوچھا۔

"دو دن پہلے لاہور سے ابو جان کا فون آیا تھا۔" یاسر نے بتایا۔ "کہہ رہے تھے کہ بھئی جلدی سے شادی کر لو۔ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے۔"

"لگتا ہے کہ تمہاری نسبت انکل زیادہ سمجھدار ہیں۔"

"تمہارے مطلب کی بات جو کر رہے ہیں۔"

کچھ دیر تک ایسی ہی ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا...... یاسر نے فون بند کیا ہی تھا کہ ایک بار پھر گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے یہی سمجھا کہ کنول کو پھر کوئی بات یاد آ گئی ہے لیکن اس مرتبہ دوسری طرف یاسر کے ابو تھے۔ دو دن پہلے بھی فون پر ان سے بات ہوئی تھی اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہفتے کو پھر فون کریں گے۔ محسوس ہوتا تھا کہ انہیں واقعی یاسر کے "ہاتھ پیلے" کرنے کی جلدی پڑ گئی ہے۔ شاید انہیں فکر لاحق ہو گئی تھی کہ سری لنکا کے "خوبصورت ساحل" ان کے بیٹے کو چاروں طرف سے گھیر کر اپنے اندر گم نہ کر لیں۔

کہنے لگے۔ "بیٹا جی! پھر کیا سوچا ہے ہماری بہو رانی کے بارے میں؟"

"آپ نے کیا سوچا ہے؟" یاسر نے بھی مسکراتے لہجے میں کہا۔

"میں نے تو کچھ نہیں سوچا...... لیکن لگتا ہے کہ تمہاری بہن کچھ نہ کچھ سوچ رہی

ہے۔ کہتی ہے کہ کالج میں اس کی ایک کلاس فیلو اسے بہت پسند ہے۔"

"لیکن ابو...... شادی تو میں نے کرنی ہے۔ شمائلہ نے نہیں۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"یعنی تم پہلے لڑکی کو محدب عدسے سے دیکھنا چاہتے ہو؟"

"خیر ایسی بھی بات نہیں ابو...... مگر پھر بھی......" اس نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

"دیکھو بھئی شادی کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ پہلے محبت کرو، پھر شادی کر لو یا پھر پہلے شادی کر لو، پھر محبت شروع کر دو۔ ویسے جب دو اچھے لوگ اکٹھے ہوں اور ایک ہی چھت کے نیچے ہنسی خوشی رہنا شروع کریں تو محبت ہو ہی جاتی ہے بلکہ شاید یہ محبت حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔"

"آپ کے اس فلسفے پر ضرور غور کروں گا۔" یاسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یاسر کے والد ذرا سا چونک کر بولے۔ "کیا بات ہے بیٹا جی! کہیں بقول شمائلہ تم پر سری لنکن دوشیزاؤں نے واقعی ڈورے ڈالنے شروع تو نہیں کر دیئے؟"

"لوگ سچ کہتے ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ابوؤں کو بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں کی بات پر اعتماد ہوتا ہے۔"

اس دوران میں شمائلہ بھی فون پر آ گئی۔ تھوڑی دیر تک اس سے چونچ لڑانے کے بعد یاسر نے اسے خدا حافظ کہہ دیا۔



راکیل سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق یاسر دوسرے روز شام کو ہوٹل کریسنٹ پہنچا۔ راکیل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ آج راکیل کی سالگرہ ہے اور وہ اسے سرپرائز ڈنر دینا چاہتی ہے۔ شیشے کی گول تپائی پر چھوٹا سا خوبصورت کیک بھی رکھا تھا۔ طویل شیلف پر وہ چند خوبصورت کارڈ رکھے تھے جو راکیل کو پولینڈ، اٹلی اور دیگر کئی ممالک سے آئے تھے۔ وہ خود بھی آج بڑی بنی ٹھنی نظر آ رہی تھی۔ وہ گلابی رنگ کے نہایت قیمتی گاؤن میں تھی جس پر ستارے جھلملا رہے تھے۔

"تم آج کی تقریب کے اکلوتے مہمان ہو۔" وہ دلنشین انداز میں مسکرا کر بولی۔

"عزت افزائی کا بہت شکریہ۔" یاسر نے کہا۔

اس دوران میں ابوظہبی سے راکیل کا فون آ گیا۔ امارات ایئر لائنز کا کوئی کیپٹن تھا۔ جسے راکیل سویٹ انکل کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ وہ اسے سالگرہ کی مبارکباد دے رہا تھا۔ یاسر نے موقع غنیمت جانا اور راکیل کو گفتگو میں مصروف چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ گراؤنڈ فلور پر شاپنگ سینٹر تھا۔ ایک تامل سیٹھ کی دکان سے اس نے راکیل کے پسندیدہ پرفیوم "فار ایور" کی ایک بوتل خریدی اور بھاگم بھاگ کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ راکیل پریشانی کے عالم میں دروازے پر کھڑی تھی۔

"میں تو سمجھی کہ تم پاکستان واپس چلے گئے ہو۔"

"سالگرہ مبارک......" یاسر نے اسے بوتل پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو ویری مچ۔" وہ نہال ہو کر بولی۔ یاسر نے عقلمندی یہ کی تھی کہ تحفہ اسے کوریڈور میں ہی پیش کر دیا تھا۔ ورنہ تھینک یو کے بعد وہ اس سے لپٹنے کی کوشش بھی کر سکتی تھی اور اس سے ذرا آگے کا بھی سوچا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے میں آ گئی کیک کاٹا، کھانا کھایا۔ یاسر اورنج جوس پیتا رہا۔ وہ الکحل سے دل بہلاتی رہی۔ تاہم آج اس کے ہاتھ میں سری لنکا کی سستی "لائن بیئر" نہیں تھی، فرانس کی مہنگی شیمپین تھی۔ آڈیو سسٹم پر تازہ ترین انگلش میوزک بج رہا تھا۔ ڈرم کی آواز در دیوار سے لے کر ہڈیوں کے گودے تک میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ راکیل اب بہت ایزی موڈ میں تھی۔ کچھ دیر بعد یاسر نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا سینہ دھک سے رہ گیا۔ راکیل نے چمکیلے ستاروں والا نیلا گاؤن اتار دیا تھا۔ اب وہ مختصر سے لباس میں نظر آ رہی تھی۔ یہ تیراکی کے لباس جیسی شے تھی۔ جہاں سے بازو اور ٹانگیں شروع ہوتی تھیں وہیں پر یہ ختم ہو جاتی تھیں۔ یاسر کے ذہن میں کئی اندیشے جاگے۔ اس کے کانوں میں مائیکل جیکسن کا نغمہ گونجنے لگا۔ وقت گزر ہی جاتا ہے' ایسے بھی اور ایسے بھی، لطف اٹھا لو...... لطف اٹھا لو۔

کہیں یہ فتنہ گر حسینہ آج بھی بہ زبان خاموشی اسے وہی نغمہ تو نہیں سنا رہی تھی؟ الکحل کی حرارت اس کے چہرے پر نظر آ رہی تھی اور آنکھوں میں بہکی بہکی کیفیت تھی۔ بہر حال...... اگلے پانچ دس منٹ خیریت سے ہی گزرے۔ راکیل کا رویہ شائستہ ہی رہا

لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی کہ اس نے اپنے غیر شائستہ لباس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ یاسر کو یوں لگ رہا تھا کہ راکیل نے ایک سمجھدار مدعی کی طرح اپنے جسم کو یل کرنے کے بعد خاموشی اختیار کر لی ہے۔ واقعی اسے بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ ں کا جسم بول رہا تھا اور بڑی مہارت سے بول رہا تھا۔

وہ باتیں کرتے رہے۔ باتوں کے ساتھ ساتھ یاسر یہ بھی سوچتا رہا کہ یہاں سے بد از جلد کیسے اٹھا جا سکتا ہے۔ راکیل کا رویہ بدستور مبہم تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ں نے سب کچھ یاسر پر چھوڑ دیا ہے۔ یعنی اگر وہ آگے بڑھنا چاہے تو بڑھ جائے۔ ر نہ بڑھنا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ آڈیو سسٹم پر جو میوزک اودھم مچا رہا تھا وہ ہایت ہیجان خیز تھا۔ سنگر کوئی بھی ہو، بول کوئی سے بھی ہوں لیکن بنیادی تھیم یہی تھی۔ ندگی خوبصورت ہے...... لطف اٹھا لو...... لطف اٹھا لو۔

یاسر نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ دو فلور نیچے سوئمنگ پول کا نیلا پانی چمک رہا تا۔ اوپر آسمان پر بادل تھے۔

"لگتا ہے بارش شروع ہونے والی ہے۔" یاسر نے کہا۔

"تو پھر آج رات یہیں رہ جاؤ۔ اپنے روم میٹ کو فون کر دو کہ نہیں آ سکتے۔" وہ ر کا سرد ہاتھ اپنے گرم ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولی۔ آنکھوں میں نشہ تھا اور نشے میں یک عالمگیر پیغام تھا۔

"سوری...... مجھے جانا ہوگا۔" یاسر نے کہا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ راکیل نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ وہ صوفے پر نیم راز تھی۔ اسی حالت میں باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی یاسر پر انکشاف ہوا کہ دوسری رف اس کا بوائے فرینڈ راجر ہے۔ وہ اسے سنگاپور سے کال کر رہا تھا اور سالگرہ کی بارک باد دے رہا تھا۔ راکیل کی آواز میں عجیب سا لوچ آ گیا تھا۔ دو تین منٹ کی فتگو میں اس نے کئی بار ماؤتھ پیس کو چوما اور راجر کو اپنی والہانہ محبت کا یقین دلایا۔ اس سے بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ سری لنکا میں شدت سے اس کی منتظر ہے۔ اس ت یاسر صرف چار پانچ فٹ کے فاصلے پر موجود تھا اور کمرے کا منظر رومان انگیز ہو ا تھا۔ یہ کیسی منافقت تھی۔ یہ قول و فعل کا کیسا تضاد تھا؟ عین ممکن تھا کہ دوسری

طرف راجر کے پہلو میں بھی کوئی لڑکی موجود ہو۔ وہاں بھی شراب کی بوتل کھلی ہوئی ہو۔ یہ جدا معاشرے کے لوگ تھے۔ یہاں محبت اور وفا کے معیار بھی جدا تھے۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے تھے اور ان کے نجی ''معاملات'' بھی ہوتے تھے وہ ایک چھت تلے ازدواجی زندگی گزارتے تھے لیکن تعطیلات گزارنے کے لئے کسی دوسرے کی بیوی یا کسی دوسرے کے شوہر کو منتخب کرتے تھے۔ یہ ایک راجر یا ایک راکیل کی بات نہیں تھی، سارا مغرب اس رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد یاسر، راکیل سے رخصت ہو رہا تھا۔

''میں تمہیں لفٹ تک چھوڑنے جاؤں گی۔'' راکیل اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''اس حالت میں؟'' یاسر نے اس کے مختصر لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے ستاروں والا نیلا گاؤن اوڑھ لیا۔ گاؤن کی موتیوں والی ڈوریاں دونوں طرف لٹک رہی تھیں۔ یہ ''صورتحال'' بھی نیم عریانی میں ہی آتی تھی ...... اور نیم عریانی کبھی کبھی عریانی سے بڑھ کر خطرناک ہوتی ہے۔

وہ کوریڈور میں آئے اور لفٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ راکیل نے یاسر کے بازو کا سہارا لے رکھا تھا اور ڈگمگاتی ہوئی سی چلتی تھی۔ اچانک یاسر کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ اس نے کنول کے چاچو سلیمان کو دیکھا۔ وہ دو سوٹڈ بوٹڈ سری لنکن حضرات کے ساتھ لابی کے ایک ریستوران کے پاس کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ یاسر ان کی نظر سے بچنے کی کوشش کرتا وہ اسے دیکھ چکے تھے۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ چاچو سلیمان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہو کر اوجھل ہو گئے۔ پھر وہ دوسری طرف دیکھنے لگے۔

ایک لمحے کے لئے یاسر نے سوچا کہ وہ سلیمان صاحب کے پاس جائے اور سلام لے لیکن پھر وہ جھجک گیا۔ وہ اکیلے بھی نہیں تھے۔ پتہ نہیں کہ اس سے ملنا چاہتے تھے یا نہیں۔

راکیل بڑی ترنگ میں تھی۔ لفٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے باقاعدہ یاسر کے رخسار کا بوسہ لیا اور پھر الوداعی کلمات ادا کرنے لگی۔ لفٹ کے آنے میں ابھی تھوڑی

دیر تھی۔ یاسر انتظار کرنے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ سلیمان صاحب اس کی طرف آ رہے ہیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس سے تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔

''ہیلو یاسر...... کیسے ہو؟''

''اوہو آپ؟'' یاسر نے ظاہر کیا کہ وہ اس سے پہلے انہیں دیکھ نہیں سکا۔

وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ ''کیا میں تمہارے وقت میں سے چند منٹ لے سکتا ہوں؟'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''کک...... کیوں نہیں جناب؟''

انہوں نے ایک نگاہِ غلط انداز راکیل پر ڈالی۔ راکیل اب واپس جانے کے لئے تیار تھی۔ یاسر نے اس سے رخصت چاہی۔ وہ اسے گڈ بائے کہتے ہوئے واپس اپنے کمرے کی طرف لوٹ گئی۔ سلیمان صاحب کی گمبھیر آواز یاسر کے کانوں میں پڑی۔

''میرے ساتھ آؤ۔''

چند ہی منٹ بعد یاسر ہوٹل کے تھرڈ فلور پر سلیمان صاحب کے کمرے میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ یہاں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے اور پچھلے چوبیس گھنٹے سے اس ہوٹل میں مقیم تھے۔ انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے مین کہا۔

''یاسر! کنول مجھے اتنی عزیز ہے کہ تم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ جو چیز عزیز ہوتی ہے اس کی بھلائی بھی عزیز ہوتی ہے ...... میں چاہتا ہوں کہ تم کنول کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ مجھے وشواس ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گے۔''

''اس وشواس کی وجہ؟'' یاسر نے بھی ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وشواس کی وجہ یہ ہے کہ تم دونوں کئی حوالوں سے ایک دوسرے سے مختلف ہو اور یہ اختلاف معمولی نوعیت کا نہیں ہے۔ کنول ایک سیدھی سادی، سچی، کھری لڑکی ہے۔''

''شاید آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں سچا کھرا نہیں ہوں ...... میں کنول کو دھوکا دے رہا ہوں۔''

''پہلے مجھے شک تھا لیکن اب میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم ایسا کر رہے

ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔'' ان کے لہجے میں تیز آنچ تھی۔

''آنکھیں دھوکا بھی تو دیتی ہیں انکل۔''

''کوئی ضرورت نہیں مجھے انکل کہنے کی۔'' سلیمان صاحب نہایت خشک لہجے میں بولے۔ ''اگر تم میں ذرا سی انسانیت بھی ہے تو میرے تھوڑے کہے کو زیادہ جانو۔ کنول کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ وہ تمہارے لئے نہیں ہے اور نہ تم اس کے لئے ہو۔''

''آپ کے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔''

''تم پیار نہیں دھوکا کرتے ہو۔ جیسے شاید اس ٹورسٹ لڑکی سے کر رہے ہو۔'' سلیمان صاحب کا لہجہ جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا۔ یاسر نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ کی اجازت کے بغیر ایک بار پھر آپ کو انکل ہی کہہ رہا ہوں...... انکل، اپنی صفائی میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہوں گا کہ ابھی جو لڑکی آپ نے دیکھی ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ کسی بھی لڑکی سے میرا اس قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ اب آپ کو دلیل درکار ہوگی۔ لیکن ''سچ'' دلیل اور ثبوت کے بغیر بھی سچ ہی ہوتا ہے...... خدا حافظ۔'' وہ گھوما اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔



یہ تیسرے روز کی بات ہے...... یاسر کینڈی فون کر کر کے ہار چکا تھا۔ وہ کنول سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر ''بات'' تھی کہ کسی صورت ہو ہی نہیں پا رہی تھی۔ کنول کی ہدایت کے مطابق وہ دیدی آشا کے موبائل پر کال کر رہا تھا۔ وہاں سے مسلسل جواب آ رہا تھا کہ ''کوئی جواب نہیں آ رہا۔''

گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ یاسر کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سلیمان صاحب شروع سے اس کے خلاف ہیں لیکن ہفتے کی شب پیش آنے والے واقعے کے بعد ان کی مخالفت نہایت ٹھوس شکل میں سامنے آ گئی تھی۔ انہوں نے یاسر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے اور کنول کو مشترکہ راستے پر ہرگز آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔

کنول اپنے چاچو پر بے حد بھروسہ کرتی تھی۔ یاسر کو ڈر تھا کہ چاچو کی وجہ سے وہ

کسی بڑی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔ اسے اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ راکیل کی طرف جانا اتنا بھی ضروری نہیں تھا۔ پھر شومئی قسمت سلیمان صاحب نے عین اس وقت اسے راکیل کے ساتھ دیکھ لیا تھا جب وہ خرمستی کی حالت میں تھی۔

کنول سے ٹیلیفونک رابطے میں ناکام ہونے کے بعد یاسر نے سوچا کہ اسے خود کینڈی جانا چاہئے۔ ابھی وہ اس سلسلے میں پروگرام ہی بنا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ نم ابھی کچھ دیر پہلے کلب جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ یاسر نے سمجھا شاید وہ کسی وجہ سے واپس آ گیا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کنول کھڑی تھی...... وہ ساڑھی میں تھی۔ بال شانوں پر بکھرے تھے۔ وہ کچھ زرد اور کمزور بھی دکھائی دے رہی تھی۔

''ہیلو یاسر!'' اس نے غمناک آواز میں کہا۔

اس کے لہجے کی تہہ میں چھپے ہوئے دکھ نے یاسر کو دہلا دیا۔

''ہیلو کنول! کیسی ہو؟'' یاسر نے کہا اور اسے اندر آنے کے لئے راستہ دیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کنول کی پلکوں کے پیچھے بہت سا پانی جمع ہے لیکن جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں مہیب ٹھہراؤ تھا۔ اس نے کہا۔

''یاسر! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے...... مجھے گیارہ بجے تک واپس کینڈی پہنچنا ہے۔ پلیز مجھے بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟''

''میں تو خود تمہیں فون کر کر کے تھک گیا ہوں...... کوئی کال ہی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔''

کنول کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''یاسر! تمہیں معلوم ہے میں نے کتنی مشکل سے اپنا اور تمہارا راستہ سیدھا کیا تھا۔ یہ کیا کر دیا تم نے؟ یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ پلیز یاسر! بتاؤ مجھے، یہ سب کیا ہوا ہے؟''

''چاچو نے تمہیں کیا بتایا ہے؟''

''چاچو نے بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن یاسر! انہیں دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے۔ میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے بتاؤ کہ کیا بات تھی؟ پلیز یاسر...... پلیز......'' وہ اب باقاعدہ

روہی تھی۔ سری لنکا کے سارے ساحلوں کا سارا پانی اس کی سیاہ آنکھوں میں تھا۔

یاسر یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک ٹھہری ہوئی سی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

"لیکن کنول! میرے صفائی پیش کرنے سے کیا ہوگا؟ میں تو چاچو کی طرح تمہاری نظر میں بھی جھوٹا ہوں۔"

"یاسر! یہ طعنے دینے کا وقت نہیں ہے۔"

یاسر نے اپنی آنکھوں میں اُمڈ نے والی نمی کو الٹے ہاتھ سے صاف کیا اور کنول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جو میں کہوں گا اس پر یقین کرنا ہوگا۔"

"ہاں...... میں کروں گی یقین۔"

"اگر میں کوئی ثبوت نہ دوں تو بھی یقین کرلو گی؟"

"اگر تم کہتے ہو تو کرلوں گی۔"

"وعدہ؟"

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ "وعدہ۔"

یاسر نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "اس سیاح لڑکی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے کنول! نیپون ہوٹل میں تمہارے جانے کے بعد اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ روپے دھار لئے۔ اس کے بعد بھی ہماری ایک دو ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ ویسی ہی ملاقاتیں تھیں جیسی کسی بھی راہ چلتے شخص سے ہوسکتی ہیں۔ چار پانچ روز پہلے وہ کرس کیٹ کے سامنے مجھے دوبارہ ملی۔ اس نے میرے روپے مجھے لوٹا دیئے۔ اب میرے اور اس کے درمیان کوئی تعلق واسطہ نہیں۔"

کنول یاسر کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں ہولے ہولے رس رہی تھیں۔ شاید اس کا خیال تھا کہ یاسر اور بھی کچھ کہے گا۔ مگر وہ خاموش رہا۔ وہ اپنا بیان دے چکا تھا اور اسے صرف بیان ہی دینا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی شہادت یا ثبوت نتھی نہیں کرنا تھا۔

"تم نے میری بات پر یقین کرلیا؟" یاسر نے کہا۔

چند لمحے گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ پھر کنول نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے موتی جھڑے۔ جیسے پام کے پتوں سے بارش کا پانی جھڑتا ہے۔ پھر جیسے لچکیلا پام، منہ زور ساحلی ہوا سے دہرا ہو کر اپنے ساتھی پام سے گلے ملتا ہے، وہ بھی یاسر کے گلے لگ گئی۔ اس کے جسم کا ریشم ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ یاسر کے گرد اس کی گرفت سخت ہوتی جارہی تھی۔

"میں نے وشواس کرلیا یاسر! تم نے جو کہا میں نے اس پر وشواس کرلیا۔" وہ کہتی رہی اور یاسر کو بھینچتی رہی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ کینڈی جانے کے لئے یاسر سے رخصت ہو رہی تھی۔ جیسے تیز برسات کے بعد آسمان نکھرتا ہے، وہ بھی نکھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پھر سے تازہ عزم نظر آرہا تھا۔ یہی عزم تھا جس کی جھلک یاسر نے کینڈی چھوڑنے سے پہلے کنول کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ یہ عزم کنول کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا تھا...... میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گا۔ میں ہر رکاوٹ دور کرلوں گا۔ میں نے عشق کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ مجھ میں تقدیریں بدل دینے کی طاقت ہے......

اور ساڑھے سات بجے کے لگ بھگ کنول کینڈی واپس روانہ ہوگئی۔ یاسر اسے بس جنکشن تک چھوڑنے گیا۔ انٹرسٹی بس تیار تھی۔ بس چلی تو کنول کھڑکی سے اسے دیر تک دیکھتی رہی۔



وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ کنول سے آخری ملاقات ہوئے اب ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ وہ چھ ہفتوں والا حساب کتاب تو اب کالعدم ہو گیا تھا۔ اب انتظار کے نئے پیمانے تھے اور جدائی کا نیا دورانیہ تھا۔ یاسر اچھی طرح جانتا تھا کہ کینڈی میں حالات دگرگوں ہوں گے۔ اس نے سلیمان صاحب کا لب ولہجہ سن لیا تھا اور ان کے اندر کا درجہ حرارت بھی بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ انہوں نے جس طرح پھنکار کر یاسر سے کہا تھا کہ وہ انہیں ''چاچو'' نہ کہے، وہ انداز ابھی تک خنجر کی طرح یاسر کے ذہن میں اترا ہوا تھا۔

کئی بار نم نے مشورہ دیا کہ وہ کنول یا آشا کو فون کرے۔ کئی بار خود اس کا اپنا دل بھی ایسا کرنے کو چاہا مگر پھر اسے کنول سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آ جاتا اور وہ خود پر جبر کر کے رہ جاتا۔ آفس سے چھٹی کے بعد نم تو گھومنے پھرنے کے لئے نکل جاتا۔ یاسر گھر آ جاتا، کمرے کی کھڑکی کھول کر بیٹھ جاتا۔ دور تک پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھتا۔ مشرق کی طرف سے آنے والی ہواؤں کو محسوس کرتا اور سوچتا کہ کنول کیا کر رہی ہو گی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ اس کی اپنی جنگ ہے اور اس کا حتمی فیصلہ تھا کہ یہ جنگ وہ خود ہی کرے گی۔ بڑے عزم لیکن بڑی شائستگی کے ساتھ۔

وہ کیسے لڑ رہی ہو گی؟ اپنا آپ کیسے منوا رہی ہو گی؟ کیا وہ خاموش احتجاج کر رہی ہو گی؟ کیا اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہو گا؟ کیا وہ آشا کے گھر سے کہیں اور منتقل ہو گئی ہو گی؟ یاسر صرف اندازہ لگا سکتا تھا۔ کنول اور اس کے حالات کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں جذبات کی فراوانی میں کنول کوئی الٹا سیدھا قدم نہ اٹھائے۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی، ذمے دار صحافی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رشتے ناتوں کا پاس اسے حد سے بڑھ کر تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب

لوگوں کی آراء آپس میں ٹکراتی ہیں تو کبھی کبھی اختلاف اس انتہا تک پہنچ جاتا ہے کہ انسان ذہن کی بجائے دل سے سوچنے لگتا ہے...... اور دل تو ایسے موقعوں پر ہوتا ہی وحشی ہے۔

کسی وقت یہ سوچ کر یاسر کو ازحد افسوس ہونے لگتا کہ اس نے کنول کو اپنے جان سے پیارے چاچو اور اپنی پیاری ماں کے مقابل کھڑا کر دیا ہے۔ وہ اپنے ان بزرگوں کی خواہش کے برعکس چلنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ کنول کی والدہ یعنی خالہ سعدیہ کا خیال یاسر کے ذہن میں آتا تو اس کا دل چاہتا کہ کنول سے کیا ہوا پیمان توڑ کر کینڈی پہنچ جائے اور کنول کو ہر ایسے ارادے سے روک دے جس سے خالہ سعدیہ کے دکھی دل کے مزید دکھنے کا امکان ہو۔ پتہ نہیں کیوں اسے خالہ سعدیہ سے اس قدر انسیت محسوس ہوتی تھی۔

کولمبو صبح اور شام کی قبائیں بدلتا رہا۔ یاسر علی الصبح نم کے ساتھ ڈیوٹی پر چلا جاتا۔ رہائش گاہ سے دفتر کا فاصلہ بمشکل 150 میٹر تھا۔ دونوں پیدل ہی چلے جاتے۔ سارا دن کمپیوٹر کی اسکرین نگاہوں کے سامنے رہتی۔ انگلیاں کی بورڈ پر حرکت کرتیں۔ کاغذ پھڑپھڑاتے۔ ٹیلی فونز کی گھنٹیاں بجتیں، کافی کی پیالیاں گردش کرتیں، کھڑکیوں سے باہر بارش برستی اور بھیگی ہوئی ہریالی کی خوشبو بند کمروں کے اندر چلی آتی۔

شامیں بہت اداس گزر رہی تھیں۔ رات کو رہائش گاہ کی چھت پر چلا جاتا۔ حد نگاہ تک اسے کولمبو جگمگاتا اور ٹمٹماتا نظر آتا۔ گال فیس روڈ کی روشنیاں، نیپون ہوٹل کا دور افتادہ نیون سائن، کولمبو۔2 کی جگمگاہٹ...... وہ کئی جگہیں دیکھتا اور بھولی بسری باتیں یاد آنے لگتیں۔ فون کی گھنٹی بجتی تو وہ چونک اٹھتا۔ دروازے پر دستک ہوتی تو رگوں میں خون سنسنا جاتا۔ ہلکی سی آہٹ بھی اسے چونکا دیتی...... کبھی وہ خاموش بیٹھتا تو اسے لگتا کہ آتی جاتی سانسوں میں کنول کی خوشبو ہے اور اس کے دل کی دھڑکن کنول کا نام پکارتی ہے۔ دو چار ماہ میں ہی کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی بدلی ہوئی حالت پر خود بھی یقین نہیں آتا تھا۔ اسی طرح ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔

وہ ایک سہانی صبح تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ یاسر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف دیدی آشا کے پتی کمار صاحب تھے۔ انہوں نے اپنائیت بھرے لہجے

میں یاسر کا حال احوال پوچھا پھر اس سے کہا کہ وہ کینڈی آ جائے۔ زیادہ نہیں تو ایک دن کے لئے آ جائے۔ خالہ سعدیہ اسے بہت یاد کر رہی ہیں۔

سلیمان صاحب کا کرخت لہجہ یاسر کے کانوں میں گونجا اور ان کی جلتی ہوئی آنکھیں اس کے پردۂ تصور پر چمکیں۔ اس کا دل چاہا کہ کوئی ایکسکیوز کر دے۔ مگر پھر خالہ سعدیہ کی مہربان صورت اس کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ کمار صاحب کا محبت بھرا لہجہ بھی اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کمار صاحب نے ایک بار پھر اصرار کے ساتھ اسے آنے کے لئے کہا تو اس نے حامی بھر لی۔ ویسے بھی اگلے روز اسے آفس سے چھٹی تھی۔

کمار صاحب کا فون ریسیو کرنے کے بعد اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کنول کو پھر سے دیکھنے کا تصور ہی اس کے لئے جاں فزاء تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ حالات بہتری کی طرف بڑھنے لگے ہیں۔ شاید اس کی تڑپ، اس کی نیم شب کی دعائیں اثر دکھا رہی تھیں۔ کمار صاحب نے فون کیا تھا تو یقیناً کنول اور چاچو سلیمان وغیرہ کی رضامندی سے کیا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ کنول نے ہی یہ فون کروایا ہو۔ اگر وہ خود یاسر کو کینڈی بلاتی تو شاید اس کی بات کا یاسر پر اتنا زیادہ اثر نہ ہوتا۔

یاسر نے مختلف پہلوؤں پر سوچا۔ نم سے طویل مشورہ کیا اور پھر گیارہ بجے کے قریب بذریعہ بس کینڈی روانہ ہو گیا۔

وہ ایک خوشگوار اور سرسبز سفر کے بعد پہاڑی مقام کینڈی پہنچا تو پچھلے سفر کی ساری یادیں تازہ ہو گئیں۔ کینڈی میں پہلا ٹک ٹک دیکھتے ہی اسے اپنا فلم رول اور اس رول کے لئے ٹک ٹک والوں کی تگ و دو یاد آ گئی۔

یاسر کو ریسیو کرنے کے لئے کمار صاحب کی اسٹیشن ویگن موجود تھی مگر آج اسے دیدی آشا کی بجائے کمار صاحب خود ڈرائیو کر کے لائے تھے۔ دیدی آشا بھی آئی تھیں...... اور وہ بھی تھی جسے دیکھنے کے بعد کچھ اور دیکھنے کی تمنا یاسر کو نہیں رہتی تھی۔ وہ ہلکی نیلی ساڑھی میں تھی۔ بال جوڑے کی صورت بندھے تھے اور ان میں رجنی گندھا کے پھول مہک رہے تھے۔ نٹ کھٹ اس کی گود میں اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ عورت جب بچے کے ساتھ نظر آتی ہے تو کتنی مکمل ہوتی ہے۔ یاسر کو ماؤنٹ لیوینیا کے ساحل پر

دیکھا ہوا منظر یاد آ گیا...... جب کنول نے ایسے ہی ایک سفید فام بچے کو اٹھا کر چومنا چاٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے کچھ کہا تھا یا شاید نہیں کہا تھا یا شاید بہ زبان خاموشی کہا تھا...... دیکھو ایسے کیا جاتا ہے پیار......

اسٹیشن ویگن روانہ ہوئی۔ کنول کے چہرے کا اطمینان بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی لڑائی کامیابی سے لڑی ہے۔ دیدی آشا کی آنکھوں میں بھی چھپی چھپی سی مبارکباد تھی۔

''کیا بات ہے؟ تم کچھ کمزور ہو گئی ہو۔'' یاسر نے کنول سے پوچھا۔

دیدی آشا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''تم نے اسے بیس پچیس روز پہلے دیکھا ہوتا تو آج کہتے کہ تم تو پہلوان بنتی جا رہی ہو۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' یاسر نے کہا۔

''یہ دو تین ہفتے خاصی بیمار رہی ہے۔'' دیدی آشا نے کہا۔

''دیدی! ایک تو آپ بات کو بڑھاتی بہت ہیں۔'' کنول نے احتجاج کیا۔ ''بس معمولی سا بخار تھا۔ چھ سات دن میں ٹھیک ہو گیا تھا۔''

کمار صاحب نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اور سناؤ یاسر صاحب! کولمبو میں کام کیسا جا رہا ہے۔ وہاں جا کر آپ کو ہماری یاد ہی نہیں آئی لیکن یہاں ہر روز کسی نہ کسی بہانے آپ کا ذکر خیر ہوتا رہا ہے۔''

''آپ نے اچھا کیا کہ ذکر خیر کہہ دیا۔ اگر آپ صرف ذکر کہتے تو پتہ نہیں میں کیا سمجھتا...... ویسے...... چاچو سلیمان کہاں ہیں؟''

''وہ...... اپنے کسی کام سے نوریلیا گئے ہوئے ہیں۔ شاید کل تک آ جائیں گے۔''

یاسر نے خالہ سعدیہ اور کنول کی دادی ماں کا حال احوال پوچھا۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے وہ گھر پہنچ گئے۔ خالہ سعدیہ محبت اور تپاک سے ملیں۔ انہوں نے کئی بار یاسر کا سر چوما۔

یاسر کو دیکھ کر وہ خوش ہوئی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی اداسی سات پردوں کے اندر سے بھی جھلک دکھا رہی تھی۔ اس اداسی کا تعلق گمشدہ بھتیجے کے دکھ سے تھا۔ وہ بھتیجا جو انہیں بیٹوں سے بڑھ کر پیارا تھا۔ وہ دیر تک یاسر کو اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرتی رہیں لیکن بات کرتے ہوئے وہ ایک دم کہیں کھو سی جاتی تھیں۔ انہیں

واپس اپنے ماحول میں لانے کے لئے کوشش کرنا پڑتی تھی۔

کنول نے بتایا تھا کہ چاچو سلیمان کل آئیں گے۔ لیکن کام جلدی ختم ہونے کے سبب وہ رات کو ہی آ گئے۔ اس وقت یاسر سمیت سارے اہل خانہ ڈنر کر رہے تھے۔ کھانے کی میز بالائی منزل کی اسی کھڑکی کے سامنے لگی تھی جہاں سے جھیل اور جھیل کے پار بدھا کا مندر نظر آتا تھا۔ سلیمان صاحب یاسر کے ساتھ بظاہر خوش دلی سے ملے۔ انہوں نے یاسر کے ساتھ ہی بیٹھ کر چائے بھی پی۔ باقی لوگ نیچے چلے گئے تو یاسر اور دیدی آشا، سلیمان صاحب کے ساتھ بیٹھے رہے۔ سلیمان صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جب لوگ آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سمجھنے میں کچھ سے تو لگتا ہی ہے۔ اس دوران میں غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس طرح سے "جان پہچان" کا حصہ ہی ہوتا ہے۔ ایسی باتوں کو دل سے نہیں لگانا چاہئے۔"

یاسر سمجھ گیا کہ سلیمان صاحب ڈھکے چھپے انداز میں اپنے سابقہ رویے پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ انہوں نے کہا۔ پچھلی مرتبہ تم نے کہا تھا کہ اپنے والد صاحب سے فون پر بات کرواؤ گے۔ وہ پروگرام وہیں کا وہیں رہ گیا۔"

"آپ جانتے ہی ہیں کہ بالکل اچانک جانا پڑ گیا تھا۔" یاسر نے کہا۔

"تمہاری چھوٹی بہن شمائلہ کا فون ایک دن یہاں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم ابھی یہیں پر ہو۔ کافی دیر آشا اور کنول سے باتیں کرتی رہی تھی۔"

"وہ بہت باتونی ہے۔" یاسر مسکرایا۔

دو چار منٹ یاسر سے بات کرنے کے بعد سلیمان صاحب نیچے چلے گئے۔ ان کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ تجدید تعلق کی کوشش کر رہے ہیں مگر ان کے رویے کے نیچے کہیں گہرائی میں اب بھی تلخی موجود تھی۔ یاسر جیسے حساس شخص کے لئے اس تلخی کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں یہاں اس چار دیواری کے اندر چچا بھتیجی میں کافی سنگین قسم کی کشمکش چلی ہے۔ کئی ہفتوں تک چلنے والی اس کشمکش کے دوران میں کنول بیمار بھی ہوئی ہے...... تاہم بعد ازاں اس کشمکش کا نتیجہ کنول کے حق میں نکلا ہے۔

اگلے روز صبح سویرے یاسر گھر کی چھت پر کھڑا تھا۔ سمندر کو چھو کر آنے والی سرد ہوا اس کے جسم کو راحت پہنچا رہی تھی۔ اچانک کوئی بلی کی چال چلتے ہوئے آیا اور یاسر کو عقب سے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ اس جانے پہچانے وجود کو کیسے بھول سکتا تھا۔

"کیا کر رہی ہو...... کوئی دیکھ لے گا۔" یاسر نے گھومنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں کسی کے دیکھنے سے نہیں ڈرتی ہوں۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سب سو رہے ہیں۔"

"اچھا مجھے مڑنے تو دو......" یاسر نے کہا۔

"نہیں...... تم مجھے ایسے زیادہ اچھے لگتے ہو۔" وہ شرارت سے بولی۔ وہ آنکھیں گھما کر رہ گیا۔ اس کی کہنیاں پانچ فٹ اونچی منڈیر کے اوپر تھیں۔ کنول نے اسے عقب سے جکڑ رکھا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے اپنے دانتوں کے ساتھ یاسر کے بائیں کان پر کاٹا اور سرگوشی میں بولی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ میں سب ٹھیک کر لوں گی...... اب خوش ہو نا؟"

"خوش ہوں بھی اور نہیں بھی۔"

"کیا مطلب؟"

"خالہ سعدیہ کی آنکھوں میں شاید اب بھی خاور کا انتظار جلتا ہے۔"

کنول نے یاسر پر سے اپنی گرفت ختم کرتے ہوئے گہری سانس لی اور بولی۔

"خاور کے ملنے کا امکان اب بہت کم ہے۔ وہ اگر سری لنکا میں تھا بھی تو اب یہاں نہیں ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امریکہ پہنچ چکا ہے۔ ایک ماہ پہلے چاچو کے ایک خالہ زاد بھائی درانی صاحب نے خاور کو نیو جرسی کے ایئر پورٹ پر دیکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سیاحوں کی ایک بڑی ٹولی کے ساتھ تھا اور یہ لوگ الاسکا جا رہے تھے۔"

"تو چاچو کے خالہ زاد نے خاور سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"ان کا کہنا ہے کہ ڈیپارچر لاؤنج سے انہوں نے بہت آوازیں دیں۔ لیکن بے فکروں کی وہ ٹولی ہنستی گاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ وہ ہمیشہ سے بہت لاپرواہ ہے یاسر۔ تم اسے سنکی بھی کہہ سکتے ہو۔ ناراضگی والی بات تو دو ڈھائی سال پہلے ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے ہی بہت لاپرواہ ہوگیا تھا۔ اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر...... بس کیمرا اور تصویریں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بنتی جا رہی تھیں......"

ان کی گفتگو کو ایک دم بریک لگ گئے۔ زینوں کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور دیدی آشا کی صورت نظر آئی۔ ساتھ میں نٹ کھٹ بھی تھا۔ کنول اور یاسر کو چونکتے دیکھ کر دیدی آشا مسکرائیں اور بولیں۔

"ڈسٹرب ہونے کی ضرورت نہیں ...... تم باتیں کرو، میں ناشتے کی تیاری کرتی ہوں۔"

نٹ کھٹ بھی شرارت میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔ "ماما ناشتہ بنانے میں بڑی دیر لگاتی ہیں۔ آپ آرام سے "آئی لو یو" کریں۔"

کنول مکہ تان کر اس کی طرف بڑھی تو وہ جلدی سے دروازے میں غائب ہوگیا۔ تینوں اس کے بے ساختہ انداز پر ہنسنے لگے۔

دیدی آشا اور بھائی کمار کے بے حد اصرار پر یاسر نے فون پر کولمبو آفس کے ہیمانتھا صاحب سے رابطہ کیا اور چھٹی کی درخواست کی۔ اتفاقاً آج کل کام کا پریشر نہیں تھا، اسے چار روز کی چھٹی مل گئی۔ ویک اینڈ ساتھ ملا کر یہ پورے ہفتے کی چھٹی ہوگئی۔

اگلے دو تین روز یاسر، کنول اور آشا نے کینڈی میں گھومتے پھرتے ہی گزارے۔ حالات کے اشارے حوصلہ افزاء تھے۔ ایک روز فون پر بنگلور میں کنول کی باجی سلطانہ سے بھی بات ہوئی۔ ان کی گفتگو میں یاسر کے لئے اپنائیت اور محبت تھی۔ لب و لہجے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ یہاں کینڈی کے "رومانی حالات" سے مکمل باخبر ہیں۔ وہ یاسر کے اہل خانہ اور خصوصاً شائلہ سے ملنا بھی چاہتی تھیں۔ کنول کی دادی ماں نے بھی اپنی نحیف آواز میں ایک دو باتیں کیں۔ ان کی آواز سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لاغر ہیں۔ ان کے الفاظ یاسر کی سمجھ میں مشکل سے آرہے تھے۔ جو دو چار فقرے یاسر

کی سمجھ میں آئے اس میں انہوں نے "معصوم" انداز میں اپنی پوتی کی تعریفیں کی تھیں۔

تمام اہل خانہ میں سے اگر کوئی شخص قدرے خاموش تھا تو وہ چاچو سلیمان ہی تھے۔ یوں تو وہ یاسر سے بات کرتے تھے، کنول سے بھی ہنستے بولتے تھے لیکن ان کے رویے میں جو فرق آگیا تھا وہ یاسر نے محسوس کیا تھا اور یقیناً دیگر اہل خانہ کو بھی محسوس ہوگا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چاچو سلیمان نے سمجھوتہ کیا ہے۔ محبت کی شادی ان کے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ اور پھر خاندان سے باہر والی بات تو اور بھی ناقابل قبول تھی۔ لیکن حالات کی ساری جمع تفریق کرنے کے بعد اور کنول سے اپنی وابستگی کو پیش نظر رکھنے کے بعد انہوں نے نیم رضامندی ظاہر کردی تھی۔

تیسرے روز شام کو یاسر اور کنول جھیل کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ ان کی بائیں طرف سفید رنگ کی وہ محرابی منڈیر تھی جو فٹ پاتھ کو جھیل سے جدا کرتی تھی۔ معبد کے سنہری کلس ڈوبتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ بدھا کے مندر میں بھجنوں کا الاپ اب ختم ہو چکا تھا اور ڈھول بجنے شروع ہو گئے تھے۔ لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے ان کی آواز پورے کینڈی میں پھیل رہی تھی۔ شانے سے شانہ ملائے وہ دونوں چلتے چلے جا رہے تھے۔ اس چہل قدمی کے دوران میں یاسر کنول کو وہ تصویریں بھی دکھا رہا تھا جو ڈھائی تین ماہ پہلے انہوں نے کولمبو اور کینڈی میں کھینچی تھیں۔ کسی تصویر پر کنول مسکراتی کسی تصویر کو دیکھ کر شرم سے سرخ ہوتی تھی اور کسی تصویر پر اسے مصنوعی غصے سے گھورنے لگتی تھی۔

پھر ساری تصویریں اس نے یاسر کے شاپر میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا، چلو اب عملی زندگی کی طرف بھی آؤ۔"

"ایسے کاموں کے لئے بہت سی مذہبی اور معاشرتی شرائط ہوتی ہیں اور پھر تنہائی بھی درکار ہوتی ہے۔" یاسر شرارت سے بولا۔

"میں تمہیں دھکا دے کر پانی میں گرا دوں گی اور کسی کو نکالنے بھی نہیں دوں گی۔" وہ شرم سے سرخ ہوتے ہوئے بولی۔

"اچھا چلو سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ویسے مجھے تیرنا بھی آتا ہے۔" یاسر نے گہری

سانس لے کر کہا۔

دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے چلتے رہے پھر کنول نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کل رات کو پھر باجی سلطانہ کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ دادی ماں کی خوراک مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو ہفتے بعد لیکوئیڈ خوراک پر گزارہ کرنا پڑے۔ وہ رات کو غنودگی میں بڑبڑاتی ہیں اور میرا نام پکارتی ہیں۔''

''کنول! جو کچھ تم کہنا چاہ رہی ہو میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میں نے تو تمہیں آج سے تین مہینے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ابو جان اور شائلہ تو میرے ہونٹوں سے بس اقرار سننے کے منتظر ہیں۔ باقی رہی میری بات ......تو تمہیں کیسے بتاؤں کنول! تمہارے بغیر تو اب سانس لینا بھی محال ہے۔ بے صبری کا مظاہرہ اچھا نہیں لگتا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا کیا بولتا رہوں۔''

کنول کے چہرے پر شرم کے رنگین لہریئے تھے۔ وہ یاسر کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بولی۔ ''لاہور میں بات کی ہے تم نے؟''

''کینڈی آنے سے پہلے بات کی تھی۔ لیکن ابھی میں کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خاص طور پر ابو سے چھپا رہا ہوں۔ انہیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ شائلہ کو اشاروں کنایوں میں کچھ بتایا ہے مگر تفصیل سے ابھی وہ بھی بے خبر ہے۔ ایک دم دھماکا کرنا چاہتا ہوں۔ بگ بلاسٹ۔''

''کوئی اپ سیٹ تو نہیں ہوگا نا؟'' وہ منمنائی۔

''اب میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں دھکا دے کر پانی میں گرا دوں۔ اور میرا خیال ہے کہ بنگلور کے اکثر لوگوں کی طرح تمہیں بھی تیرنا نہیں آتا ہوگا۔ بھلی لوکے، تمہیں ایک سو دس بار کہا ہے کہ میری طرف کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ اور جب مسئلہ ہے ہی نہیں تو ''اپ سیٹ'' کہاں سے آگیا؟ اٹ از آل کلیئر۔ گرین سگنل اینڈ گرین سگنل۔''

اچانک کنول کو ایک پی سی او نظر آیا اور وہ رک گئی۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر سے پی سی او ڈھونڈ رہے تھے۔ دراصل یاسر ڈمبولا کال کر کے اجے کا حال احوال پوچھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے وہ دو مرتبہ کولمبو سے بھی اسے فون کر چکا تھا۔ اجے کی ٹانگوں کے

آپریشن مکمل ہو چکے تھے اور اب وہ تیزی سے روبصحت تھا۔ اسے ڈائریکٹر صاحب کی طرف سے رہنے کے لئے مکان مل گیا تھا۔ اس نے اپنی دونوں بہنوں کو مستقل طور پر ڈمبولا بلا لیا تھا۔ اپنی بیمار بہن کا علاج بھی اس نے ایک اچھے ہسپتال میں شروع کرا دیا تھا۔ ایک بار تو فون پر گفتگو کے دوران میں وہ رونے ہی لگا تھا۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہا تھا۔

''سر جی! آپ کی وجہ سے میری زندگی بدلی ہے۔ اس شام اگر آپ مجھ پر ناراض نہ ہوتے تو شاید میں آج بھی اس تکہ شاپ پر گندی عورتوں کے لئے کام کر رہا ہوتا۔''

اجے نے اپنے پاس موجود رقم سے ایک منی ٹرک لے لیا تھا اور اسے کرائے پر چلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسے خود بھی ٹرک چلانے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔

یاسر اور کنول دیر تک کوشش کرتے رہے لیکن اجے سے ٹیلیفونک رابطہ نہیں ہو سکا۔ یہ کام پھر کسی وقت کے لئے چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گئے۔

ایک دوسرے کی قربت کا لطف اٹھاتے، سہانے خواب تراشتے، باتیں کرتے وہ آگے بڑھتے رہے۔ کولمبو اب جگمگانے لگا تھا۔ خوبرو سیاحوں کی ٹولیاں ٹُتھ ٹمپل کی طرف رواں دواں تھیں۔ باتوں باتوں میں یاسر نے دو تین بار کولمبو اور راکیل کے حوالے سے بات کرنا چاہی لیکن کنول نے اسے یہ موضوع چھیڑنے ہی نہیں دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس واقعے کے بارے میں سب کچھ بھول چکی ہے اور چاہتی ہے کہ یاسر بھی بھول جائے۔ آج بھی یاسر نے گفتگو کا رخ اس جانب موڑنے کی کوشش کی لیکن کنول نے یہ کوشش صفائی سے ناکام بنا دی۔ وہ ٹُتھ مندر کی دلچسپ تاریخ کا ذکر کرنے لگی اور یاسر کو ہاتھیوں کے اس سالانہ جلوس کے بارے میں بتانے لگی جس کا تعلق ٹُتھ ٹمپل سے تھا۔ یاسر اس کی گفتگو میں بہتا چلا گیا۔ ایک صحافی ہونے کے ناطے سے کنول کی عمومی معلومات واقعی وسیع تھیں۔

رات کو یاسر دیر تک جاگتا رہا۔ اس گھر میں برآمدے کی کھڑکی اس کے لئے بیٹھنے کی بہترین ''جگہ'' تھی۔ یہاں سے نیلی جھیل اور سنہری کلس نظر آتے تھے۔ ایک قریبی مکان کے صحن میں تاڑ کا ایک بلند درخت تھا اور اس درخت کی جڑوں میں کاہی اور سفید رنگ کے بے شمار کنول کھلے رہتے تھے ...... اور کنول اسے کیوں پیارے نہ

ہوتے۔ کنول تو اس کے لئے محبت کی علامت بن گئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا اپنے نم ہونٹوں سے اس کے چہرے کے بوسے لیتی رہی اور اس کے پورے جسم میں گدگدی جاگتی رہی۔ کھڑکی کے پاس ہی ایک الماری تھی۔ الماری میں پرانے رسائل اور اخبار وغیرہ ترتیب سے رکھے تھے۔ یاسر پڑھنے کے لئے کوئی چیز ڈھونڈنے لگا۔ مزاحیہ ادب...... افسانوں کی کوئی کتاب ...... یا پھر شاعری۔ ایک پرانا اخبار دیکھ کر وہ چونکا۔ اس انگلش اخبار میں تلاش گمشدہ کا ایک اشتہار تھا۔ اشتہار میں خاور کی تصویر تھی۔ یہ اشتہار کنول کے اہل خانہ نے قریباً چار ماہ قبل چھپوایا تھا۔ اشتہار کے مضمون میں لکھا تھا کہ خاور جہاں کہیں بھی ہے اپنے اہل خانہ سے فوراً رابطہ کرے، اس کے اہل خانہ پریشان ہیں۔ خاص طور سے اس کی خالہ سعدیہ ...... رو رو کر ان کی آنکھیں خراب ہو گئی ہیں اور وہ علیل حالت میں کولبو کے وکٹر ہسپتال میں زیر علاج ہیں......''

اشتہار کے نیچے اس گھر کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ بھی لکھے تھے۔ یہ سری لنکن اخبار تھا۔ معلوم نہیں کہ ایسے کتنے اشتہار اب تک چھپوائے جا چکے تھے...... اس حوالے سے کتنی بھاگ دوڑ کی جا چکی تھی لیکن اب وہ صاحب ہزاروں میل دور امریکہ میں کہیں پائے جا رہے تھے۔ طرفہ تماشا تھا۔

اخبار دیکھتے دیکھتے یاسر کی نگاہ وال کلاک کی طرف اٹھ گئی۔ بارہ بج چکے تھے۔ صبح اسے جلدی اٹھ کر آفس فون کرنا تھا۔ اس نے سوچا اب سو جانا چاہئے۔ ٹوتھ پیسٹ کرنے کے لئے باتھ روم میں گھسا تو معلوم ہوا کہ پانی نہیں ہے۔ یہ خلاف معمول تھا۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر اس نے مجبوراً نیچے والے باتھ روم کا رخ کیا۔ یہ باتھ روم گھر کے عقبی صحن میں واقع تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے بغلی راہداری سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ بہت ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ بغلی راہداری سے گزرتے ہوئے اسے انکل سلیمان کے کمرے کے عقب سے گزرنا پڑا۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ شاید لائن پر آواز صاف نہیں تھی۔ انہیں بلند آواز سے بولنا پڑ رہا تھا۔ ایک دو اڑتے ہوئے فقرے یاسر کے کانوں میں پڑے اور اس کے قدم فطری تجسس کے سبب رک گئے ...... اسے لگا کہ یہ گفتگو اس کے بارے میں ہو رہی ہے۔ انکل سلیمان کہہ رہے تھے، وہ ابھی یہیں ہے۔ شاید پرسوں جائے گا ...... نہیں نہیں

......ایسی کوئی بات نہیں سلطانہ، اگر تم سب خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں ...... نہیں نہیں تم غلط سوچ رہی ہو......''

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے ہونے والی بات سنتے رہے، پھر بولے۔ ''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ میں کر سکتا ہوں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اس پاکستانی نے ہم سے غلط بیانی کی ہے۔ جو ایک بار غلط بیانی کرے وہ پھر بھی کر سکتا ہے...... اور میری یہ رائے آج بھی برقرار ہے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔ مگر ہم ایسے امکان کو رد نہیں کر سکتے۔''

دوسری طرف سلطانہ نے کچھ پوچھا۔ جواب میں انکل سلیمان بولے۔ ''بس کوئی ٹورسٹ لڑکی تھی۔ یورپین لگتی تھی۔ دوبارہ تو نظر نہیں آئی۔ چلی گئی ہو گی کہیں اور۔ یہ لوگ کسی ایک جگہ تھوڑا ٹکتے ہیں مگر مسئلہ یہ نہیں ہے۔ مسئلہ تو کیریکٹر کا ہوتا ہے۔ خدا کرے اس کا کیریکٹر درست ہو اور اگر نہیں بھی تو ہو جائے۔ ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں۔''

دوسری طرف سے کنول کی بہن سلطانہ نے یقیناً کچھ نیک تمنائیں ظاہر کی تھیں۔ انکل سلیمان ہوں ہاں میں جواب دیتے رہے۔ پھر ان کی گفتگو کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔ وہ کنول اور یاسر کی بات کو تیزی سے آگے بڑھانے کے سلسلے میں ڈسکس کرنے لگے۔ یاسر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ وہ جلدی سونا چاہتا تھا لیکن نیند اسے بہت دیر سے آئی۔ وہ جاگتا رہا ...... ہوا کے خوشبودار جھونکوں والی رات کینڈی کے اونگھتے نشیب و فراز پر سرسراتی رہی اور آگے بڑھتی رہی۔ انکل سلیمان نے بنگلور میں اپنی بڑی بھتیجی سلطانہ سے جو گفتگو کی تھی وہ رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔ اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ گفتگو اس کے بارے میں تھی۔ یورپین ٹورسٹ لڑکی کا اشارہ راکیل کی طرف تھا۔ انکل سلیمان کے ذہن میں موجود شک صاف نہیں ہوا تھا۔ کیا معلوم کہ یہ شک اور اس قسم کے دوسرے شک کبھی صاف ہونا بھی تھے یا نہیں۔ وہ سوچتا رہا ...... سوچتا رہا اور پھر جھنجلا گیا۔ جب کنول مطمئن تھی، خوش تھی ...... اسے کسی اور سے کیا لینا تھا ...... وقت سب سے بڑا چارہ گر ہوتا ہے اور سب سے بڑا منصف بھی۔ انکل سلیمان بھی وقت کے ساتھ حقائق کو ماننے پر مجبور ہو

سکتے تھے۔ ایک ”پاکستانی“ کے بارے میں اپنی رائے بدل سکتے تھے۔

تیسرے روز یاسر کولمبو چلا گیا۔ اس نے کنول کو انکل سلیمان کی ٹیلیفونک گفتگو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ کولمبو میں اب ہر روز کنول کا فون آتا تھا۔ وہ دیر تک باتیں کرتے تھے۔ گفتگو کی صوتی لہروں کے ذریعے ایک دوسرے کو اپنے اندر جذب کرتے تھے۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا تھا اور فون پر بہت سا وقت گزر جاتا تھا۔ پھر بھی پیاس باقی رہتی تھی۔ یہ کیسی پیاس تھی جو یاسر کو اندر تک بے حال کر دیتی تھی۔ یاسر نے تاحال اپنے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا، صرف آٹھ روز بعد یاسر کے ابو جان کی سالگرہ تھی۔ وہ اس سالگرہ پر انہیں خوشخبری کا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ انہیں ان کی ”بہو“ کی تصویر بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ بڑی شدت سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔

اگلے ویک اینڈ پر کنول نے اسے پھر کینڈی بلا لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ چاچو سلیمان کی بھی یہ خواہش ہے۔ اتفاقاً بنگلور سے ان کے کچھ رشتے دار کینڈی آئے تھے۔ انکل سلیمان اور خالہ سعدیہ وغیرہ کی خواہش تھی کہ کنول کی ایک چچی یاسر کو دیکھ لیں...... کنول نے یاسر کی کچھ تصویریں بنگلور بھی روانہ کر دی تھیں۔ وہاں سے باجی سلطانہ کا فون آیا تھا اور انہوں نے یاسر کے حوالے سے مثبت رائے دی تھی۔

یاسر ہفتے کی شب کینڈی پہنچا۔ کمار صاحب نے پُر تکلف دعوت کی تھی۔ انڈیا، سری لنکا اور پاکستان کے چٹ پٹے کھانوں کا خوبصورت امتزاج تھا۔ اس دعوت میں پاکستان کی نمائندگی بکرے کی سجی اور دہی کی نمکین لسی سے کی گئی۔ ان دونوں اشیاء کو مہمانوں نے بہت پسند کیا۔

بیشتر مہمان رات کو ہی چلے گئے تھے۔ جو ایک دو رہ گئے تھے وہ صبح چلے گئے۔ موسم خوشگوار تھا۔ دو روز کی بوندا باندی کے بعد مطلع صاف تھا۔ کنول نے ”دوسری چوٹی“ جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ ایک پکنک اسپاٹ تھا۔ اس کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن عام زبان میں اسے ”دوسری چوٹی“ کہا جاتا تھا۔ یہ ”سٹی سینٹر“ سے پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ کنول کا ارادہ تھا کہ آج دیگر اہل خانہ کے ساتھ کچھ وقت تفریح میں گزارا جائے۔ دراصل وہ ایک پنتھ دو کاج کے فارمولے پر عمل کر رہی تھی۔ اسے کینڈی کے چند پکنک اسپاٹس کے بارے میں ایک فیچر لکھ کر اپنے پرچے کو بھیجنا

تھا۔

پرچے کا زیادہ تر کام آج کل وہ کینڈی میں رہتے ہوئے کر رہی تھی۔ خالہ سعدیہ کی آنکھوں کا علاج اب آخری مرحلے میں تھا اور کنول کی خواہش تھی کہ وہ والدہ کے ساتھ ہی انڈیا واپس جائے۔ انکل سلیمان کبھی انڈیا چلے جاتے تھے۔ کبھی واپس کینڈی آ جاتے تھے۔ وہ یہاں کسی مقامی فرم کے ساتھ مل کر کاروبار کا بھی سوچ رہے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ جس مقامی شخص کے ساتھ پارٹنرشپ کر رہے ہیں وہ مشہور کرکٹر مرلی دھرن کا کوئی عزیز ہے۔

نٹ کھٹ نے سویرے سویرے ہی کنول کا یہ پیغام یاسر تک پہنچا دیا کہ آج ہم پکنک کے لئے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد دیدی آشا نے بھی تصدیق کر دی۔ کچن سے شامی کبابوں اور پوٹیٹو چپس کی دلفریب خوشبو اٹھ رہی تھی۔

یاسر کو تھوڑا سا کام تھا۔ اسے اپنی کمپنی کے ایک مقامی اہلکار سے کچھ ”سی ڈیز“ لینے کے لئے جانا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹ آئے گا...... دیدی آشا کو بتا کر وہ چلا گیا۔ اس کی واپسی دس بجے کے قریب ہوئی۔ پکنک کی تیاری ہو رہی تھی۔ لیکن اب یاسر کو اپنی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا دل کہیں جانے کی بجائے گھر رہنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنی کیفیت کے بارے میں دیدی آشا کو بتایا...... اور پھر کنول کو بھی بتا دیا۔ کنول نے پہلے تو اسے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا پھر اس کے چہرے کو دھیان سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم واقعی تھکے ہوئے سے لگ رہے ہو۔ میں دیدی سے کہتی ہوں کہ پروگرام ملتوی کر دیتے ہیں۔“

”نہیں کنول، تم لوگ جاؤ۔ بچوں کا دل ٹوٹے گا۔ صبح سے تیاری کر رہے ہیں۔“

کنول اور یاسر کے درمیان تھوڑی سی تکرار ہوئی۔ بہرحال یاسر نے اسے پروگرام بحال رکھنے پر آمادہ کر لیا۔

”چلو آؤ...... میں پہلے تمہیں ڈاکٹر کو دکھاتی ہوں۔“ وہ اسے بازو سے دبوچتے ہوئے بولی۔

''نہیں کنول...... میں نے بتایا تھا کہ ایک دو گھنٹے آرام کرلوں گا تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

کافی بحث مباحثے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ یاسر کمرے میں بند ہو کر لیٹ گیا۔

اہل خانہ کی واپسی شام چھ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ یاسر اس وقت بھی کمرے میں ہی تھا۔ فرداً فرداً سب نے اس کی خیریت پوچھی۔ انکل سلیمان نے بھی ''غالباً دل کڑا کر کے'' مزاج پرسی کی رسم ادا کی۔ یاسر نے بتایا کہ اب اس کی طبیعت بحال ہے۔

سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور دن بھر کی کارگزاری سنانے لگے۔ ان کی اپنائیت اور محبت ساون کی نرم پھوار کی طرح یاسر کے دل کی زمین پر اتر رہی تھی اور دھیرے دھیرے اندر تک سرایت کر رہی تھی۔



اگلے روز بھی موسم خوشگوار تھا۔ نیم گرم دھوپ جسموں کو راحت پہنچا رہی تھی۔ کل کی بھاگ دوڑ کے سبب سارے اہل خانہ تھکے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ دیر تک سوئیں گے اور کمپاؤنڈ میں گونجتی ہوئی شادی کی مسلسل آواز بھی انہیں ڈسٹرب نہیں کر سکے گی۔ یاسر نے کچن میں جا کر خود ہی تھوڑا سا ناشتہ کیا اور پھر گھومنے کے لئے نکل گیا۔

یاسر کی واپسی رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ اہل خانہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ خاص طور سے کنول پریشان تھی۔ جونہی یاسر اندر داخل ہوا وہ بلا جھجک اس پر چڑھ دوڑی۔

''یاسر! یہ کیا تماشا ہے...... کہاں گھومتے پھرتے ہو؟''

وہ مسکرایا۔ ''بھئی کل تم سب گھومتے پھرے تھے۔ میں نے اپنی باری آج لے لی۔''

''اچھی باری لی ہے...... کم از کم بتا کر تو جاتے۔''

''سب سو رہے تھے...... میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر پریشانی ہوئی ہے تو میں بہت بہت معذرت چاہتا ہوں۔''

''صرف کنول سے معذرت...... یا سب سے؟'' دیدی آشا نے شوخی سے کہا۔

''سب سے جناب، سب سے۔'' یاسر نے کہا۔

''مجھ سے بھی؟'' نٹ کھٹ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''سب سے زیادہ تم سے...... کیونکہ شاذی تمہاری بات بہت مانتی ہے اور میں اس سے اپنی ٹانگیں زخمی کرانا نہیں چاہتا۔''

سب ہنسنے لگے۔

رات ٹھنڈی اور ہوادار تھی۔ پچھلے پہر یاسر کی آنکھ کھلی۔ بدھا کے مندر میں سوتروں کا الاپ شروع ہو رہا تھا۔ یعنی پونے پانچ بجے تھے۔ یاسر لیٹا رہا اور خاموشی سے آواز کے دلفریب اتار چڑھاؤ کو اپنی سماعت میں جذب کرتا رہا۔ اسے یاد آیا کہ آج نو تاریخ ہے۔ پرسوں یعنی گیارہ تاریخ کو ابو کی سالگرہ تھی اور سالگرہ کے روز اسے ابو کو اور شائلہ کو ایک تحفہ دینا تھا...... ایک سرپرائز تحفہ۔ یہ تمنا کتنے ہی دنوں سے اس کے ذہن میں پل رہی تھی۔ وہ سوچتا رہا اور سوچتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ گہری نیند میں چلا گیا۔

اگلے روز صبح سویرے اسے سی ڈیز واپس کرنے کے لئے اپنے کمپنی کے ساتھی کے پاس جانا تھا۔ اس نے بذریعہ بس جانا مناسب سمجھا۔ واپسی ٹک ٹک پر ہوئی۔ جب وہ گھر واپس پہنچا، ساڑھے دس ہونے والے تھے۔ دھوپ میں کافی تیزی آ چکی تھی۔ ابھی وہ گھر سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اسے کمار بھائی کے گھریلو ملازم ویرال کی صورت نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں گتے کا ایک خوشنما ڈبا سا تھا۔ اس کا سانولا چہرہ خوشی سے سرخی مائل ہو رہا تھا۔ یاسر کو دیکھ کر وہ تیزی سے یاسر کے قریب چلا آیا۔

''یہ کیا ہے بھئی؟'' یاسر نے انگریزی میں اس سے پوچھا۔

''سوئیٹس صاحب جی...... میں یہ پڑوسیوں میں تقسیم کرنے جا رہا ہوں۔ یہ خوشی کا موقع ہے۔''

''خوشی کا موقع؟''

''جی صاحب جی...... آپ بھی منہ میٹھا کریں۔ وہ واپس آ گئے ہیں۔''

''کون......؟''

''کنول بی بی کے منگیتر جی۔''

یاسر یک ٹک ویرال کی طرف دیکھتا رہا۔ اس دوران میں نٹ کھٹ بھاگتا ہوا گھر کے دروازے سے نکلا۔ اس نے یاسر کو دیکھ کر دور ہی سے ہانک لگائی۔

''انکل جلدی آئیں۔ انکل خاور آ گئے...... انکل خاور آ گئے......''

یاسر کے قدم زمین میں پیوست تھے۔ وہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ کھڑے کھڑے پتھرا گیا ہے۔ گھر کے مین دروازے کے سامنے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک تو کمار بھائی کی اسٹیشن وین تھی، دوسری ایک والوو گاڑی تھی۔ ساتھ والی کوٹھی کی بالکونی میں دو انڈین عورتیں کھڑی دلچسپی سے کمار بھائی کے صحن میں دیکھ رہی تھی۔ قرب و جوار میں ہلچل سی محسوس ہوتی تھی۔

یاسر دھیمے قدموں سے چلتا دروازے کے سامنے پہنچا۔ سب سے پہلے کمار بھائی سے ہی ملاقات ہوئی۔ ان کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ انہوں نے یاسر سے مصافحہ کیا اور اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولے۔

''خاور آ گیا ہے یاسر...... میں اور چاچو ابھی اسے لے کر آئے ہیں...... ڈرائنگ روم میں ہے۔ میں ابھی تمہیں اس سے ملاتا ہوں۔''

''یہ تو...... بڑی خوشی کی خبر ہے۔'' یاسر نے کہا۔

اس کی نگاہ ٹی وی لاؤنج سے گزر کر خالہ سعدیہ پر پڑی۔ وہ اپنے کمرے میں جائے نماز پر تھیں اور سجدے میں گری ہوئی تھیں۔ ان کا جسم تشکر کی ہچکیوں سے ہل رہا تھا اور ان کے رونے کی آواز کمرے سے باہر تک آ رہی تھی۔ یاسر نے کنول کو دیکھنے کے لئے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تھی۔ وہ اسے دکھائی نہیں دی۔ اسے دیکھنے کے لئے وہ کامن روم کی طرف گیا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ یہاں انکل سلیمان موجود تھا۔ وہ فون پر بنگلور میں بات کر رہے تھے۔ دوسری طرف یقیناً سلطانہ ہی تھی۔ انکل سلیمان کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''ہاں...... ہاں...... پہلے سے ذرا کمزور ہو گیا ہے۔ لیکن بالکل ٹھیک ہے۔ ڈرائنگ روم میں سریش وغیرہ کے پاس بیٹھا ہے...... تم فون کے پاس ہی رہنا، میں ایک آدھ گھنٹے میں تمہاری بات کراتا ہوں اس سے۔''

اسی دوران میں نیچے سے کمار بھائی کی آواز آئی۔ ''یاسر...... کہاں ہو بھئی......

ادھر آؤ...... یاسر!''

یاسر دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا زینے اترا اور نیچے پہنچ گیا۔ خاور ڈرائنگ روم سے نکل آیا تھا اور کمار بھائی کے پہلو میں کھڑا تھا۔ دراز قد...... شانے چوڑے...... کھڑی ناک...... آنکھیں خوابیدہ اور سوجی سوجی...... بال گھنگھریالے اور لمبے۔ درحقیقت اس کے بال مختلف انداز کے تھے اور ان بالوں کی وجہ سے اسے فوراً پہچانا جا سکتا تھا۔ بالوں کا رنگ سرخی مائل تھا۔ ان میں چھوٹے چھوٹے گھونگھر تھے اور آرٹسٹک انداز میں یہ اتنے لمبے تھے کہ شانوں کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ جیکٹ اور سیاہ پتلون میں تھا اور خالی خالی نظروں سے یاسر کی طرف دیکھ رہا تھا...... یاسر نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ کمار بھائی بولے۔

''یاسر! یہ ہیں خاور صاحب...... اور خاور! یہ ہیں یاسر صاحب۔ آج کل ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کمپیوٹر انجینئر ہیں۔ بے حد نائس آدمی ہیں۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' خاور سپاٹ لہجے میں بولا۔

''اور مجھے بھی......'' یاسر نے کہا۔

یاسر کا خیال تھا کہ شاید وہ کچھ اور بھی کہے گا لیکن وہ بس ایک فقرے کی رسم ادا کر کے خاموش ہو گیا تھا، بلکہ کہیں کھو سا گیا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کم گو اور اپنے آپ میں گم رہنے والا شخص ہے۔ اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں ایک فنکارانہ تغافل تھا اور یاسر کو یہ تغافل ایسا برا نہیں لگا۔

گمبھیر خاموشی کو توڑنے کے لئے یاسر نے ایک دو رسمی باتیں کیں۔ اتنے میں دیدی آشا آ گئیں۔ انہوں نے ایک خاموش سی نظر یاسر پر ڈالی اور پھر خاور سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

''گرم پانی آنے لگا ہے...... تم نے شاور لینا ہے تو لے لو۔''

خاور اثبات میں سر ہلاتا ہوا دیدی آشا کے عقب میں چل دیا۔ کمار بھائی یاسر کو لے کر بالائی منزل پر آ گئے۔ انہوں نے یاسر کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''آٹھ بجے سے ذرا پہلے چاچو کو ایک فون آیا تھا۔ وہ ان کا کوئی جاننے والا تھا۔ اس نے چاچو کو اطلاع دی کہ خاور کینڈی میں ہے اور اس وقت ''دھرم شالا روڈ'' کی کوٹھی نمبر 18-A

میں موجود ہے ...... یہ اطلاع حیران کن تھی۔ ہماری معلومات کے مطابق تو خاور سری لنکا سے ہی جا چکا تھا۔ بہرحال اس اطلاع نے ہمیں فوری طور پر دھرم شالا روڈ کی طرف دوڑا دیا۔ میں نے سریش کے علاوہ پڑوسی مائیکل صاحب کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ ہمیں تیس چالیس فیصد سے زیادہ امید نہیں تھی کہ ہم خاور کو پا لیں گے ...... مگر موقع پر پہنچنے کے بعد سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہوتا چلا گیا۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے میں یہاں بے حد جذباتی مناظر دیکھنے میں آئے ہیں۔ رو رو کر سب کا برا حال ہو گیا ہے۔ خالہ سعدیہ تو نیم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ وہ بہت پیار کرتی ہیں خاور سے ......"

"خاور صاحب کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ وہ نیوجرسی میں دیکھے گئے ہیں۔ کیا وہ اطلاع غلط تھی؟"

"ہاں ...... وہ سری لنکا سے باہر نہیں گیا۔ پہلے ڈمبولا میں تھا پھر دو ڈھائی مہینے کے لئے Wilpattu چلا گیا۔ وہاں کے نیشنل پارک میں فوٹو گرافی کرتا رہا ...... اب قریباً دو ماہ سے وہ یہاں کینڈی میں تھا۔ یعنی چراغ تلے اندھیرا والی بات تھی۔ ہم اس کی کھوج میں کہاں کہاں گھوڑے دوڑا رہے تھے اور وہ چند کلومیٹر کے فاصلے پر موجود تھا ...... وہ بہت بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے مزاج کی سختی بھی پہلے سے کم محسوس ہوتی ہے ...... اب دیکھیں آگے حالات کس رخ پر جاتے ہیں۔"

جس وقت کمار اور یاسر گفتگو کر رہے تھے، کنول کی جھلک نظر آئی۔ وہ چند استری شدہ کپڑے لئے نچلی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ یاسر کو برآمدے میں دیکھ کر وہ ٹھٹکی ...... ایک لمحے کے لئے دونوں کی نظریں ملیں۔ جیسے برق سی کوند گئی۔ یاسر کو کنول کی آنکھوں میں نئی حقیقتوں کا پھیلا ہوا غبار نظر آیا۔ اس غبار کے پیچھے عجیب سی اداسی اور بے یقینی تھی۔ ان آنکھوں نے جیسے بے زبان خاموشی کہا تھا ...... یہ کیا ہوا ہے یاسر! رفاقتوں کے راستے پر یہ کیسا دوراہا پھوٹ پڑا ہے ...... یہ خوشی کی کیسی بارش ہے جس نے کشت حیات کو زیر آب کر دیا ہے؟

پھر وہ بوجھل پلکوں کے ساتھ نیچے اتر گئی۔ خالہ سعدیہ کی آواز یاسر کے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہ کنول کو پکار رہی تھیں اور پوچھ رہی تھیں۔

"خاور کے کپڑے استری ہو گئے بیٹی؟"

رات گئے تک گھر میں ہنگامہ رہا۔ یاسر سونے کے لئے جلدی لیٹ گیا ...... سونے کا تو بس اس نے بہانہ بنایا تھا۔ ورنہ وہ تنہائی چاہتا تھا۔ دل پر گہری سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ یہ کھل کر برسنا چاہتی تھیں۔ اس پانی کو آنکھوں کے راستے گزرنا تھا اور آنکھیں چغل خور ہوتی ہیں۔ یہ بتا دیتی ہیں کہ کتنا پانی گزرا ہے اور کتنی شدت سے گزرا ہے۔ لہٰذا وہ تنہائی چاہتا تھا۔ کینڈی کے آسمان پر آج تارے چمک رہے تھے مگر پھر بھی گھٹائیں برستی رہیں۔ جل تھل ہوتا رہا۔ رات دو بجے کے لگ بھگ وہ کمرے سے نکلا۔ اپنی پسندیدہ کھڑکی کے سامنے آ بیٹھا۔ پسندیدہ کھڑکی کے سامنے پسندیدہ جھیل تھی اور جھیل کے پار پسندیدہ کلس تھے اور اس سے آگے کینڈی کی پسندیدہ روشنیاں تھیں۔ مگر آج کچھ بھی پسندیدہ نہیں تھا۔ ہر منظر کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ جھیل، پام، کلس اور روشنی کے جگمگھٹے سب یہی کہہ رہے تھے ......"خاور آ گیا ...... اب تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ...... خاور آ گیا ...... اب تم اضافی ہو ...... اب تم وہ مہمان ہو جس کو رخصت کرنے کے لئے معذرت کے خوبصورت الفاظ سوچے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ الفاظ سننے سے پہلے ہی تم چلے جاؤ ...... رخصت ہو جاؤ۔"

اگلے روز بھی گھر میں زبردست گہما گہمی تھی۔ خالہ سعدیہ نے کپڑے کے بہت سے تھان منگوائے تھے۔ ان تھانوں کو پانچ پانچ چھ چھ میٹر کے ٹکڑوں میں کاٹا جا رہا تھا۔ انہیں کینڈی کے غریب مستحقین میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سا کھانا بھی اس مقصد کے لئے پکوایا جا رہا تھا۔ انکل سلیمان ان کاموں میں بہت مصروف نظر آتے تھے۔ خاور کی واپسی کے بعد انکل سے یاسر کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بس چند بار ان کی نگاہیں ہی ملی تھیں۔ ان نگاہوں نے بھی شاید وہی کچھ کہا تھا جو کل رات کھڑکی سے باہر کے مناظر کہتے رہے تھے ......"خاور آ گیا ...... اب تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ...... خاور آ گیا ...... اب تم اضافی ہو۔"

سہ پہر کے وقت اتفاقاً یاسر کی مشکل آسان ہو گئی۔ کولمبو سے نم کا فون آیا ...... مگر یاسر نے بہانہ بنایا کہ آفس سے فون آیا ہے۔ اسے جلدی واپس جانا ہے۔ اس نے اہل خانہ سے اجازت لی اور کولمبو واپس روانہ ہو گیا۔

□●□

اگلی رات اس کے لئے کنول کا فون آیا۔ یاسر سے بات کرنے کے بعد کنول زارو قطار رونے لگی۔

"تم اس طرح کیوں چلے آئے؟ کم از کم مجھ سے مل کر تو جاتے۔ تمہیں کیا پتہ میں نے کل کا دن کس طرح گزارا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم نے کل کا دن کس طرح گزارا ہے...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اگلے چند دن یا چند ہفتے کس طرح گزارو گی۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے۔"

"یاسر!" کنول نے غصے سے کہا۔ "بیوقوفوں والی باتیں مت کرو...... ہمارا رشتہ اتنا کمزور نہیں کہ کسی ایک شخص کے آنے یا جانے سے ٹوٹ جائے گا......"

"وہ کوئی ایک شخص نہیں ہے، وہ تمہارا منگیتر ہے۔ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہاری والدہ، تمہارے گھر والے، تمہاری فیملی، سب چاہتے ہیں کہ وہ تمہارا شریک حیات بنے۔ اس کی واپسی کے لئے منتیں مانی گئی تھیں۔ اس کی تلاش میں رات دن ایک کیا گیا تھا...... کونا کونا چھانا گیا تھا۔ اب وہ آ گیا ہے۔ اب تمہیں وہی کچھ کرنا چاہئے جو وقت کا تقاضا ہے۔"

"یاسر! میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔ بچوں کی طرح بی ہیو مت کرو۔ واپسی کا ایک وقت ہوتا ہے اور ہمارے لئے یہ وقت گزر چکا ہے۔"

"ابھی نہیں گزرا ہے کنول...... ابھی تم واپس جا سکتی ہو۔"

"تم المیہ فلموں کے ہیرو بننے کی کوشش مت کرو۔" وہ طیش سے، چیخ کر بولی۔

"ہمارا بندھن اٹوٹ ہے...... مجھے تو حیرت ہو رہی ہے تمہاری سوچ پر...... اگر تم نے اسی طرح باتیں کرنا ہیں تو میں...... فون بند کر رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے...... میں چپ ہو جاتا ہوں۔ وقت سب سے بڑا منصف ہے۔ وہ فیصلہ کر دے گا کہ میں صحیح تھا یا تم؟"

کنول چاہتی تھی کہ یاسر ویک اینڈ پر واپس آئے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہی تھی کہ خاور سے کچھ بھی نہیں چھپائے گی۔ بالکل جس طرح اس نے دیگر اہل خانہ سے کچھ نہیں چھپایا۔ وہ اپنے اور یاسر کے بارے میں ہر ہر بات خاور کو بتا دے گی۔

یاسر اسے سمجھاتا رہا، بتاتا رہا کہ وہ سچ ضرور بولے لیکن ایسا سچ نہ بولے جو رشتوں کو زخمی کرے اور حالات کو تہس نہس کر دے۔

وہ سنتی رہی۔ لیکن اس نے دل سے کچھ نہیں مانا۔

ہاں...... وہ سنتی رہی...... لیکن اس نے دل سے کچھ نہیں مانا...... اور اس کا ثبوت یاسر کو تین روز بعد مل گیا۔

وہ جولائی کی ایک ابر آلود شام تھی۔ یاسر رہائش گاہ کے وسیع برآمدے میں بید کی کرسی ڈالے خاموش بیٹھا تھا۔ نم باغ سے توڑے گئے تازہ آم کاٹ کر لایا اور یاسر کے سامنے رکھ دیئے۔ رم جھم برستی بارش میں یہ آم کھانے کا کچھ اور ہی مزہ ہوتا لیکن یاسر کے دل میں تو صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ایسے میں اسے کیا اچھا لگ سکتا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ یاسر اسی طرح بیٹھا رہا۔ نم نے فون ریسیو کیا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"یاسر! کینیڈی سے آشا صاحبہ کا فون ہے۔"

یاسر نے اٹھ کر دیدی آشا سے بات کی۔ دیدی آشا نے یاسر کا حال چال پوچھا۔ ان کے لہجے کے نیچے چلتی ہوئی درد کی لہر یاسر نے صاف محسوس کی۔ یقیناً انہوں نے بھی بدلتے موسم کے انداز دیکھ لئے تھے۔ بدلتا موسم...... جس میں زرد پتے جدائیوں کی علامت کے طور پر اُڑتے پھرتے تھے۔ دیدی آشا نے کہا۔

"یاسر! خالہ سعدیہ ہسپتال میں ہیں، انہیں ہلکا سا اٹیک ہوا ہے۔ آج دوپہر تک سی سی یو میں تھیں۔ اب وارڈ میں آ گئی ہیں۔ کوئی خطرے والی بات نہیں۔ پھر بھی میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں اطلاع دوں۔"

یاسر واقعی پریشان ہو گیا۔ خالہ سعدیہ کی من موہنی صورت اس کی نگاہوں میں

گھومی۔ ان کا سجدے میں گر کر رونا، تشکر کی ہچکیاں، آنسوؤں کے ریلے، سب کچھ اس کے ذہن میں آیا اور پھر یہ بھی ذہن میں آیا کہ کنول شاید اپنے مصمم ارادے کے مطابق سچ بولنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اگلے روز اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح کنول سے فون پر رابطہ ہو سکے لیکن ناکامی ہوئی۔ اس نے دیدی آشا کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ امی کے پاس ہسپتال میں ہے۔ چوبیس گھنٹے ان کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ کوشش کے باوجود وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی گھر نہیں آتی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ پرسوں تک باجی سلطانہ کے کینڈی آنے کا بھی امکان ہے۔

"خاور کہاں ہے؟" یاسر نے پوچھا۔

"وہ بھی ہسپتال میں ہے۔ سارا دن وہ بھی وہاں رہتا ہے، رات کو آ جاتا ہے۔ خالہ سعدیہ کی تکلیف نے اسے بھی غمزدہ کر دیا ہے۔ ویسے بھی وہ پہلے سے کافی بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

یاسر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ لوگوں نے میرے بارے میں خاور صاحب کو کیا بتایا ہے؟"

"ابھی تو کسی نے کچھ نہیں بتایا...... نہ ہی کوئی ایسی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ ہم سب اس کے لاابالی پن سے پہلے ہی بہت خوفزدہ ہیں۔ کوئی چھوٹی سی بات بھی اسے ہتھے سے اکھاڑ سکتی ہے۔"

"یہ بہت مناسب ہے...... آپ کنول کو بھی میری طرف سے تاکید کر دیں کہ وہ کوئی غیر ذمے دارانہ بات نہ کرے۔"

"وہ بہت محتاط ہو گئی ہے۔ خاص طور سے خالہ سعدیہ کی تکلیف کے بعد تو اس نے ایک دم چپ سادھ لی ہے۔ درحقیقت خالہ کی تکلیف کی وجہ بھی کنول کی ایک دو تیز ترش باتیں تھیں۔"

دیدی آشا سے بات کرنے کے بعد یاسر کو قدرے اطمینان ہوا۔ نجانے کیوں اسے محسوس ہونے لگا کہ کنول میں تبدیلیاں آنے والی ہیں۔

ان تبدیلیوں سے کیا مراد ہے؟...... یاسر نے خود سے سوال کیا۔ ذہن نے جواب

دیا ان تبدیلیوں سے مراد یہ ہے کہ کنول خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جائے گی...... یعنی قربت کے بعد دوری کا سفر شروع ہو جائے گا۔ تو کیا یوں وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے......؟ یہ بڑا ہولناک خیال تھا۔ اس خیال سے روح لرز اٹھتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس سانحے کے بعد زندگی کا جواز ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔

برسات کی ہوا اس کے جسم میں آگ بھڑکا رہی تھی۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ جان لیوا تپش کے نرغے میں تھا۔ نم اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور سری لنکن چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ پاس ہی کہیں ریڈیو سیلون سے پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ قوالی کی صورت میں یہ الفاظ بار بار دہرائے جا رہے تھے۔

"یہ عشق نہیں آساں...... یہ عشق نہیں......"

......اگلے ایک ماہ میں حالات میں تیزی سے تبدیلیاں آئیں۔ کینڈی میں جو کچھ چل رہا تھا یاسر اس سے تقریباً بے خبر ہی تھا۔ پھر بھی کسی وقت دیدی آشا کا فون آ جاتا تھا اور اندازہ ہو جاتا تھا کہ صورت حال کس نہج پر ہے۔ خالہ سعدیہ کو درمیانے درجے کا دورہ پڑا تھا۔ وہ کافی دیر بے ہوش رہی تھیں۔ ڈاکٹر مستقبل قریب میں بائی پاس کا مشورہ دے رہے تھے۔ ہسپتال سے آنے کے بعد بھی ایک دو بار ان کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔

کینڈی سے دو بار کنول کا فون بھی آیا۔ وہ اب بھی فون پر روتی تھی اور یاسر کو یقین دلاتی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ مگر یاسر محسوس کرتا تھا کہ اب اس کے لہجے میں پہلے جیسا دم خم نہیں ہے۔ غالباً غیر محسوس طور پر اہل خانہ کا دباؤ اور خالہ سعدیہ کی ناسازئ طبع اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ خاص طور سے خالہ سعدیہ (والدہ) کے بارے میں وہ بہت فکرمند رہتی تھی۔

دیدی آشا سے جو معلومات مل رہی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ پورا گھرانہ اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کوئی بات خاور کے مزاج کے خلاف نہ ہونے پائے۔ ان کوششوں میں کنول بھی شامل ہے۔ وہ اپنے دلی جذبات سے قطع نظر خاور سے ہنستی بولتی ہے اور کوشش کر رہی ہے کہ وہ پھر سے بکھر نہ جائے۔

خاور کی سیلانی طبع سے سب واقف تھے۔ وہ ہر پہلو سے ایک آرٹسٹ ہی تھا۔ حساسیت، تغافل، زود رنجی، کج ادائی سب کچھ اس میں موجود تھا۔ محبت کرنے پر آتا تھا تو سب کچھ نچھاور کر دیتا تھا...... جب رونیہ بدلتا تھا تو مڑ کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ یہ امر اپنی جگہ حقیقت تھا کہ وہ خالہ سعدیہ سے محبت کرتا تھا اور کنول کو بھی چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی مسلمہ حقیقت تھی کہ دماغ گھوم جانے کی صورت میں وہ انہیں یکسر نظر انداز کر سکتا تھا اور اس کا ثبوت پچھلے دو ڈھائی برس تھے۔ اس نے ماں بیٹی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر اس کا کھوج نہ لگتا اور انکل سلیمان وغیرہ کھینچ تان کر اسے گھر نہ لے آتے تو شاید وہ مزید دو چار سال اہل خانہ کو صورت نہ دکھاتا۔

ایک روز نصف شب کے وقت کنول نے اسے فون کیا۔

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں...... کیا ایمرجنسی ہے؟"

"تمہاری صورت کو ترس گئی ہوں یاسر۔ تمہیں یاد کرتی ہوں تو تمہارا چہرہ دھیان میں نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے کہ نقش دھندلے پڑتے جا رہے ہیں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اب نقوش کو دھندلا پڑنا ہی چاہئے۔"

"دیکھو، تم طنز کرتے ہو تو میرا دل خون ہو جاتا ہے...... پلیز یاسر! پلیز طنز نہ کرو۔ مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ تم جو کہو گے میں کروں گی۔ میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر دنیا کے آخری کونے تک جا سکتی ہوں۔ اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا سکتی ہوں۔ تم جو چاہو کر سکتی ہوں۔ فار گاڈ سیک...... مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

یاسر کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ "تم جو فقرے استعمال کر رہی ہو، وہ حوصلہ افزاء ہیں۔ پہلے تم مجھے بتاتی تھیں کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو۔ تم پوری دنیا سے ٹکرا کر بھی مجھ تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ آج تم مجھ سے کہہ رہی ہو کہ میں تمہیں گائیڈ لائن دوں۔ مطلب ہے کہ حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ جنون عقل میں بدل رہا ہے اور عقل مصلحت کا رخ کرنے والی ہے اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ یقین کرو کنول! میں اس پر خوش ہوں۔ خونی رشتوں کو قتل کر کے ہم اپنی محبت کا تاج محل تعمیر نہیں کر سکتے۔ ایسا تاج محل تعمیر کریں گے تو محبت مر جائے گی اور تاج محل محبت سے ہے، محبت تاج

محل سے نہیں۔"

"ایسے گھسے پٹے مکالمے فلموں ڈراموں میں بہت سنے ہیں یاسر! پلیز تم حقیقت کی دنیا کی بات کرو۔ ہم ایک دوسرے کا درد سمجھتے ہیں، ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ تمہارے دل میں کچھ اور ہے، زبان پر کچھ اور۔"

"ازلی جھوٹا جو ٹھہرا......" یاسر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم کچھ بھی معاف نہیں کرتے ہو۔" وہ بھی رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ پھر شاید وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ اس نے فون بند کر دیا۔

اگلے ہفتے میں ایسی ہی دو ٹیلی فونک ملاقاتیں مزید ہوئیں۔ وہ جدائی کی زد میں تھے۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یاسر کے ذہن میں کہیں پڑھا ہوا ہائیکو بار بار گونجتا تھا۔

کچھ بھی نہ بدلنا ہے
ہم نے بھی محبت کی
ہم نے بھی بچھڑنا ہے

□●□

وہ ہفتے کی ایک ابر آلود شام تھی۔ کولمبو کی فضا میں قدرے حبس تھا۔ نم کہیں گھومنے نکلا تھا مگر یاسر کمرے میں بند بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے کولمبو میں گھومنے سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ پورا کولمبو ایک خون اگلتی یاد بن گیا ہے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف دیدی آشا تھیں۔ دیدی آشا نے وضاحت سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن ان سے جو باتیں ہوتی تھیں وہ یاسر کو مستقبل کی واضح جھلک دکھاتی تھیں۔ دیدی آشا نے بین السطور یاسر کو یہ سمجھا دیا تھا کہ اسے اور کنول کو خالہ سعدیہ اور پورے گھرانے کی بقا کے لئے اپنے تعلق کی قربانی دینا ہوگی۔ اور یاسر نے دل پر برداشت کا بہت بھاری پتھر رکھنے کے بعد رضامندی ظاہر کر دی تھی کہ وہ اس قدیم قربان گاہ پر لیٹ جائے گا۔

کچھ بھی نہ بدلنا ہے
ہم نے بھی محبت کی

ہم نے بھی بچھڑنا ہے

دیدی آشا رسمی باتوں کے بعد اصل موضوع پر آ گئیں۔ انہوں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''یاسر! اب مشکل مرحلہ آ گیا ہے۔ بنگلور میں دادی ماں کا اصرار شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ انکل سلیمان اور دوسرے بزرگوں کا خیال ہے کہ کنول کی شادی جلد سے جلد ہو جائے ...... یہ سب لوگ ایک ہفتے کے اندر اندر بنگلور واپس جانا چاہتے ہیں۔''

ایک ٹیس یاسر کے سینے میں اٹھی اور پورے رگ و پے میں پھیل گئی۔ وہ آواز کی اندوہناک لرزش کو قابو میں رکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے کیا کرنا ہے دیدی؟''

''کنول بہت دکھی ہے۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی۔ تم اسے سمجھا سکتے ہو، صرف تم ہی سمجھا سکتے ہو۔''

''پلیز دیدی! مجھے ان کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔'' یاسر نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ یوں لگا کہ دیدی آشا سے ریسیور کسی اور نے لے لیا ہے۔ پھر ایک جانی پہچانی آواز یاسر کے کانوں میں پڑی۔ یہ کنول کی بڑی بہن سلطانہ تھیں۔ خالہ سعدیہ کی تکلیف کی سنگینی کے پیش نظر وہ کینڈی میں ہی تھیں۔ ان کی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی۔ چند رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ بولیں۔

''یاسر! میں جانتی ہوں موجودہ حالات نے تمہیں بھی بہت دکھی کیا ہے۔ دکھی شخص کو مزید دکھ سونپنا سخت بے رحمی ہے۔ لیکن کیا کریں...... مجبوری نے خود غرض بنا دیا ہے۔ تم جانتے نہیں کہ خاور کی واپسی کے بعد امی جان کی کیا کیفیت ہو گئی ہے۔ ان کے دماغ میں دن رات بس ایک ہی خیال سمایا ہے۔ وہ جلد از جلد کنول اور خاور کا بیاہ کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اپنی ذہنی کیفیت کے کارن انہیں کچھ ہو نہ جائے۔''

وہ دیر تک اس موضوع پر بولتی رہیں اور آنسو بہاتی رہیں۔ ساتھ ساتھ وہ یاسر کو سنبھالا دینے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کنول خود کو کسی حد تک سنبھال چکی ہے لیکن ابھی بہت سا سنبھلنا باقی بھی ہے۔ اس طویل گفتگو کا اختتام یاسر کے اقرار پر ہوا۔ اس نے باجی سلطانہ سے وعدہ کیا کہ وہ کینڈی آ کر کنول سے ایک ملاقات ضرور کرے گا۔ اسے اس راستے پر لانے کی کوشش کرے گا جو

قدرت نے ان سب کے لئے منتخب کر لیا ہے ...... اور جس پر چلنے میں ہی ان سب کا فائدہ ہے۔

باجی سلطانہ نے یاسر سے درخواست کی کہ وہ کل کا دن چھوڑ کر کینڈی آئے۔ انہوں نے بتایا کہ خاور کل اپنے سفری کاغذات مکمل کرانے کے لئے انکل سلیمان کے ساتھ کولمبو جا رہا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں کنول اور یاسر کا ملنا مناسب رہے گا۔



وہ عجیب ماحول تھا۔ وہ عجیب ملاقات تھی......

ان کے گرد جیسے آنسوؤں کی چادر تنی ہوئی تھی۔ یہ ایک سرسبز چوٹی پر ''فلاور گارڈن'' تھا۔ یہاں سے کینڈی نشیب میں ایک تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔ مندروں، آبی ذخیروں، شفاف سڑکوں اور سرخ چھتوں والی ایک خوبصورت تصویر، لیکن اس وقت تو کچھ بھی خوبصورت نہیں تھا۔ ہر شے ایک غم ناک دھندلکے میں لپٹی ہوئی تھی۔ دوپہر دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی سہ پہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے بعد شام ہونے والی تھی۔ شاید ان کے تعلق کی بھی شام ہونے والی تھی۔ شام...... جس کے بعد گہرا اندھیرا ہوتا ہے۔

کنول کا ہاتھ یاسر کے ہاتھ میں تھا۔ آج دونوں کے ہاتھ سرد تھے۔ آج یاسر کے خون سے اٹھنے والا وہ میٹھا میٹھا درد بھی کہیں نہیں تھا جو اس کے سارے جسم میں پھیلتا تھا اور اس پر نشے کی سی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔ اس درد کی جگہ اب سینے میں ایک زخم سا تھا جو گاہے گاہے رِستا تھا اور اس کے رِسنے سے نقاہت بڑھنے لگتی تھی۔

پچھلا قریباً ڈیڑھ مہینہ ان دونوں نے بے طرح تڑپتے ہوئے ہی گزارا تھا...... انگاروں پر لوٹتے ہوئے اور اپنے ہی آنسوؤں کے لہو میں خود کو بھگوتے ہوئے...... لیکن اب پتہ نہیں کیا بات تھی، دھیرے دھیرے قرار آنے لگا تھا۔ جیسے ہسپتال میں رات بھر روتا کرلاتا ہوا مریض صبح دم نڈھال سا ہو کر اونگھنے لگے۔

کنول نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یاسر! میں کیسے جی سکوں گی تمہارے بغیر...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔''

''ہماری سمجھ میں تو اور بھی بہت کچھ نہیں آتا کنول کیا وہ سب کچھ ناممکن ہوتا

ہے...... میرے خیال میں نہیں۔ قدرت آگے بڑھنے والے قدموں کے لئے ان دیکھے راستے نکالتی ہے۔"

"خود کو تسلی دے رہے ہو یا مجھے؟"

"دونوں کام کر رہا ہوں۔" یاسر نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

اس کا دھیان کنول کی خالی انگلی کی طرف چلا گیا۔ اس انگلی سے چند ماہ پہلے کنول نے خاور کی انگوٹھی نکالی تھی۔ اب یہ انگوٹھی شاید پھر اس کی انگلی میں آنے والی تھی۔ وہ انگلی کو سہلانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں تازہ نمی چمک گئی۔ کنول نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا پھر بے اختیار اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"کنول، میں بھولوں گا نہیں۔" وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ "میں بھول ہی نہیں سکتا ...... تم ہر گھڑی میرے سامنے رہو گی۔ کبھی سہانی شام بن کر، کبھی ساون کی بارش بن کر، کبھی چاند، کبھی ہوا بن کر۔"

"نہیں یاسر ...... ایسا مت کہو ...... اگر ساتھ نہیں چلنا تو پھر بھول جانا ہے۔ ایک دوسرے کی دنیا سے نکل رہے ہیں تو پھر من سے بھی نکل جائیں گے۔ دوہرا جیون گزارنا ٹھیک نہیں۔"

"تم ایسا کر لینا ...... میں بھی کوشش کروں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ نہیں کر سکوں گا ...... ہاں کنول! میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ آنسو اندر ہی اندر اس کے حلق میں گرتے رہے۔ ایک دم ہی عجیب کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی۔ اس کیفیت کے زیر اثر وہ بولا۔

"کنول! جب جب موسم بدلیں گے، جب جب پھول کھلیں گے، جب جب برسات ہو گی اور بھیگے درختوں کے نیچے لوگ ایک دوجے سے ملیں گے، میں تمہیں یاد کروں گا۔ میں تمہیں یاد کئے بغیر رہ ہی نہیں سکوں گا۔"

"نہیں ...... تم ایسا نہیں کرو گے۔ زندگی میں بہت سی باتیں تم سے منوانا تھیں۔ اب ان ساری باتوں کے بدلے ایک بات مان لو ...... پاکستان واپس پہنچ کر کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لینا۔ کہتے ہیں اچھوں کے ساتھ اچھا ہی ہوتا ہے۔ تمہیں بھی ضرور کوئی اچھی بیوی ملے گی۔ وہ تمہارے دکھوں کو بہت جلد اپنی پلکوں سے چن لے

گی۔ پھر ...... تمہارے گھر میں پھول کھلیں گے ...... پھولوں کی خوشبو پھیلے گی۔ جیون اپنے راستے خود ڈھونڈ لے گا ...... بتاؤ، جلد شادی کرو گے نا؟"

"میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہیں کروں گا۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی تو دیر تک لاوارث محبت کو تھپکیاں دینی ہیں، اس کے آنسو پونچھنے ہیں، اس کے زخموں پر مرہم رکھنی ہے۔ اس میں پتہ نہیں کتنا وقت لگے گا۔ جب یہ وقت گزر جائے گا، پھر سوچوں گا۔"

کنول نے یاسر کے ہاتھ کی پشت چومی۔ دو گرم آنسو ہاتھ کی پشت پر گر گئے۔ وہ بولی۔ "ایک مشورہ دوں یاسر! ...... مانو گے نا؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"میں نے انگلش کی ایک ٹرو اسٹوری کا ترجمہ کیا تھا۔" وہ بولی۔ "اس میں ایک نوجوان انجینئر کے ساتھ وہی کچھ ہوتا ہے جو میری وجہ سے تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔ وہ سخت ترین ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے لیکن پھر وہ اپنا علاج خود کرتا ہے۔ وہ خوب گھومتا پھرتا ہے۔ نائٹ لائف انجوائے کرتا ہے، چند اچھے دوست بناتا ہے۔ خود کو اتنا مصروف کر لیتا ہے کہ اس کے پاس بیٹھنے اور سوچنے کا سمے ہی نہیں رہتا۔ دھیرے دھیرے وہ نارمل لائف کی طرف آ جاتا ہے ...... پلیز یاسر! تم بھی ایسا ہی کچھ کرنا ...... تمہیں گھومنے کا شوق ہے نا؟ کسی فارن ٹور پر نکل جانا۔ بتاؤ ...... کرو گے نا ایسا؟"

"اچھا ...... پاکستان جا کر سوچوں گا۔"

"کس بارے میں؟"

"فارن ٹور کے بارے میں۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"انڈیا نہ چلا جاؤں؟ سنا ہے کہ بنگلور خوبصورت جگہ ہے۔" یاسر کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ ابھری۔

کنول نے سرد آہ بھرتے ہوئے یاسر کے کندھے سے سر ٹکایا۔

"میں جانتی ہوں تم کبھی ایسا نہیں کرو گے۔ بنگلور تو دور کی بات ہے تم زندگی بھر انڈیا میں بھی قدم نہیں رکھو گے۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح جان چکی ہوں۔ تم پلٹ کر دیکھنے والوں میں سے نہیں ہو۔"

"اگر ایسی بات ہے تو مجھے جانے کیوں دے رہی ہو؟"

کنول کی آنکھوں میں ایک دم موٹے موٹے آنسو نمودار ہو گئے۔ وہ یاسر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تو نہ جاؤ۔"

"تو نہ جاؤ......"

ان تین لفظوں کی گونج جیسے زمین سے آسمان تک چلی گئی۔ پوری کائنات میں پھیل گئی۔ یاسر اور کنول ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ یاسر نے کہا۔

"اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"سارے حالات تمہارے سامنے ہیں...... لیکن اگر تم ایک بار کہہ دو گے تو پھر میں ہر نتیجے کی طرف سے آنکھیں بند کر لوں گی۔ تم بھی بند کر لینا۔ پھر مصیبت سے موت تک جو بھی سامنے آئے گا، جھیل لیں گے۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں جانتے تھے کہ کچھ باتیں کہنا آسان ہوتی ہیں، ان پر عمل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایسی دیوار کو مسمار کرنے کی بات کر رہے تھے جو قرنوں سے ناقابل تسخیر تھی۔ یہ تہذیب در تہذیب مضبوط کی گئی۔ وہ دیوارِ گریہ تھی جس نے محبت کرنے والوں کو ہر دور میں لاچار کیا تھا۔ اس دیوار کو آنسوؤں سے بھگویا تو جا سکتا تھا اس کو گرانے کی کوشش میں جان تو دی جا سکتی تھی مگر اس کو راستے سے ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ محبت کی دشمن اس دیوار کی بنیادوں میں لاشوں کے انبار تھے اور اس انبار میں ہر روز اضافہ ہوتا تھا۔

کنول نے ابھی جو کچھ کہا تھا اس کو سنجیدگی سے لینا یاسر کے لئے ممکن نہیں تھا۔ وہ یہاں کنول کو منتشر کرنے کے لئے نہیں اسے یکسو کرنے کے لئے آیا تھا اور پچھلے دو گھنٹے میں اس نے خلوصِ دل سے یہ کوشش کی تھی۔

ایک نوجوان جوڑا بانہوں میں بانہیں ڈالے ان کے سامنے سے گزر گیا۔ منچلوں کی ایک ٹولی گٹار پر ساز بجاتی نشیب کی طرف چلی گئی۔ دو نوعمر لڑکیاں تیز ہوا میں ہاتھ سے چھوٹ جانے والے غبارے کو پکڑنے کی کوشش میں گر پڑیں اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔ ان ہنستے کھیلتے لوگوں سے کتنی دور تھے وہ دونوں۔ انہیں لگا کہ وہ کسی اور دنیا کے باسی ہیں۔

تیز ہوا کے جھونکوں کے بعد ایک دم ہی بارش ہونے لگی۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی تیزی سے ایک سائبان کے نیچے چلے گئے۔ بارش دلوں میں ترنگ جگاتی ہے لیکن دیکھا جائے تو ترنگ بارش میں نہیں دل میں ہوتی ہے۔ ترنگ کسی بھی شے میں نہیں ہوتی، دل میں ہوتی ہے اور دل ویران تھے۔ بارش طول پکڑ رہی تھی۔ آہنی چادر کے خوبصورت چھجے تلے فائبر گلاس کا ایک بینچ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ الگ الگ کرسیاں بھی تھیں۔ وہ دونوں اس بینچ پر بیٹھنے لگے لیکن وہ ٹوٹا ہوا تھا۔ مجبوراً انہیں دو الگ نشستوں پر بیٹھنا پڑا۔ یاسر نے کہا۔

"دیکھو، اب قدرت کو بھی ہمارا ایک ساتھ بیٹھنا پسند نہیں ہے۔"

"کیا تم شگون پر وشواس رکھتے ہو؟"

"میں اب کسی چیز پر بھی وشواس نہیں رکھتا......" وہ پانی میں بنتے مٹتے بلبلوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

دونوں خاموشی سے بارش کی آواز سننے لگے۔ دھیرے دھیرے یہ آواز مدھم ہوتی گئی۔ قرب و جوار میں چھایا ہوا اندھیرا کم ہونے لگا۔ چھجوں تلے جمع لوگ پھر سے روشوں پر نظر آنے لگے۔ کنول نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یاسر! ایک بات مانو گے؟"

"جو کہنا ہے آج کہہ لو۔"

"تمہارے ساتھ ایک بار پھر سکیریا جانے کو جی چاہتا ہے۔"

"سکیریا؟"

"ہاں...... اُسی چٹانی سائبان تلے جہاں ہم نے لنچ کیا تھا...... جہاں تاڑ اور کیلے کے جھنڈ تھے اور ٹھنڈی ہوا سن سن کرتی گزرتی تھی۔ کتنا سہانا منظر تھا وہ...... میں اسے ایک بار...... ایک آخری بار...... پھر تمہارے ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

یاسر چپ ہو گیا۔ اس کی جھکی ہوئی پلکوں کے نیچے تذبذب تھا۔

"کیا سوچنے لگے ہو؟" کنول نے کھوئی کھوئی آواز میں پوچھا۔ اس کی آواز میں حسرت تھی۔

"اب تو کافی وقت ہو گیا ہے...... دو بجنے والے ہیں۔"

"نہیں ......ہم کل چلیں گے۔ سارا دن وہاں گزاریں گے۔"

"مگر انکل سلیمان......؟"

"تمہیں بتایا ہے نا کہ چاچو اور خاور کے آنے کا امکان نہیں۔ کولمبو میں ان کا کام کم از کم دو دن کا ہے۔"

یاسر خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد اس کی خاموشی میں نیم رضامندی کی جھلک نظر آنے لگی۔

"پھر......ٹھیک ہے نا؟" کنول نے پوچھا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" یاسر نے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ آج کینڈی میں اس کی آخری رات ہے۔ کل وہ یہاں نہیں ہوگا۔ اسے بھوک بالکل نہیں تھی۔ پھر بھی اہل خانہ کے ساتھ ڈنر کرنے کے بعد وہ اپنی پسندیدہ کھڑکی میں آ بیٹھا۔ ہوا میں خوشبو اور نرمی تھی۔ نیچے مین دروازے کے سامنے شاڈی اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ ٹانگیں پسارے سو رہی تھی۔ ہوا کے جادو نے شاید ان دونوں حیوانوں پر بھی اثر کیا تھا۔ یاسر آج شاڈی کی آواز بھی سننا چاہتا تھا۔ کھڑکی میں چند سری لنکن سکے پڑے تھے۔ غالباً ایک روپے والے تھے۔ یاسر نے یہ سکے اٹھا اٹھا کر نیچے شاڈی کو مارنے شروع کر دیئے۔ پانچ چھ روپے کے "خرچ" کے بعد شاڈی جانی پہچانی آواز میں بولنے لگی۔ حسب معمول اسسٹنٹ بھی اس کا ساتھ دینے لگا۔ یاسر نے انہیں زیادہ بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا اور آواز سننے کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور خالہ سعدیہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کنول نے بتایا تھا کہ وہ ان دونوں کے شدید رومانی تعلق کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ انہیں بس اتنا معلوم ہے کہ وہ اچھے دوستوں کی طرح ہیں اور یہ ایسی دوستی ہے جو بزرگوں کے کہنے پر ازدواجی رشتے میں بھی بدل سکتی ہے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ یاسر اور کنول ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں اور خاور کے آنے سے ان کی زندگی میں طوفان برپا ہوا ہے تو یقیناً ان کی اپنی زندگی بھی شدید ترین طوفان کی زد میں آ جاتی۔ یہ ان کے لئے دہری اذیت ہوتی۔ ایک طرف خاور اور کنول کو یکجا کرنے

کی دیرینہ آرزو انہیں ریزہ ریزہ کرتی دوسری طرف کنول اور یاسر کا دکھ ان پر قہر توڑتا۔

جھیل میں ایک کشتی آہستہ روی سے جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کہ اس میں کون تھا۔ کوئی تارک الدنیا بھکشو، کوئی سیاح جو کسی دور دیس سے تعلق رکھتا تھا یا پھر کوئی رومانی جوڑا۔ وہ جو کوئی بھی تھا کشتی کے اندر تھا اور نیم تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔ یاسر اس کو نہیں دیکھ سکتا تھا، کبھی بھی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ کون ہے، یا کون ہیں؟ بے شمار چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہم کبھی نہیں دیکھ سکتے، ان کے بارے میں کبھی نہیں جان سکتے۔ وہ ہمارے قریب سے گزر جاتی ہیں اور ہم باقی کی ساری زندگی ان کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ یاسر کا ذہن کہاں سے کہاں پہنچنے لگا تھا۔ وہ اس اجنبی کشتی کو اس کے اجنبی سواروں سمیت دیکھتا رہا اور اس کا ذہن نجانے کہاں کہاں گھومتا رہا۔

آج وہ نیلی جھیل اور سنہری کلسوں والے منظر کو اس طرح اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتا تھا کہ عمر بھر ان کے نقوش ذہن میں موجود رہیں۔

کنول کی باجی سلطانہ کمرے میں تھیں اور خالہ سعدیہ کو دوا کھلا رہی تھیں۔ انہیں بمشکل دوا کھلانے کے بعد وہ باہر نکلیں اور یاسر کے پاس کرسی پر آ بیٹھیں۔ وہ درمیانی عمر کو پہنچ چکی تھیں لیکن اب بھی ان کے چہرے پر دلکشی کے جزیرے پائے جاتے تھے۔ اپنے دیگر اہل خانہ کی طرح وہ بھی شکل وصورت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حقیقت پسند قسم کی خاتون نظر آتی تھیں۔ وہ بھی موجودہ صورت حال کی ساری کج ادائی کو سمجھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ کنول اور یاسر قریب آ چکے تھے۔ ان کی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا جا رہا تھا۔ مگر اچانک خاور کے آ جانے سے سارے نقشے اور سارے رستے تبدیل ہو گئے تھے۔

وہ یاسر سے تسلی تشفی کی باتیں کرتی رہیں اور رمزیہ انداز میں اسے سمجھاتی رہیں کہ امی (خالہ سعدیہ) اور دیگر بزرگوں کی رضا کی خاطر انہیں یہ کڑوا گھونٹ بھرنا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے خاص طور سے خالہ سعدیہ کی بیماری کا ذکر کیا۔ انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ امی کو اگر کوئی بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑتا تو ان کی جان جا سکتی ہے اور اگر جان بچ بھی گئی تو وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں رہ سکیں گی۔

اور یاسر جانتا تھا کہ سلطانہ درست کہہ رہی ہیں۔ خالہ سعدیہ کی ذہنی کیفیت عجیب

ہو رہی تھی۔کل بھی وہ سوتے سے اچانک اٹھ پڑی تھیں۔شدید پریشانی کے عالم میں خاور خاور کی دہائی دینے لگی تھیں۔خاور تو کولمبو گیا ہوا تھا۔انہوں نے خاور کی ایک فریم شدہ تصویر اٹھالی تھی اور اسے سینے سے لگا لیا تھا۔اسے وارفتگی سے چومنے لگی تھیں۔ چومتی چلی گئی تھیں اور کہتی چلی گئی تھیں ...... میں عمرے پر جاؤں گی۔ میں خاور اور کنول کے لئے جاؤں گی۔ میں کعبے کی چوکھٹ پکڑ کر ان کے لئے دعا کروں گی۔ میں ان کی ساری بلائیں اپنے سر لوں گی......

ان کی حالت دیدنی تھی۔انہیں بمشکل سنبھالا گیا تھا اور چپ کرایا گیا تھا۔سلطانہ نے کہا۔

''جسمانی طور پر امی کی حالت اب بہتر ہے لیکن اس کی کسر دوسری طرف نکل گئی ہے۔وہ ذہنی طور پر اب شدید دباؤ میں آ گئی ہیں۔ان کو جانکاری ہے کہ دادی ماں کے اصرار کے کارن کنول کی شادی جلد سے جلد ہونی ہے۔اگر خاور نے پچھلی بات کا بدلہ لینے کے لئے شادی میں تاخیر کرنا چاہی تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔''

''کیا خاور صاحب نے کوئی ایسی بات کہی ہے؟''

''دس پندرہ دن پہلے کہی تھی۔لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس نے صرف اپنی سابقہ ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔امی اور چاچو نے اس سے باقاعدہ معذرت کی ہے۔مجھے وشواس ہے کہ وہ اپنی بات پر اڑے گا نہیں۔''

یاسر نے دل پر برداشت کا بھاری پتھر رکھتے ہوئے پوچھا۔''کب تک ارادہ ہے شادی کا؟''

''چاچو کا پروگرام ہے کہ چھ سات دن تک انڈیا واپس پہنچ جائیں۔شادی کے لئے پہلے تو اگلے مہینے کے پہلے ہفتے کا ارادہ تھا لیکن اب امی عمرے پر اصرار کرنے لگی ہیں۔ان کے ذہن میں یہ بات سما گئی ہے کہ شادی سے پہلے عمرہ ضرور کریں گی۔وہ سات دن کے لئے جائیں گی۔اس کا مطلب ہے شادی دوسرے یا تیسرے ہفتے میں ہو سکے گی۔''

''پلیز......عمرے کے سلسلے میں آپ ان کی خواہش ضرور پوری کریں۔''

''ابھی تم آوازیں سن ہی رہے ہو گے۔میں ان کو دوا کھلا رہی تھی لیکن نہیں مان

رہی تھیں۔کہہ رہی تھیں کہ نہیں کھاؤں گی۔میں بالکل ٹھیک ہوں ...... میں نے کہا کہ اگر عمرے پر جانا ہے تو پھر دوا باقاعدگی سے کھانا ہوگی۔تب کہیں جا کر آمادہ ہوئیں۔''

اتنے میں نٹ کھٹ اچھلتا کودتا آ گیا۔یاسر سے مخاطب ہو کر بڑی معصومیت سے بولا۔''انکل! کیا آپ نے آنٹی کنول سے کٹی کر دی ہے؟''

''کیوں......کیا ہوا؟'' سلطانہ نے پوچھا۔

''انکل، آنٹی سے بولتے جو نہیں۔وہ کمرے میں لیٹی زور زور سے رو رہی ہیں ......میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔''

سلطانہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اٹھ کر نٹ کھٹ کے ساتھ کنول کے کمرے کی طرف چل دی۔

یاسر جھیل کے منظر پر الوداعی نظر ڈالتا ہوا کمرے میں آ گیا۔اس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔کاغذ قلم پکڑا اور ایک خط لکھنے میں مصروف ہو گیا۔



اگلے روز وہ ایک بار پھر دنیا کے آٹھویں عجوبے سیگیریا کی طرف جا رہے تھے۔ لیکن آج ان کے جانے اور پہلے کے جانے میں فرق تھا۔تب جذبے جواں تھے، کانوں میں رس بھرے نغمے گونجتے تھے اور آنکھوں میں سنہری خواب سجے ہوئے تھے۔ آج ایک پہاڑ جیسا غم تھا جو دل کو روندتا ہوا گزرتا تھا اور تشنہ آرزوؤں کا دھواں سینے میں بھرتا تھا۔شاید وہ دونوں خود اذیتی کے لئے سیگیریا جانا چاہتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ وہی راستہ ہوگا، وہی سفر، وہی مناظر...... ہر پل ایک نئی یاد کا کانٹا سینے میں چبھے گا، اندر تک اتر جائے گا۔پھر بھی وہ جا رہے تھے۔اس مرتبہ انہوں نے ''انٹرسٹی بس'' مس نہیں کی۔وہ صبح وقت پر پہنچے اور سرسبز کینڈی سے نکل کر سیگیریا کی طرف روانہ ہو گئے۔دیکھے بھالے مناظر ایک بار پھر آنکھوں کے راستے دل میں اترنے لگے لیکن آج ان مناظر کا رنگ ڈھنگ دوسرا تھا۔ایک زرد سوگوار اداسی نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔پھولوں کے جسم پارہ دکھائی دیتے تھے اور درختوں کے پتے آنسوؤں کی طرح جھڑتے تھے۔کنول اپنی باسکٹ میں آج بھی کھانے کی کچھ چیزیں لائی تھی۔چکن شیشلک، ڈرم اسٹکس، کولڈ ڈرنکس، آسٹریلیا کا خشک دودھ اور فروٹ۔یہ ساری

پسندیدہ چیزیں تھیں لیکن آج انہیں دیکھ کر یاسر کا دل گھبرا رہا تھا...... پچھلی مرتبہ وہ کھٹارہ بس کا پسینے میں بھیگے ہوئے سری لنکنز کے درمیان گھس کر سگیریا پہنچے تھے۔ آج ایئر کنڈیشنڈ انٹرسٹی بس تھی۔ دلکش موسیقی گونج رہی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں کے خوبرو چہرے ماحول کو جگمگا رہے تھے لیکن پھر بھی کھٹارہ بس کا سفر اس سفر سے ہزار درجے بہتر تھا۔ اس مرتبہ سفر قریباً ایک گھنٹہ پہلے ختم ہو گیا یعنی وہ ڈھائی گھنٹے سے بھی کم وقت میں سگیریا پہنچ گئے۔ دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ آسمان صاف اور دھوپ چمکیلی تھی۔ ہوا سے گل رخوں کے بال اُڑتے تھے اور مضبوطی سے پکڑی ہوئی رنگین چھتریاں دائیں بائیں ڈول رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر چند بندر اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ ایک مقامی فقیر ان کے ساتھ چلنے لگا۔ انہیں لمبی عمر کی اور مرادوں کے حصول کی دعائیں دینے لگا۔ یاسر نے جیبیں ٹٹولیں اور بیس روپے کا ایک نوٹ اسے تھما دیا۔ وہ مزید دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ یاسر مسکرایا۔

"کہتے ہیں جو دعائیں بظاہر قبول نہیں ہوتیں، وہ جمع ہو جاتی ہیں۔ قدرت ان کے بدلے کسی اور موقعے پر کچھ اور عنایت کر دیتی ہے۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں تمہیں کوئی بڑی اچھی جیون ساتھی ملے گی۔ بڑی اچھی زندگی گزارو گے۔ وہ تمہیں میری یاد تک نہیں آنے دے گی۔"

یاسر خاموشی سے سر جھکائے چلتا رہا۔ وہ بولی۔ "یاد ہے نا ہماری پہلی ملاقات کولمبو ایئر پورٹ کے باہر ہوئی تھی۔ بڑی تیز دھوپ تھی۔ ایسے ہی کوئی فقیر تمہارے پاس سے گزرا تھا، تم نے اسے جیب سے سکے نکال کر دیئے تھے۔

"مجھے نہیں یاد۔"

"لیکن مجھے یاد ہے۔ تمہیں فقیر کو سکے دیتے دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے لگا تھا کہ تم اچھے آدمی ہو گے۔ اس کے بعد ہی میں نے تمہیں مخاطب کیا تھا اور پوچھا تھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟"

"اور پھر ہمیں فلائنگ ہارس مل گیا تھا اور اس نے ہمیں اتنا ڈرایا تھا کہ چیخیں نکلوا دی تھیں۔"

"کہاں ہو گا وہ فلائنگ ہارس؟" کنول نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"جہاں گزرا وقت ہے...... جہاں نیپون ہوٹل ہے...... جہاں نیپون ہوٹل میں گزرے دس دن ہیں...... اور جہاں...... آنے والے دنوں میں، میں بھی رہوں گا۔ پھر چند ہفتے یا چند مہینے بعد تم اسی طرح کہو گی۔ کہاں ہو گا وہ دیوانہ یاسر؟"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں آنسو بہانا شروع کر دوں؟"

"تو کیا مضائقہ ہے؟" یاسر نے کہا۔

"تمہیں اتنی جلدی کیا ہے۔ اسی غار میں چل کر روئیں گے جہاں ہنسے تھے۔ وہ رونے کے لئے بڑی پیاری جگہ ہے۔ وہاں تاڑ اور کیلے کے جھنڈ ہیں...... اور ہوا سن سن کرتی گزرتی ہے۔"

"ہاں سزا اسی جگہ ملنی چاہئے جہاں جرم ہوا ہو۔"

یاسر کا خیال تھا کہ وہ مسکرائے گی لیکن ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر اس کی ناک پر دوڑا گیا جیسے کوئی بچہ سلائیڈ پر پھسلتا ہے۔

وہ خوش باش لوگوں کے درمیان سر جھکائے چلتے رہے۔ ان کی اپنی دنیا تھی، ان کا اپنا موسم تھا۔ مکعب شکل کی عظیم الشان چٹان سنہری دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس کے اوپر جانے والے طویل زینوں پر سیاح چیونٹیوں کی طرح سرکتے نظر آتے تھے۔ انہوں نے بھی گراں قیمت ٹکٹ لئے اور آبی گزرگاہ کا پُل پار کر کے زینوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا ہر قدم جیسے ایک "یاد" پر پڑ رہا تھا...... جہاں انہوں نے رک کر سانس لیا تھا۔ یہاں یاسر کے ہاتھ سے چھتری اُڑی تھی۔ یہاں بیٹھ کر انہوں نے آئس کریم کھائی تھی۔ یہاں انہوں نے اکٹھے تصویر کھنچوائی تھی۔ آج بھی وہاں ایک جوڑا تصویر کھنچوا رہا تھا۔ وہ کوئی اور تھے۔

ان کے چہروں پر چمک تھی اور آنکھوں میں سنہری خواب تھے۔ لڑکی شرما رہی تھی۔ لڑکا اسے کھینچ کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر رہا تھا۔ آج وہ خوش تھے۔ کل کیا ہونا ہے، یہ کسی کو پتہ نہیں تھا۔ یاسر نے سوچا پتہ نہیں پچھلے تیس چالیس برسوں میں کتنے کنول اور یاسر یہاں کھڑے ہوتے رہے ہیں...... تصویر کھنچواتے رہے ہیں، ہنستے رہے ہیں۔ اور پھر...... اپنے اپنے اچھے یا برے نصیبے کی طرف بڑھتے رہے ہیں۔

ہوا خنک تھی۔ کنول کے بال اُڑ رہے تھے۔ آج بالوں کی حرکت میں شوخی دکھائی

نہیں دیتی تھی یا شاید شوخی بالوں سے نہیں یاسر کی آنکھوں سے رخصت ہوئی تھی۔ وہ عجوبہ پہاڑی نما چٹان کی پرلی جانب اس خوبصورت اور الگ تھلگ ڈھلوان پر پہنچ گئے جہاں انہوں نے پچھلی مرتبہ وقت گزارا تھا۔ ایک نابینا مغنی پُرسوز سنہالی گیت گا رہا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اور اس کی ٹرے میں سکے ڈالتے ہوئے بلندی کی طرف چلے گئے۔ پھر انہیں وہ کھوہ نما جگہ نظر آئی جہاں تنہائی کا حصار تھا اور ہوا سرگوشیاں کرتے گزرتی تھی۔

کنول نے وہاں میٹرس بچھایا اور کھانے پینے کا سامان رکھ دیا۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اچھے وقت کو دہرانا چاہتا ہے۔ وہ دونوں بھی وقت کے اس سنہری ٹکڑے کو پھر سے اسی انداز میں دیکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس ٹکڑے کو بعینہٖ اس طرح نہیں دیکھ سکتے۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر کنول نے دسترخوان سجایا۔ یاسر کا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ کنول کی کیفیت بھی یہی ہوگی۔ لیکن ...... یہ آخری کھانا تھا ...... اس سے یوں بے اعتنائی درست نہیں تھی۔ یاسر چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگا۔ کنول نے ایک لقمہ یاسر کے منہ میں رکھا۔ یاسر نے ایک لقمہ کنول کے منہ میں رکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ دسترخوان سمیٹ دیا گیا۔ وہ کھوہ کی پتھریلی دیوار سے ٹیک لگا کر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ ہوا سرگوشیاں کرنے لگی۔ کنول کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

''بچھڑنے کا دکھ ہی کم نہیں یاسر۔ اس پر یہ دکھ بھی ہے کہ ہم منزل کے قریب پہنچ کر لٹے ہیں۔ خاور اتنا عرصہ نہیں آیا تھا۔ اگر مزید دو چار ہفتے نہ آتا تو کیا ہو جاتا ...... زندگی کتنی مختلف ہوتی۔''

''خاور کیوں نہ آتا ...... قسمت میں یہی لکھا تھا۔'' یاسر نے کہا۔

''چلو آ گیا تھا تو پھر حالات ہی یوں خراب نہ ہوتے۔ امی ہی بیمار نہ ہوتیں، ان کی زندگی کا سوال ہمارے سامنے نہ آتا۔ میں ...... میں ...... ان سے بڑا پیار کرتی ہوں یاسر!'' وہ سسک کر بولی۔

''ان سب باتوں کو اب چھوڑو کنول! جو کام جب اور جہاں ہونا ہوتا ہے اسی طرح ہوتا ہے۔ اسی لئے تو شکسپیئر کہتا ہے، ہم دنیا کی اسٹیج پر کٹھ پتلی کی طرح ہیں۔ کہیں

کنول......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''رک کیوں گئے......؟''

یاسر نے کنول کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایک گہری طویل سانس لی اور بولا۔

''کنول! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں نے تم سے پیار کیا ...... اور صرف تم سے اور یہ پیار زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔''

''یہ بات کہنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے تمہیں۔ شاید تم......'' وہ بھی کہتے کہتے رک گئی۔

''دیکھو! اب تم چپ رہ گئی ہو...... کیا بدلہ لے رہی ہو......؟''

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے میٹرس کے سفید پھول بوٹوں کو تکتی رہی ...... تب بولی۔

''کہیں اس ٹورسٹ لڑکی راکیل والی بات تو تمہارے ذہن میں نہیں بیٹھی ہوئی۔''

''نہیں ...... میں نے تو عمومی بات کی ہے۔'' یاسر نے سر جھکا کر کہا۔

''یاسر! راکیل والا واقعہ تو معمولی سا تھا۔ خدا گواہ ہے اس سے کوئی ہزار گنا بڑا واقعہ بھی ہوتا تو تمہارے پیار کی نسبت میرے ذہن میں ہلکا سا شک بھر نہ آتا۔ میں تمہارے پیار پر اتنا ہی یقین رکھتی ہوں جتنا اپنی ذات پر۔''

''مجھے تم پر تو بھروسا ہے کنول! لیکن کیا میں دوسروں کے بارے میں بھی اس انداز میں سوچ سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب......؟''

''میرے مطلب ہے چاچو سلیمان ...... کمار بھائی جان وغیرہ۔ کیا میں راکیل کے حوالے سے ان کی نظر میں بھی بے گناہ ہوں؟''

''میں سمجھ رہی ہوں یاسر! تم چاچو سلیمان کی بات کر رہے ہو ...... پلیز یہ ان کا معاملہ ہے۔ وہ کیا سوچتے ہیں کیا کرتے ہیں، اس سے ہم دونوں کا کوئی تعلق نہیں میں نے تو ان کی بات کو اہمیت دینا ہی چھوڑ دی ہے ...... شاید ہمیشہ کے لئے اور اگر......''

''خیر چھوڑو ان باتوں کو ...... دکھا ہوا دل اور دکھے گا۔'' یاسر نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم خاور صاحب کی سناؤ، ان سے بات چیت ہوتی ہے؟''

''بس ...... تھوڑی بہت ......''

"نہیں کنول ...... وہ تمہاری توجہ کا مستحق ہے ...... اس کو قریب سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا ہے کہ وہ برا شخص نہیں ...... اور پتہ نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے محبت بھی کرتا ہے ...... اسے خوش رکھنا کنول ...... رکھو گی نا ......؟"

"ایک طرف تم کہتے ہو کہ دکھی دل کو مزید دکھانے والی باتیں نہ کریں ...... دوسری طرف وہی باتیں چھیڑ رہے ہو۔" کنول کی آواز میں عمیق غم تھا۔ دونوں خاموش ہو گئے ...... بس دور کسی تاڑ کے پیڑ پر نامعلوم پرندے کے چہچہانے کی آواز آتی رہی۔

بالآخر کنول نے خاموشی توڑی۔ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔"یاسر! آج میری کوئی بات ٹالنا مت۔"

"کیا مطلب ......؟"

"پھانسی پانے والے کی آخری خواہش پوری کی جاتی ہے ...... میری بھی چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہیں ...... پوری کر دو۔"

اس نے ایسے درد سے کہا کہ یاسر سے بولا نہیں گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کنول نے خوابناک لہجے میں کہا۔"تمہارا سر تو نہیں دکھ رہا......؟"

"نن ...... نہیں تو۔"

"میرا خیال ہے کہ دکھ رہا ہے ...... چلو میں تمہارے سر کی مالش کر دوں ...... تھوڑا سا ہربل آئل ہے میرے پاس ......" یہ تقریباً وہی جملے تھے جو کئی ماہ پہلے کنول نے اسی جگہ اسی انداز میں یاسر سے کہے تھے۔ وہ بولتی رہی، ہربل مساج، کینڈی کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ کئی سیاح تو یہاں آتے ہی سب سے پہلے ہربل مساج کا پوچھتے ہیں۔"

"اس نے اپنے نیلے شولڈر بیگ میں سے ہربل آئل کی چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس کے لیبل پر کسی جڑی بوٹی کی آکٹوپس نما تصویر بنی تھی۔ وہ بڑی نرمی سے اس کے سر کی مالش کرنے لگی۔

یاسر نے معترض ہونا چاہا لیکن اس نے یاسر کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔ تیل میں لتھڑی ہوئی نرم پوریں یاسر کے بالوں میں رینگ رہی تھیں۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک یاسر کے رگ و پے میں پھیل رہی تھیں۔ پھر وہ اس کی گردن کے

پچھلے حصے پر اپنی کومل ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ اس کے انداز میں ایک پیارا سا ہیجان تھا۔ جب بھی یاسر بولنے کے لئے ہونٹ کھولتا وہ اپنی ہتھیلی سے ہونٹ ڈھانپ دیتی۔

"پلیز یاسر! آج تم کچھ نہ کہو ...... آج کے بعد میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

بڑی محبت سے اس نے یاسر کی شرٹ کے بٹن کھولے اور اسے میٹرس پر اوندھا لٹا دیا۔ وہ اس کا مساج کرنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے اندر کی ساری محبت اس نے اپنے ہاتھوں میں منتقل کر دی ہے اور یہ ہاتھ زندگی بھر کا آرام اسے آج ہی پہنچا دینا چاہتے ہیں پھر اس نے یاسر کو سیدھا کیا۔ اس کے بازو، اس کی چھاتی، اس کی پنڈلیاں، ہر جگہ کنول کے ہاتھوں کا لمس تھا۔ وہ جادوئی لمس جس کے اثر کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا، یاسر کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن ہونٹوں کو تاب گویائی نہیں تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اب بولا تو کنول ناراض ہو جائے گی۔ جدا ہونے سے پہلے ہی جدا ہو جائے گی اور وہ جدائی کے سفر کا آغاز اس قدر اندوہناک انداز میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹ سی لئے۔ یاسر کا دایاں پاؤں کنول کی گود میں تھا۔ اپنے جادوئی ہاتھوں سے وہ اسے سہلا رہی تھی۔ اس کا درد چن رہی تھی۔

پھر اس نے دوسرا پاؤں بھی اپنی گود میں رکھ لیا۔ بڑے لاڈ سے، بڑی چاہت سے وہ ان کو آرام پہنچانے لگی۔ تب یاسر کو اپنے دائیں پاؤں کی پشت پر عجیب سے لمس کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں، کنول کے ہونٹ پاؤں پر دھرے تھے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی تھے۔ وہ تڑپ کر بیٹھ گیا۔

"میرے ساتھ ایسا مت کرو کنول۔" وہ گلوگیر آواز میں بولا پھر اس نے کھینچ کر کنول کو گلے سے لگا لیا۔ کھوہ سے باہر ہوا پرشور ہو گئی تھی۔ چند بدلیوں نے دھوپ کو ڈھانپ لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹے تھے لیکن ان لمحوں میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مرد عورت نہیں ہیں، بس دو جسم ہیں ...... زخمی جسم ...... کنول کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے خوابناک سرگوشی میں کہا۔

"تم رونا چاہتے تھے نا یاسر! میں بھی رونا چاہتی ہوں ...... رونے کے لئے یہ جگہ بہترین ہے پھر ایسی جگہ ملے گی نہ ایسا ساتھ ملے گا ...... چلو رو لیں ...... ایک دوسرے کی بانہوں میں جی بھر کر آنسو بہا لیں ......"

یاسر نے ضبط کے لئے ہونٹ بھینچ لئے۔ مردانگی آڑے آ رہی تھی۔ مگر پھر نجانے کیا ہوا ''ضبط غم'' کا بند ٹوٹ گیا۔ آنسو بے آواز اس کی آنکھوں سے ابلنے لگے اور کنول کے بالوں کو بھگوانے لگے۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں کی گرم نمی یاسر کے سینے پر پھیل رہی تھی...... وہ عجیب ساعتیں تھیں...... وہ عجیب کیفیت تھی...... جانکاہ دکھ کے اظہار کا وہ انوکھا انداز تھا۔ وہ روتے رہے...... ایک دوسرے کو چومتے رہے اور بھینچتے رہے...... پھر یاسر کو لگا کہ وہ صرف دو جسم نہیں رہے...... صرف دو زخمی جسم نہیں رہے......ان کے درمیان کچھ اور چلنے لگا تھا۔ ایک منہ زور ریلہ انہیں کسی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا...... ایک سرکش ہوا ان کے قدم اکھاڑنے لگی ...... یاسر نے دھندلاتی ہوئی نگاہوں سے کنول کی طرف دیکھا...... اس کی آنکھوں میں جھانکا...... جسم کے طوفانی سمندر میں یہ آنکھیں دو ساکت جزیروں کی طرح تھیں...... یہ آنکھیں کہہ رہی تھی...... ''میرے محبوب! میں ایک مختلف لڑکی ہوں...... میں ایک سچی لڑکی ہوں...... ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتی ہوں جس میں اور برائیاں تو بے شک ہوں گی لیکن وہاں کبھی جھوٹ نہیں بولا گیا...... پس میرا معاملہ جدا ہوا ہے ...... میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار تمہارے لئے جھوٹ بولا ہے...... تمہارے سلسلے میں جھوٹ بولا ہے...... مجھے نہیں پتہ یہ چھوٹا جھوٹ ہے یا بڑا...... لیکن یہ میری زندگی کا آخری جھوٹ ہے...... آج تم جدا ہو رہے ہو...... آخری جھوٹ میں تم جو کچھ بھی شامل کرنا چاہو...... مجھے منظور ہے...... میں اسے قبول کرلوں گی...... اور ساری زندگی اس کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی...... ندامت کے آنسو بہاتی رہوں گی...... بولتی آنکھیں بند کر رہی ہوں...... لو میں آنکھیں بند کر رہی ہوں...... میرے لئے یہ سب سخت ناپسندیدہ ہوگا لیکن تمہاری خاطر...... صرف تمہاری خاطر میں نے آنکھیں بند کرلیں......'' اور یاسر نے پوری طرح کھول لیں...... وہ اس کے ملکوتی چہرے کو دیکھتا رہا...... کیلے اور تاڑ کے درختوں کو چھو کر آنے والی ہوا کھوہ میں سرگوشیاں کرتی رہی...... وہ عجیب لمحے تھے...... وہ فنا ہو جانے یا باقی رہ جانے کا مرحلہ تھا...... ان ساعتوں میں فیصلہ ہونا تھا کہ جذبہ عشق ہے یا جذبہ ہوس ہے...... اور پھر فیصلہ ہوگیا...... آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ بجھ گئی...... رگوں میں دوڑتا ہوا

سرخ لاوا پھر سے شفاف خون میں بدل گیا...... جیسے پاتال میں گرتے گرتے کسی شخص کے ہاتھ میں کوئی مضبوط سہارا آ جائے یاسر نے کھوہ کی کھردری دیوار پر اپنی گرفت مضبوط کی اور کنول سے دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔

ایک دم پھر سے دھوپ نکل آئی...... اجالا...... جو طوفان کے گزر جانے کی علامت ہے...... جو نیکی اور سکون کا پیامبر ہے...... یاسر کو ایک بار پھر ہوا کے جھونکوں میں خوشبو و فرحت کا احساس ہوا...... اس نے دیکھا، رو رو کر کنول کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ...... یقیناً اس کی اپنی آنکھوں کا بھی یہی حال تھا...... پچھلے آدھ گھنٹے میں ان آنکھوں کے راستے جو آتشیں سیال بے تحاشا نکلا تھا اس نے یاسر کو بڑی حد تک ہلکا پھلکا کر دیا تھا اور یاسر کا خیال تھا کہ کنول بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی ہوگی...... اس کے علاوہ کنول کے چہرے پر یاسر کو ایک ایسی شفاف چمک نظر آنے لگی تھی جو کچھ دیر تک کنول کے چہرے پر نہیں تھی...... یہ آبرومندی کی چمک تھی شاید...... جدائی سے پہلے ملن کی یہ آخری گھڑیاں اندوہناک ہونے کے باوجود بہت اندوہناک نہیں رہی تھیں...... شاید درد کا انتہا کو چھو جانا ہی درد کا مداوا بن گیا تھا۔

یاسر نے جیب سے وہ تحریر نکالی جو رات کو لکھی تھی۔

''یہ کیا ہے......؟'' کنول نے پوچھا۔

''ایک خط...... تمہارے لئے...... لیکن شرط یہ ہے کہ...... اسے ابھی نہیں پڑھنا۔''

''تو کب پڑھنا ہے......؟''

''کچھ دن بعد...... کم از کم اس وقت جب تمہاری شادی ہو جائے۔''

''لیکن......؟''

''لیکن کچھ نہیں کنول...... اس میں ایسی کوئی بات نہیں جو حالات کو تبدیل کر سکے یا کسی بھی قسم کی تبدیلی لا سکے...... بس میری خواہش ہے کہ اسے شادی کے بعد پڑھنا۔''

''جیسے تم کہو......''

''میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرو۔'' یاسر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا ...... وہ کئی لمحوں تک ڈبڈبائی آنکھوں میں یاسر کو دیکھتی رہی پھر اثبات میں سر ہلا دیا

...... وہ دونوں خورد ونوش کا سامان پہلے ہی سمیٹ چکے تھے ...... یاسر تیل آلود جسم کو کھردرے رومال سے رگڑنے کے بعد شرٹ پہن چکا تھا ...... وہ چند لمحے تک کنول کی شب رنگ آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں جلدی جدا ہو جانا چاہیے۔''

''تو ...... چلو......'' وہ ایک دلفگار سسکی کے ساتھ بولی اور کسی دیوداسی کے انداز میں اپنا ماتھا یاسر کے سینے سے ٹیک دیا ...... کئی سیکنڈ وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

یاسر نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور بولا۔ ''نہیں کنول ...... تمہیں اکیلے جانا ہوگا ...... چار بج گئے ہیں ...... واپسی کی بس تیار ہوگی ...... تم چلی جاؤ ...... میں تمہیں جاتے ہوئے دیکھوں گا ...... اس کے کچھ دیر بعد میں بھی چلا جاؤں گا۔''

''کہاں ......؟''

''کولمبو......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیوں ...... تم کینڈی واپس نہیں جاؤ گے ......؟'' وہ حیران ہوگئی۔

''نہیں کنول ...... یاسر کا لہجہ فیصلہ کن تھا ...... بچھڑنے کے لئے یہ وقت بہترین ہے ...... یہ کلائمیکس ہے ...... اس کے بعد اینٹی کلائمیکس ہوگا ...... میں اب ایک اجنبی کنول کو مزید نہیں دیکھ سکتا۔''

کنول کی جھیل آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے ...... وہ یاسر کے قریب آئی ...... دونوں گلے لگ گئے ...... کچھ دیر ساکت کھڑے رہے ...... کائنات کی گردش بھی جیسے تھم گئی تھی ...... بس دو دل دھڑک رہے تھے ...... دو زخمی دل ...... تب کنول ایک جھٹکے کے ساتھ جدا ہوئی ...... اس نے باسکٹ اور رول کیا ہوا میٹرس اٹھایا ...... یاسر کی طرف دیکھے بغیر مڑی اور تیزی سے ڈھلوان اترنے لگی ...... دس پندرہ قدم جانے کے بعد وہ پھر بے قرار ہوئی ...... واپس مڑی اور دوڑ کر یاسر کے گلے سے لگ گئی ...... آخری بار ...... قطعی آخری بار ...... وہ بہت روئی ...... پھر چلی گئی ...... ڈھلوان پر جنگلی گلاب اور رجنی گندھا کے پھول تھے ...... کیلے کے جوڑے سبز پتے، الوداعی انداز میں ہولے ہولے سے ہل رہے تھے ...... وہ ان کے درمیان چلتی جا رہی تھی ...... دور ہوتی جا رہی تھی ...... وہ اسے دیکھتا رہا ...... وہ جانتا تھا کہ اب وہ مڑ کر نہیں دیکھے گی ...... مڑ کر

دیکھنے سے شہزادیاں پتھر ہو جاتی ہیں ...... کہانیاں جامد ہو جاتی ہیں ...... اب وہ ایک ٹیلے کے پیچھے اوجھل ہو رہی تھی ...... پہلے اس کے پاؤں اوجھل ہوئے ...... پھر نچلا دھڑ ...... پھر کندھے ...... پھر وہ ساری اوجھل ہوگئی ...... یاسر کی ٹانگیں ایک دم ہی بے جان ہوگئیں ...... وہ پتھر پر بیٹھ گیا ...... اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھے ...... آنکھوں سے بہنے والا گرم سیال اس کی انگلیوں کی درزوں میں سرسرانے لگا۔

اسی روز رات کو یاسر بھی کولمبو واپس پہنچ گیا ...... تین چار روز تک اس کی مصروفیت اس کے سوا اور کچھ نہ رہی کہ دفتر جانا، گھر آنا، دو چار لقمے لینا اور کمرے میں بند ہو جانا، نم اس کی دلی کیفیت سے اچھی طرح آگاہ تھا ...... یہی وجہ تھی کہ وہ اسے بالکل ڈسٹرب نہیں کر رہا تھا۔



چوتھے روز دفتر سے چھٹی تھی ...... یاسر نے پاکستان فون کیا ...... فون یاسر کے ابو نے ہی ریسیو کیا تھا۔ ''ہاں بیٹا جی! کیسی گزر رہی ہے۔''

''بہت اچھی ......'' یاسر نے اپنے دل پر ستم کے پہاڑ توڑتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا پروگرام ہیں ......؟''

''دو تین ہفتے کا کام باقی ہے ...... پھر واپسی۔''

ابو نے قہقہہ لگایا۔ ''میں دوسرے پروگرام کے بارے میں پوچھ رہا ہوں نادان بیٹے ...... شائلہ کو شبہ ہے کہ تم نے کولمبو میں کچھ دیکھ لیا ہے اور ہمیں سرپرائز دینے کا ارادہ رکھتے ہو۔''

''نہیں ابو! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تو پھر کیسی بات ہے ......؟''

''جیسی آپ کو پسند ہو ......'' یاسر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ابو چونک گئے ...... قدرے حیرت سے بولے۔ ''اوئے گھوڑے ...... تو اپنے ہوش وحواس میں تو ہے؟''

''کیا میں آپ کو بہکا ہوا لگتا ہوں ......؟''

''یعنی تو کہنا چاہتا ہے کہ ہم تیرے لئے کوئی ...... میرا مطلب ہے کہ لڑکی پسند کر لیں ......؟''

''جیسے آپ کی مرضی ......؟''

''مگر ...... وہ جو آدرش تھے ...... وہ پسند ناپسند ...... آئیڈیل ...... رومانس وغیرہ۔''

''ابو! آپ ہی تو شادی کے دو طریقے بیان کیا کرتے ہیں ...... پہلے محبت کرو پھر شادی کرو ...... یا پہلے شادی کر لو پھر محبت کرو ...... اور آپ ہی کہا کرتے ہیں کہ جب

دو اچھے لوگ اکھٹے ہوں اور ایک ہی چھت کے نیچے ہنسی خوشی رہنا شروع کریں تو محبت ہو ہی جاتی ہے اور یہی محبت زیادہ حقیقی ہوتی ہے۔''

''واؤ ...... تم نے تو بالکل میرے انداز میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔'' ابو نے خوش ہو کر کہا۔ پھر وہ آوازیں دینے لگے۔ ''شائلہ ...... شائلہ بیٹی! آنا ...... ذرا میرے بازو پر چٹکی کاٹنا ...... یقین تو ہو کہ میں جاگ رہا ہوں۔''

چند لمحے بعد شائلہ کی چہکتی ہوئی آواز فون پر سنائی دی اور پھر بہن بھائی میں زبردست نوک جھونک شروع ہو گئی۔

اگلے روز انٹرنیٹ کے ذریعے یاسر کو ایک خوبرو لڑکی کی تصویر موصول ہوئی۔ یہی شائلہ کی کلاس فیلو تھی۔ اس کا نام رمشہ تھا۔ شائلہ نے کہا تھا، مجھے یقین ہے کہ آپ میری پسند کی داد دیں گے ...... اور اگر نہیں دیں گے تو میں وصول کرنے کے لئے خود کولمبو پہنچ جاؤں گی ...... ٹکٹ پر تیئس چوبیس ہزار روپیہ خرچ ہوگا وہ آپ کی جیب سے نکلے گا۔''

یاسر نے داد دے دی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت ہی کچھ ایسی ہو رہی تھی۔ شائلہ اور ابو کچھ بھی منتخب کرتے وہ قبول کرتا ...... اور یہ تو اچھی خاصی دلکش لڑکی تھی ...... لمبے سیاہ بال، بڑی بڑی آنکھیں جن میں ذہانت اور شوخی کی چمک تھی۔

دن گزرتے رہے ...... وقت ایک بھاری چٹان کی طرح یاسر کے سینے کو روندتا ہوا آگے کو سرکتا رہا ...... اپنے کینڈی والے سنہالی کولیگ کی زبانی یاسر کو معلوم ہوا تھا کہ کنول اپنی فیملی کے ساتھ پانچ چھ دن بعد ہی واپس انڈیا چلی گئی تھی۔

ایک دن وہ اچانک کولمبو والے فلائنگ ہاؤس سے یاسر کی پھر ملاقات ہو گئی ...... وہی سانولا سلونا نوجوان لڑکا جو اپنے ٹک ٹک میں بیٹھ کر کولمبو کی سڑکوں پر بازی گری کرتا تھا۔ اس نے یاسر کو پہچانا اور پھر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ''صاحب! آپ کی وائف کدھر ہیں؟''

یاسر کے دل پر چوٹ لگی ...... وہ بولا۔ ''وہ میری وائف نہیں ...... ہم سفر تھی ...... دوست تھی۔''

''بڑی اچھی تھیں ...... بڑی پیاری ......'' فلائنگ ہارس کے ہونٹوں سے بے ساختہ

نکلا۔ ''میں تو خوش تھا کہ وہ آپ کی وائف ہیں۔''

اس وقت یاسر کو کہیں بھی نہیں جانا تھا لیکن وہ پھر بھی فلائنگ ہارس کے تک تک میں بیٹھ گیا۔ وہ تک تک کو اس سڑک پر لے آیا جو ائرپورٹ سے آتی تھی اور کولمبو میں داخل ہوتی تھی۔ اس سڑک پر اس نے کنول کے ساتھ زندگی کا پہلا سفر کیا تھا...... کنول کے بال اڑتے تھے...... یاسر کے چہرے سے چھوتے تھے اور اس کے سینے میں عجیب ہلچل پیدا کرتے تھے...... آج پھر وہ اس سڑک پر کولمبو کی طرف جا رہا تھا لیکن آج پہلو میں وہ نہیں تھی...... وہ شاید...... کسی اور کے پہلو میں تھی...... آنسو یاسر کی آنکھوں کے پیچھے رستے رہے اور حلق میں گرتے رہے...... وہ اس انوکھی لڑکی کو سوچتا رہا...... اس کی شیشے جیسی شفاف باتوں کو یاد کرتا رہا...... اس کی بے داغ مسکراہٹوں کو تصور میں ابھارتا رہا۔ آخر وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا...... آج اس نے فلائنگ ہارس کو دل کھول کر ٹپ دی پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا...... فلائنگ ہارس اسے سیلوٹ کر کے رخصت ہونے لگا تو یاسر نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا...... اس کی آنکھوں میں نمی تھی...... اس کی سمجھ میں خود بھی نہیں آیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے...... شاید وہ فلائنگ ہارس سے نہیں اپنے گزرے ہوئے وقت سے گلے مل رہا تھا...... ان خوشبودار شب و روز کو الوداع کہہ رہا تھا جنہوں نے زندگی کو ایک نیا رخ دیا تھا۔



پھر ایک روز یاسر کو کمار صاحب کا مختصر سا فون ملا۔ انہوں نے یاسر کا حال احوال پوچھا تھا اور اچانک چلے جانے پر گلہ کیا تھا۔ یاسر نے بھی ان کی ہزیمت دریافت کی۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک مہینہ پہلے بنگلور میں خاور اور کنول کی شادی ہو گئی ہے۔ آج کل وہ دونوں ہنی مون کے لئے شملہ گئے ہوئے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد یاسر کے ذہن سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا...... بہت بھاری بوجھ۔

دو تین روز بعد اس نے لاہور فون کیا اور ابو کو بتایا کہ یہاں کام ختم ہو چکا ہے۔ اس نے واپسی کا ٹکٹ لے لیا ہے اور چار روز بعد لاہور واپس پہنچ رہا ہے۔ ابو اتنا خوش ہوئے کہ فون پر ہی اس کا منہ چومنا شروع کر دیا۔ انہوں نے شوخ لہجے میں بتایا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تیری ہونے والی بیوی تیری بہن کے ساتھ موجود تھی۔

تو ذرا لیٹ ہو گیا ہے ورنہ ہم اس سے تیری بات کراتے۔ اب وہ دونوں آئس کریم کھانے مارکیٹ تک گئی ہوئی ہیں۔ اگر تم تھوڑی دیر بعد دوبارہ......''

''نہیں ابو! آپ سب اس کے ساتھ جو باتیں کر رہے ہیں وہ دراصل میں ہی کر رہا ہوں۔''

''بڑی پیاری اور اچھی لڑکی ہے...... اور تو بھی تو کم اچھا نہیں ہے...... سچ کہتے ہیں کہ اچھوں کے ساتھ اچھا ہی ہوتا ہے۔''

یاسر کے دل میں ٹیس اٹھی۔ یہی فقرہ کبھی کنول نے بھی کہا تھا...... اور اس نے کچھ اور بھی کہا تھا۔ ہاں...... یہ کہا تھا کہ جو دعائیں بظاہر قبول نہیں ہوتیں، ان کے صلے میں کوئی اور اچھی چیز مل جاتی ہے۔

آہ...... کوئی اور اچھی چیز۔

اگلے روز یاسر نے دل کڑا کیا اور گال فیس روڈ چلا گیا۔ یہی وہ خوبصورت ساحل تھا جہاں ان کی محبت کی کونپل کھلی تھی۔ کنول سے بچھڑنے کے بعد وہ کبھی اس ساحل پر نہیں آیا۔ لیکن آج پتہ نہیں کیوں وہ چلا آیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ تیز ساحلی ہوا چل رہی تھی۔ ایک طرف جھاگ اڑاتا نیلا سمندر، دوسری طرف پرشکوہ عمارتیں، گلاداری ہوٹل، ٹون ٹاورز وغیرہ درمیان میں شفاف سڑک جس پر چم چم کرتی گاڑیاں فراٹے بھرتی تھیں۔ گال فیس پر یہاں وہاں گم گشتہ محبت کی نشانیاں تھیں۔ وہ دیکھتا اور سوچتا گیا۔ یہاں وہ دونوں سنگی بینچ پر بیٹھے تھے اور اجنبی محمد نذیر سے باتیں کی تھیں۔ یہاں کنول نے پتنگ باز سے پتنگ اڑانا سیکھی تھی۔ یہاں کھڑے ہو کر انہوں نے امبریلا لو کے مناظر دیکھے تھے۔ وہ ان دلفگار یادوں کے درمیان سے گزر کر عین کنارے پہنچ گیا پھر آہستہ آہستہ ساحل کے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے پتلون کی جیب سے دو فل سائز کاغذ نکالے۔ یہ دراصل اس خط کی فوٹو اسٹیٹ تھی جو اس نے آخری ملاقات میں کنول کو دیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ اسے کچھ روز بعد پڑھے۔ اب کنول کی شادی ہو چکی تھی۔ یاسر کو یقین تھا کہ اس نے یہ خط بھی پڑھ لیا ہو گا۔ خبر نہیں کیوں آج یاسر کا دل بھی چاہ رہا تھا کہ وہ اس خط کو پھر سے پڑھے۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

''کنول! تم ٹھیک کہتی ہو...... ہم منزل کے قریب پہنچ کر بچھڑنے میں

ہمارا دکھ قابل فہم ہے کنول، مگر اس دکھ کے حوالے سے ہم دونوں ایک جیسے باخبر نہیں ہیں ...... ایک بات ایسی ہے، جو صرف مجھے معلوم ہے ...... آج اس آخری تحریر میں، میں تمہیں وہی بات بتانا چاہتا ہوں۔

تمہیں یاد ہے کہ تمہاری شادی اور دیدی آشا کی دعوت پر میں کینڈی آیا تھا۔ کمار صاحب کے ہاں کچھ عزیز آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے تمہاری ایک چچی مجھے دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سے اگلے روز تم سب نے پکنک کا پروگرام بنایا تھا اور اس کے لئے ''دوسری چوٹی'' نامی جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ میں بھی پکنک پر جانے کے لئے تیار تھا لیکن اس سے پہلے مجھے اپنے دوست سے کچھ سی ڈیز لینے کے لئے دھرم شالا روڈ جانا پڑا تھا۔ تمہیں معلوم نہیں کنول، کہ میرا ''دھرم شالا روڈ'' جانا ہی ہماری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔ ہم ایک دوسرے کے شریک حیات بنتے بنتے ایک دوسرے سے دور ہوئے اور پھر اجنبی بن گئے۔

کنول! تمہیں اتنا تو معلوم ہے کہ انکل سلیمان کو ایک فون آیا تھا اور اس فون کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ خاور کہاں اور کس حال میں ہے۔ لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں اور نہ انکل کو معلوم ہے کہ وہ فون کس کا تھا۔ معلوم ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ میں نے انہیں کچھ بتایا ہی نہیں۔ ہاں ...... کنول! میں نے ہی انکل کو خاور کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ فون پر آواز بدل کر بولنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہی ہو۔ شاید اب تم جاننا چاہو گی کہ مجھے خاور کے بارے میں کیسے پتہ چلا ...... میں تمہیں وہی بات بتانے جا رہا ہوں۔ میں ''دھرم شالا روڈ'' میں اپنے دوست سے مل کر واپس آ رہا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں سی ڈیز کا پیکٹ تھا۔ سڑک زیر تعمیر تھی۔ میں کنارے کنارے چل رہا تھا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ اچانک ...... بالکل اتفاقیہ طور پر میری نگاہ ایک کوٹھی کی باؤنڈری وال سے گزر کر کوٹھی کے لان میں چلی گئی۔ میں نے ایک شخص کو اپنی گاڑی صاف کرتے دیکھا۔ میری نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔ اس کے لمبے گھونگریالے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس

کی صورت میرے لئے جانی پہچانی تھی ...... وہ خاور تھا ...... میں سکتے کی حالت میں دیکھتا رہ گیا۔ پھر میری نگاہ گاڑی کے اندر گئی میں نے پچھلی نشست پر جدید اسٹل کیمرا دیکھا۔ ساتھ ہی اس کا اسٹینڈ بھی پڑا تھا کیمرے کے بڑے بڑے لیزر بھی میں نے دیکھے۔ میں لمحوں میں جان گیا کہ میں جس شخص کو دیکھ رہا ہوں وہ خاور ہی ہے۔ وہی خاور جس کی تلاش میں سب جگہ جگہ کی خاک چھانتے رہے ہیں۔ وہ خاور یہاں کینڈی کی اس سرخ چھتوں والی کوٹھی میں موجود تھا اور اپنی ڈاٹسن گاڑی صاف کر رہا تھا۔

میں عجیب کیفیت میں کوٹھی کے سامنے سے گزر گیا اور کچھ آگے جا کر ایک پام کے نیچے بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی اور حقیقت یہ تھی کہ میں نے خاور کو دیکھ لیا تھا۔ کافی دیر تک میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا پھر گھر واپس آ گیا تم لوگ پکنک پر جانے کے لئے تیار تھے لیکن میرے دل و دماغ میں تو تہلکہ مچا ہوا تھا۔ میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا اور تمہارے ساتھ نہیں گیا۔ وہ سارا دن میں نے نہایت اذیت ناک ہیجانی کیفیت میں گزارا۔ میں نے ایک رات پہلے بھی خالہ سعدیہ کو اپنے کمرے میں سجدے میں گر کر گڑگڑاتے دیکھا تھا۔ شب کے سناٹے میں ان کی سسکیاں اور آہیں یوں گونجی تھیں کہ گھر کے در و دیوار بھی لرزتے محسوس ہوتے تھے۔ گمشدہ خاور کے لئے ان کی محبت اور تڑپ سب پر عیاں تھی۔ آج اس خاور کو میں نے دیکھ لیا تھا اور میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ خاور کی موجودگی کو چھپا لیتا۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس میں میری محبت کی توہین تھی۔ ہاں ...... کنول! محبت ایسی ہی پاگل ہوتی ہے۔ تم مجھے اکثر جھوٹ بولنے کا طعنہ دیتی رہی ہو کنول اور یہ حقیقت ہے کہ میں عام لوگوں کی طرح کسی وقت مصلحتاً جھوٹ بولتا بھی ہوں۔

چھوٹے موٹے بے ضرر جھوٹ ...... کبھی معمولی قسم کی غلط بیانیاں ...... کبھی ازراہ مذاق ...... کوئی غیر واقعی بات ...... لیکن حق و صداقت کے اعتبار سے میں کبھی کمزور شخص نہیں رہا کنول! اور یہی روایات میرے بزرگوں میں بھی

ہے۔ ڈیڈی آشنا نے مجھے تمہارے والد گرامی کی حق گوئی کا اثر انگیز واقعہ سنایا تھا۔ بعد میں تم نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔ یقین کرو کنول! ایسی ہی روایات میرے بزرگوں میں بھی ہیں۔

مجھے ڈر ہے کہ تم اسے میری خودستائشی نہ سمجھو۔ یا کہیں تمہیں برا نہ لگے کہ میں تمہارے ایک واقعہ کے بدلے، اپنا ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ تم اسے اتفاق سمجھو یا حیرت انگیر مماثلت، یا کچھ اور ...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری والدہ کی جان بھی حق سچ کے پُرخار راستے پر چلتے ہوئے ہی گئی تھی۔ وہی کہنہ سولی جو راست گو لوگوں کے لئے ہر معاشرے میں تیار رہتی ہے۔ وہ ایک بڑے کالج میں ممتحن تھیں۔ ایک معروف صنعت کار خاندان کی لڑکی نے کمرۂ امتحان میں نقل کرنا چاہی تھی۔ میری والدہ نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے روکا تھا۔ بات بڑھ گئی تھی۔ کالج کے احاطے سے باہر لڑکی کے اوباش بھائی نے والدہ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں ...... اور پھر چندروز بعد ہی کالج اور گھر کے راستے میں ایک تیز رفتار گاڑی میری والدہ اور ہمارے ایک نوعمر ملازم کو کچلتے ہوئے گزر گئی تھی۔ میں اس واقعے کی تفصیل میں جا کر خط کو طویل کرنا نہیں چاہتا۔ نہ ہی اپنے خاندان کی شرافت ونجابت کا تذکرہ مقصود ہے۔ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری طرح ”سچ“ شاید میری گھٹی میں بھی شامل ہے۔ بس ہمارے سچ بولنے کے انداز مختلف تھے۔ تم جیسے لوگ سچ بولتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ لیکن مجھ جیسے لوگ کر دیتے ہیں۔ مثلاً تم اپنے چچا یا بھائی کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتی ہو کہ وہ آج بہت ہینڈسم لگ رہے ہیں۔ یا اس جیسی کوئی اور بات۔ لیکن مجھ جیسے لوگ ایسی باتوں کو اپنے سینے تک محدود رکھتے ہیں۔

ایسی معمولی باتوں سے سچ کہنا تو نہیں جاتا کنول، سچ کی اصل پہچان تو بڑے اور مشکل فیصلوں کے وقت ہوتی ہے ...... اور اس وقت میرے سامنے بھی ایک مشکل ترین فیصلہ تھا۔ میں سچ کی قیمت جانتا تھا لیکن پھر بھی سچ بولنا تھا ...... غیر مشروط سچ، میرے دل کی آواز تھی کہ میں حقیقت بیان کر دوں۔

اس کے بعد جو کچھ بھی ہو اسے قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لوں۔

میں رات تک خیالوں کے بھنور میں رہا۔ کسی وقت ذہن تھوڑا سا بہکتا بھی تھا۔ کوئی میرے اندر سے کہتا ...... اپنے سچ کو چند دنوں کے لئے مؤخر کر دو ...... ایک دو ہفتوں میں کنول کو فیملی سمیت ہندوستان واپس چلے جانا ہے۔ دادی ماں کی وجہ سے ہر کام ایمرجنسی میں ہو رہا ہے۔ چار پانچ ہفتوں میں کنول تمہاری شریک حیات بن سکتی ہے۔ کنول کو اپنی زندگی میں آ جانے دو پھر یہ سچ بول لینا۔

لیکن پھر فوراً ہی سچ کی آواز، ہر آواز پر غالب آ چکی تھی اور یہ غالب آواز کہتی تھی، اگر اس سچ کو اب نہ کہو گے تو پھر یہ سچ نہیں رہے گا۔ یہ جھوٹ بن جائے گا۔ تمہاری محبت کا تاج محل جھوٹ کی بنیادوں پر تعمیر ہو گا۔ یہ محبت نہیں ہو گی، یہ بدترین مطلب پرستی ہو گی۔

پھر ایک اور سوچ ...... بالکل مختلف سوچ ذہن میں آتی۔ یہ بات طے تھی کہ جونہی خاور کی موجودگی کا اعلان ہو گا، تم یکسر تنہا رہ جاؤ گی۔ تمہارے گھرانے اور خاندان کے ہر فرد کا وزن خاور کے پلڑے میں چلا جائے گا۔ تمہیں خاور سے شادی کے لئے کہا جائے گا۔ تمہارے اور بزرگوں کے درمیان جو بات طے ہوئی تھی اس کے مطابق بھی تم اس شادی سے انکار نہیں کر سکو گی ...... لیکن ...... کیا خاور اس لائق ہے کہ تمہارا شریک حیات بن سکے۔ تمہیں ایک بیوی کا مرتبہ اور محبت دے سکے ...... اس الجھن نے مجھے رات بھر سوتے اور جاگتے میں پریشان رکھا۔

تمہیں یاد ہو گا اگلے روز میں صبح سویرے کہیں نکل گیا تھا ...... رات کو واپسی پر میں نے بتایا تھا کہ اکیلے گھومنے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں دراصل دھرم شالا روڈ میں گیا تھا۔ میں خاور سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اس کی سرخ چھتوں والی کوٹھی پر پہنچا۔ خاور کا ملازم ایک پاکستانی سلیم احمد تھا۔ میں نے اس سے خاور کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ صاحب سو رہے ہیں۔ میرے اصرار پر اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا

اور خود صاحب کو جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ سلیم کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور خاور کے بڑبڑانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ سخت نشے میں تھا۔ سلیم کی کوشش کے باوجود بستر سے اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سلیم نے ہار مان لی اور آ کر مجھے بتایا کہ صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ میں نے اسے اس کے صاحب کے بارے میں دو چار باتیں کیں۔ اتفاقاً سلیم لاہور ہی کا رہنے والا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے اپنائیت کا احساس ہوا۔ اس نے مجھے صاحب کے بارے میں کافی کچھ بتایا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ صاحب زبان کا قدرے سخت ہونے کے باوجود دل کا بے انتہا نرم ہے۔ کھلے دل کا مالک ہے۔ قدر دان لوگ اس کے کام کی قدر کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ چومتے ہیں لیکن اس میں غرور نہیں۔ ملازموں کے ساتھ آلتی پالتی مار کر کھانا کھانے میں بھی عار نہیں سمجھتا۔ سلیم نے بتایا کہ وہ اپنی فیملی میں کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا لیکن وہ لڑکی صاحب کی محبت کو نہ سمجھ سکی۔ ایک خالہ تھی جس سے وہ پیار کرتا تھا وہ بھی اپنی اولاد کو زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ صاحب ہر چیز سے بے زار ہو گیا...... اب اسے کسی چیز کی خواہش نہیں بس کام کرتا ہے، ڈرنک کرتا ہے اور موسیقی سنتا ہے۔

سلیم نے ایک قریبی کمرے میں مجھے صاحب (خاور) کی کھینچی ہوئی یادگار تصویریں بھی دکھائیں۔ یہ تصویریں فریموں میں جڑی تھیں ان میں سے کئی انعام یافتہ تھیں۔ ان تصویروں میں تمہاری بھی تین چار تصویریں تھیں۔ انہیں نمایاں جگہ پر لگایا گیا تھا اور ان کے فریم بھی بیش قیمت تھے۔ پتہ نہیں کیوں ان تصویروں کو دیکھ کر مجھے لگا کہ...... میں تم سے جدا ہو سکتا ہوں۔ میں وہ سچ بول سکتا ہوں جسے بولے بغیر میری محبت پر حرف آتا ہے۔ میں خاور سے ملے بغیر واپس آ گیا۔ بذریعہ ٹک ٹک میں شام چھ بجے کے قریب سٹی سینٹر واپس پہنچ گیا۔

میں اس رات بھی دیر تک غور کرتا رہا۔ میرے اندر ایک عجیب بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے پاس تمہارے لئے ایک بری خبر ہے

اور یہ خبر تم تک پہنچانے کی ذمے داری میں نے اپنے سر لے لی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ تم تک یہ خبر میرے توسط سے نہ پہنچے۔ یہ خبر کوئی اور پہنچائے۔ تمہارے ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے کہ میں اس انداز میں کیوں سوچ رہا تھا۔ میں نے خاور کے بارے میں خود ہی اطلاع کیوں نہ دے دی...... تمہیں یاد ہوگا کنول، ایک دوسرے سے اقرار محبت کے بعد ہم جب کولمبو یا کینڈی میں گھومتے تھے تو ہمارے ذہن میں ہر وقت ایک انجانا خوف چھپا رہتا تھا۔ اس خوف کا تعلق خاور سے ہوتا تھا۔ ہم سوچتے تھے کہیں وہ مل ہی نہ جائے۔ کہیں اس کی تلاش بار آور ہی ثابت نہ ہو جائے۔ بے شک ہم نہ مانیں لیکن یہ خوف ایک حقیقت تھا اور ہمیشہ ہی رہا۔ اب مجھ کو یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں یہ تلخ حقیقت خود تم تک پہنچاؤں۔ میں چاہتا تھا تمہیں ذہنی شاک پہنچانے والی یہ بات میرے ذریعے تم تک نہ پہنچے۔ یہ خبر کوئی اور پہنچائے ...... اور پھر وہ ”اور“ میں خود ہی بن گیا۔ میں نے بذریعہ فون انکل سلیمان کو خاور کی WHERE ABOUTS کے بارے میں بتا دیا۔

ایک بہت بڑا بوجھ جو میرے سر سے اترا۔ اس بوجھ تلے میں ہی نہیں پس رہا تھا میری اور تمہاری محبت بھی پس رہی تھی یہ بوجھ ہٹا تو محبت پھر سے سانس لینے لگی۔ ایک جانبر ہو جانے والے پودے کی طرح لہلہانے لگی۔

بعد ازاں جو کچھ ہوا اور جیسے جیسے ہوا تمہیں بھی معلوم ہے۔ کچھ بھی غیر متوقع نہیں تھا سب کچھ ایسے ہی ہونا تھا۔ وہ کیا کہا ہے ناصر کاظمی نے۔

کیوں اداس پھرتے ہو، سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں

یہ محبت کیا چیز ہے کنول ...... کوئی نہیں سمجھ سکا اور نہ شاید سمجھے گا۔ اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اپنے موسم اور اپنے پیمانے ہوتے ہیں ...... یہ اپنے لئے مشکل ترین راستے چنتی ہے اور جان لیوا انہونیوں کے سنگ چلنے کو زندگی سمجھتی ہے۔ عین بہاروں کے عالم میں یہ خزاؤں کا رخ کر لیتی ہے۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے یہ شعر ہے۔

بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا
صحنِ گل چھوڑ گیا دل میرا پاگل نکلا

تم غور کرو گی تو تمہیں بھی اندازہ ہو گا کہ یہ چیز جس کا نام محبت ہے کتنی انوکھی اور سرکش ہے۔ یہ تم جیسی شفاف لڑکی کو بھی زندگی کا پہلا جھوٹ بولنے پر آمادہ کر سکتی ہے اور مجھ جیسے کمزور شخص کو بھی ایسا سچ بولنے پر مجبور کر سکتی ہے جس کے ردعمل میں دل سینے کے اندر پھٹ جائے۔

ہاں کنول! دل سینے میں پھٹ چکا ہے۔ اب تو اس کی دھجیاں ہیں جنہیں ضبط کے بخیوں سے جوڑ کر زندگی کرنی ہے ...... اور ہر دھڑکن پر زخموں کا عذاب سہنا ہے۔ خوشی صرف اس بات کی ہے کہ محبت زندہ ہے ...... اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

یہ خط صرف تمہارے لئے تھا، لیکن اگر تم مناسب سمجھو تو اس کے کچھ حصے انکل سلیمان کو بھی پڑھا دینا۔ وہ آخر تک مجھے شک و شبے کی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہتی رہی ہیں ...... صاف گو، شفاف لوگوں کی فیملی میں تم جھوٹے، بد دیانت، اجنبی کہاں سے آ گئے ہو؟ تم یہاں اضافی ہو۔ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔

شاید یہ خط پڑھ کر میرے بارے میں ان کی رائے میں کوئی تبدیلی آ جائے ...... انہوں نے ایک بار راکیل کے سلسلے میں مجھ سے میری بے گناہی کا ثبوت مانگا تھا۔ میں نے اس وقت دانستہ کوئی ثبوت نہیں دیا تھا ...... لیکن آج میں ثبوت دے رہا ہوں۔ میرا یہ خط ثبوت ہے۔ (میری بیشتر باتوں کی تصدیق خاور کا ملازم سلیم احمد بھی کر سکتا ہے) اگر میں خاور کی موجودگی جیسا جان لیوا سچ بول سکتا ہوں تو پھر میں نے راکیل کے حوالے سے بھی سچ ہی بولا تھا۔ میں اس وقت بھی سچا تھا۔

کنول! میں ماں کی محبت سے محروم رہا ہوں۔ تمہاری ماں کے وجود میں پتہ نہیں کیوں مجھے اپنی ماں کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ مجھے وہ عورت لگتی ہی نہیں تھیں، سرتا پا ''ممتا'' لگتی تھیں۔ جب وہ روتی تھیں تو میرا دل روتا تھا۔

جب وہ مسکراتی تھیں تو میں اندر سے کھل اٹھتا تھا۔ میں اپنی اس ماں کو بہت سکھ دینا چاہتا تھا۔ میں ان کی گود میں سر رکھ کر سونا چاہتا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ ان کے پاؤں کے نیچے اپنے جسم کی کھال بچھا دوں۔ افسوس تمہارے ساتھ ساتھ میں ان سے بھی دور ہو گیا ہوں۔ لیکن ان سے اتنا ضرور کہہ دینا، خاور کے علاوہ بھی ان کا ایک بیٹا ہے۔ وہ ان کو اتنا ہی چاہتا ہے جتنا کوئی نوخیز بچہ اپنی ماں کی آغوش کو چاہ سکتا ہے۔ وہ ان کے سایۂ شفقت سے دور ہو گیا ہے۔ مگر خدارا اسے اپنی دعاؤں سے محروم نہ کریں۔ جب بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں ...... بس دو چار لفظ اس بدنصیب کے لئے بھی ضرور بول دیں۔ آخر میں ایک بات اور ...... میں اس خط میں اپنے دل کی ہر واردات کھول کر تمہارے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ کچھ بھی صحیح یا غلط چھپانا نہیں چاہتا۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ انکل سلیمان کو خاور کے بارے میں اطلاع دینے کے بعد بھی میرے دل میں کچھ عرصہ امید کی ایک ٹمٹماتی کرن موجود تھی۔ میں سوچتا تھا، شاید کوئی انہونی ہو جائے۔ شاید میرا سچ، مجھ سے اتنی بڑی قیمت وصول نہ کرے۔ شاید دیدی آشا اور کمار بھائی کچھ کر سکیں۔ ممکن ہے کہ باجی سلطانہ کوئی کردار ادا کریں۔ ممکن ہے کہ خاور خود ہی تم سے دستبردار ہو جائے ...... یا پھر ممکن ہے کہ تم ہی اتنی شدت سے تڑپو کہ تمہاری زنجیریں ٹوٹ جائیں۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہو سکا۔ آخر الذکر تو اس لئے نہ ہو سکا کہ خالہ سعدیہ کی تکلیف نے تمہیں بے بس کر دیا۔ تم نے سپر ڈال دی اور میرے خیال میں تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ میں تمہارے اس فیصلے کی تہہ دل سے قدر کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔''

انہونیوں کی تمنا پالنا انسان کی فطرت کا معصوم پہلو ہے۔ میں نے بھی سچ بولنے کے بعد چند روز تک لاشعوری طور پر یہ تمنا پالی، مگر ایسی تمنا آسانی سے پوری نہیں ہوتی۔ میری بھی نہیں ہوئی۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ اب جو راستہ چنا ہے اس پر چلنا ہے اور زندگی بھر صبر و استقامت سے چلنا ہے۔

...... کنول! میں نے کئی ماہ تم سب کے ساتھ گزارے ہیں۔ اس د

میں مجھ سے کئی غلطیاں کوتاہیاں ہوئی ہوں گی۔ ان سب غلطیوں کے لئے جو مجھے معلوم ہیں اور ان سب کے لئے بھی جو مجھے معلوم نہیں ...... میں معافی کا خواستگار ہوں۔

اچھا...... اب تم سب سے اجازت چاہتا ہوں۔ ہمیشہ کے لئے۔ خدا تمہیں آباد رکھے۔ خدا حافظ۔"

خط پڑھنے کے بعد اسنے اپنی آنکھوں سے چھلک پڑنے والے آنسو پونچھے۔ خط پر ایک بار پھر سرسری نظر دوڑائی، پھر اسے پھاڑ کر ٹکڑے کیا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اس عمل کے دوران میں بھی وہ مسلسل چلتا جا رہا تھا۔ اس کا رخ شمال کی طرف تھا۔ شمال جہاں ہندوستان تھا، جہاں کنول تھی، جہاں اس کا شہر تھا ...... لیکن جس شہر کی طرف جانا ہی نہ ہو، اس طرف چلنے سے کیا فائدہ؟ اس رخ پر حرکت کرنے سے کیا حاصل؟

اس نے اپنا رخ بدلا اور ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف چلنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گال فیس کے بارونق "ایریا" میں تھا۔

گال فیس روڈ کے وسط میں ایک پتھریلے بنچ پر، سمندر کے عین کنارے دو پریمی بیٹھے تھے ...... سری لنکن پریمی ...... چھتری انہیں چھپا رہی تھی اور ...... دکھا بھی رہی تھی۔ امبریلا لو کا وہی دھوپ چھاؤں والا شرمیلا انداز۔ وہ دونوں مسکرا رہے تھے ...... سمندر ان کے سامنے تھا اور سمندر کہہ رہا تھا۔

"میں گواہ ہوں گئے زمانوں کا ...... میں نے ان کناروں پر ان گنت کہانیاں پروان چڑھتے دیکھی ہیں ...... بے شمار لوگ میرے سامنے ملے ہیں اور بچھڑے ہیں۔ لاتعداد مسکراہٹیں اور آنسو میری ریت میں جذب ہیں۔ تم بھی میرے ہزاروں لاکھوں مہمانوں میں سے ایک ہو۔ پل بھر کے لئے میرے روبرو ٹھہرے ہو۔ تم چلے جاؤ گے، اپنی دنیاؤں میں گم ہو جاؤ گے...... لیکن میری ریت پر تمہارے قدموں کے نشان رہ جائیں گے۔ میں ہر نشان یاد رکھتا ہوں ...... اور کوئی بھی کہانی بھولتا نہیں ہوں ...... ہاں، میں کوئی بھی کہانی بھولتا نہیں ہوں......"

(ختم شد)